اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ اور قائد اہل سنت کے خواب کی حسین تعبیر

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا

سالانہ مجلّہ

کاروانِ رئیس القلم

’’میری عمر کا بڑا حصہ یورپ اور مغربی ممالک کی خاک چھاننے میں گزرا، میں نے وہاں شدت سے محسوس کیا کہ ایسے علماء کی سخت ضرورت ہے جو بین الاقوامی زبانوں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے سکیں ۔ یورپ میں چونکہ عربوں کی بھی معقول آبادی ہے۔اس لئے عربی کے ذریعہ بھی یورپ میں کام کرنے میں آسانی ہوگی لیکن یہ کام کسی روایتی مدرسے میں نہیں ہوسکتا تھا اس لئے الگ سے ایک تربیتی کیمپ قائم کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ ایسا ادارہ ضرور قائم کرونگا جہاں قدیم نظام تعلیم وتربیت کے پروردہ علماء کو جدید علوم وفنون سے مسلح کرنے کا کام کیا جاسکے (قائد اہل سنت)

شائع کردہ: شعبۂ نشرواشاعت جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

22، ذاکرنگر، اوکھلا نئی دہلی ۔ ۲۵ فون: 011-26984741

Department of Printing & Publishing **Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia**

22, Zakir Nager, Okhla, New Delhi- 25, Ph.: 011-26984741

یہ ہے دامن یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں بسم اللہ الرحمن الرحیم موسم کا منھ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

بفیض روحانی :۔ محبوب الٰہی سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

بیادگار :۔ قائد اہل سنت رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا ترجمان پہلا سالانہ مجلّہ

وسیم احمد رضوی ۱۲ نومبر ۲۰۰۷ء دہلی

کاروان رئیس القلم

محمد ذکی اللہ مصباحی ← مدیر → سال ۲۰۰۷ء/۱۴۲۸ھ

شائع کردہ: شعبۂ نشر واشاعت، جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء، ۲۲، ذاکر نگر۔ اوکھلا، نئی دہلی: ۱۱۰۰۲۵

Published by:Publishing Department , Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia 22-Zakir Nagar,Okhla, New Delhi-110025

فون نمبر: 0091-011-26984741

E-Mail:-jamiahazrat2007@yahoo.com

پیغامات

تأثرات

مقالات

باب پنجم: مقالات طلبہ (اردو، عربی اور انگریزی)

نوٹ:۔ مضمون نگار کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے (ادارہ)

وقت کے تقاضوں سے گریز کب تک؟

ایک عرصہ سے چیخ رہا ہوں کہ زندہ رہنا ہے تو سوچنے اور برتنے کا انداز بدلنا ہوگا۔ فولادی تلوار کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب قلم کی تلوار سے معرکے سر کیے جا رہے ہیں۔ پہلے کسی محدود رقبے میں کفر و ضلالت کی اشاعت کے لیے سالہا سال کی مدت درکار ہوتی تھی اور اب پریس کی بدولت صرف چند گھنٹوں میں شقاوتوں کا ایک عالم گیر سیلاب امنڈ سکتا ہے۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے! آج ہندوستان کا ہر فرقہ قلم کی توانائی اور پریس کے وسائل سے کتنا مسلح ہو چکا ہے۔ اتنا مسلح کہ اس کی یلغار سے ہمارے دین کی سلامتی خطرے سے دوچار ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ میں بعض ایسی جماعتوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں جن کے وجود کا کوئی سر رشتہ ماضی میں نہیں ملتا لیکن اس اجنبیت کے باوجود صرف قلم کے وسائل کے بل پر دہ روئے زمین پر طوفان کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں اور ان کا اجنبی لٹریچر سینکڑوں برس کی قابل اعتماد تصنیفات کو نہایت تیزی کے ساتھ پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔

فکری مزاج کی تعمیر میں قلم کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ فکری استحکام کے بغیر کوئی جماعت بھی ہو طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پریس ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ فتنہ صبح کو جنم لیتا ہے دوپہر تک جوان ہو جاتا ہے اور شام ہوتے ہوتے آبادیوں کے لیے ایک دردناک آزار بن جاتا ہے۔

حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ
(بانی جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء)

پیغام

شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں برکاتی صاحب قبلہ (خانقاہ مارہرہ مطہرہ)

مورخہ ۱۲/ اگست ۲۰۰۷ء کو ذاکر نگر گلی نمبر ۱۸ میں رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے ذریعہ حاصل کی گئی زمین پر شرف ملت حضرت سید محمد اشرف میاں برکاتی صاحب قبلہ کے مبارک ہاتھوں سے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر حضرت کی مختصر مگر جامع تقریر ہوئی تھی۔ افادیت کے پیش نظر حضرت کی تقریر کی تلخیص پیش ہے۔ (مدیر)

— جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا جب نام سنتے ہیں تو قلب و ذہن کے پردے پر قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کی یادوں کی شمع کی روشنی تھرتھرانے لگتی ہے۔ ان کی یادوں کو شمع کی روشنی سے تشبیہ دینا میں اس بات سے باشعور ہوں کہ شمع روشنی کی علامت ہوتی ہے، تحریک کی علامت ہے، حرکت کی بھی علامت ہے اور اگر حضرت علامہ کی زندگی کے اوراق کو آپ پلٹ کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شاید ہی عالم اسلام میں (ہندوستان کے پس منظر میں کہہ رہا ہوں) کوئی اتنا متحرک اور اتنا بڑا ادارہ ساز ہو جس نے ادارہ سازی میں اپنی پوری عمر گزاری اور ایسے مفید ادارے قوم کو دیئے جن کا پھل ہم آج بھی کھا رہے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے نام سے منسوب یہ جامعہ جس کا بین ثبوت ہے جس کی دوسری عمارت کا سنگ بنیاد آج علماء کرام کی موجودگی میں رکھا گیا۔

کتنی خوشی کی بات ہے کہ آج جس عظیم عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اس کے بارے میں ہمیں اراکین اور ذمہ داروں نے بتایا کہ یہ نئی عمارت جو ہے وہ بچیوں کی تعلیم کے لئے ہے۔ اسے تعلیم نسواں کے لئے مخصوص کیا جائے گا۔ ارکین نے بتایا تو مگر میں اس کی تفصیلات سے آگاہ نہ ہوسکا۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں اراکین سے کی کہ اگر اس ارادے میں کوئی تھوڑی بہت کمزوری بھی ہو تو خدا کے لیے اس کو اور مضبوط کرلیں کیوں کہ ہم قوم کی بچیوں کو عالم دیکھنا چاہتے ہیں، ہم اپنی قوم کی بچیوں کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں اس مقام پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جہاں جامعات ہیں، دار العلوم ہیں، مدارس اور اسکول ہیں ان کے اطراف کی آبادی اکثر تعلیم اور ان اداروں سے محروم رہتی ہے۔ یہ بات آپ بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ کسی بھی دار العلوم کو آپ اپنے ذہن میں لاکر دیکھئے یہی صورت حال نظر آئے گی، الا ماشاء اللہ۔ مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ تعلیم نسواں کا ادارہ قائم کرنے کے بعد سب سے پہلے Locality اور اپنے محلّہ والوں کو مدنظر رکھئے گا۔ ہمارے محلوں میں تعلیم نسواں کی خصوصاً دینی تعلیم کی ضرورت ہے ہماری بچیاں ان شاءاللہ دینی تعلیم حاصل کر کے جب زندگی کے میدان میں قدم بڑھائیں گی اور جب اللہ کے فضل و کرم سے وہ کسی کی بیوی ہوں گی اور بچوں کی ماں بنیں گی، اور ان کو تعلیم دیں گی اور ان کی صحیح تربیت کریں گی تو اس کے بے شمار فوائد ہوں گے۔

ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دلی سواد اعظم کے لیے بہت قیمتی ہے۔ یہاں الحمدللہ کئی تعلیمی، صحافتی اور اشاعتی ادارے ایسے ہیں جن سے سنیت کا بڑا کام ہو رہا ہے اور ترقی پر ہے اور بہت کامیابی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جب یہاں کوئی دار العلوم کھلتا ہے تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ دہلی جسے عام طور پر بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہا جاتا ہے، کسی تیئسویں خواجہ کی چوکھٹ کھل گئی ہے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ حضرت علامہ ارشد القادری کی یادگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء جس کی دوسری عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے اس کی تعمیر جلد مکمل ہو۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کی تعمیر میں دامے، درمے، قدمے تعاون کی کوشش کریں۔ میں نے جان بوجھ کر دامے، درمے، قدمے کہا ہے کیوں کہ سخنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کے لئے تو ہم عام طور سے آمادہ ہی رہتے ہیں۔

مجھے جب فرصت ملتی ہے میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء یا دار القلم جایا کرتا ہوں اور دعا کیجئے کہ جب دلی میں فرصت ملے تو جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء یا دار القلم ہی جایا کروں۔

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جہاں دو سالہ نصاب کے ذریعہ فارغ التحصیل علماء کو دعوت وتبلیغ اور مذہبی قیادت کے نشیب وفراز سے آشنا کیا جاتا ہے اور دوسری جانب کئی سالوں سے جامعہ ہٰذا کے فارغین عالم اسلام کی شہرت یافتہ درسگاہ ''جامع ازہر مصر'' کے صحن علم وفن سے بھی اکتساب فیض کے قابل ہورہے ہیں۔

لہذا یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان دونوں پہلوؤں سے ادارہ کا زندہ رہنا اہل سنت وجماعت کے لیے کس قدر اہم ہے۔آیئے اپنے مالی تعاون کے ذریعہ اس کی رگوں کو خون فراہم کریں۔

ڈاکٹر غلام زرقانی

امیر جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

پیغام

حــــــامــــدا و مــــــصلیــــــا و مســــلمـــــا

میرے ابا حضور حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کا آباد کردہ علمی شہر اور آپ کی آخری یادگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی کو بے مثال ترقی کی راہ پر دیکھ کر آج مجھے بے پناہ مسرت ہو رہی ہے۔ مجھے امید قوی ہے کہ اساتذہ جامعہ کی شب و روز کی محنتوں اور اراکین جامعہ کی انتھک کوششوں کی بدولت عنقریب ابا حضور کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا اور یہ علمی شہر جلد ہی ہندوستان کے مدارس کی تاریخ میں ایک اہم تاریخ رقم کرے گا۔

جامعہ کا علمی ترجمان سالانہ مجلّہ ''کاروان رئیس القلم'' کا اجراء جامعہ کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے اور جماعت اہل سنت کی صحافتی دنیا میں ایک صحت مند انقلاب ہے جو بلا شبہ ہم سب کے لئے بالخصوص اراکین جامعہ کے لئے قابل فخر اور باعث رشک ہے۔قوم پر یہ واضح ہو کہ ابا حضور کے انتقال پر ملال کے بعد جامعہ فنڈ کی کمی کا گلہ کرنے لگا تھا مگر اس بے سروسامانی کے باوجود ہم انتھک کوشش کرتے رہے اور الحمد للہ آج ہم کامیاب ہیں مگر ابھی اور بہت لمبا سفر طے کرنا ہے اور ایک ایسی شاندار لائبریری کا قیام جو جامعہ کے شایان شان ہو اور راجدھانی دلی میں اسکالروں کے لئے تحقیقی مرکز ہو ہمارے اس سفر کا ایک اہم ہدف ہے۔ تعلیم نسواں کے لئے ایک مستقل عمارت کی تعمیر ہونی ہے۔ ارباب خیر سے گزارش ہے کہ ہمارے بازوؤں کو مضبوط کریں اور حسب استطاعت ہمارا ہمہ جہت تعاون کریں تاکہ ہمارے عزائم جلد پایہ تکمیل کو پہنچیں۔

اس مجلّہ کے اجراء پر ہم جامعہ کے اساتذہ کی مبارک کوششوں کو سراہتے ہوئے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔خدا انھیں مزید حوصلہ عطا فرمائے اور مجلّہ کو مذہبی صحافت کا درخشندہ ستارہ بنائے۔(آمین)

فیض ربانی قادری

نائب صدر جامعہ ہٰذا

پیغام

کام وہ لے لیجئے تم کو جو راضی کرے

ٹھیک ہو نام رضا تم پہ کروڑوں درود

رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ ایک عظیم قائد، بالغ نظر مفکر اور صاحب تدبیر و حکمت رہنما تھے۔ آپ کی حیات مبارکہ مکمل تحریک تھی۔ آپ نے درجنوں مدارس قائم کئے، متعدد مساجد کی بنیاد ڈالی اور ہند و بیرون ہند کئی تنظیمیں اور اصلاحی ادارے فرمائے۔

حضرت علامہ کی علمی اور تعمیری نشانیوں میں سے آپ کی آخری یادگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء ہے، جس کا سنگ بنیاد آپ نے ہندوستان کے قلب دہلی میں ۱۹۸۹ میں رکھا اور آپ کی مسلسل کوششوں سے چار منزلہ عمارت کی تکمیل ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔ ۱۹۹۵ء سے باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا اور کم مدت میں اس جامعہ نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔

حضرت علامہ کی حیات مبارکہ میں اس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری مختلف ہاتھوں میں رہی مگر آپ کے انتقال پر ملال کے کئی سالوں بعد اس کے انتظام کی ذمہ داری ہم لوگوں کے ناتواں کندھوں پر ایک ایسے وقت آئی جب جامعہ کے در و دیوار علامہ کے خوابوں کی تکمیل نہ ہو پانے کا شکوہ کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل اور علامہ کی دعاؤں کی برکت سے ہم نے اپنے دور انتظام کو بحسن و خوبی نبھانے کی کوشش کی۔ مستقبل میں ان شاء اللہ بحسن و خوبی انجام دینے کی کوشش کریں گے۔ ہمارے عزائم بلند ہیں۔ ابھی ہمیں جامعہ کے لئے ایک مستقل لائبریری، جامعہ کی مستقل مسجد اور تعلیم نسواں کے لئے ایک مستقل عمارت کی تعمیر کرنی ہے۔ اصحاب خیر سے گزارش ہے کہ ہمارے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلیں اور حسب استطاعت ہمارا تعاون کریں تاکہ حضرت علامہ کے تیار کیے ہوئے خاکوں میں ہم رنگ بھر سکیں۔

آج ہمیں بے پناہ مسرت ہوتی ہے کہ جامعہ ہمہ جہت ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس ہمہ جہت ترقی کی ایک کڑی جامعہ کے شعبہ نشر و اشاعت کی طرف سے سال نامہ ''کاروان رئیس القلم'' کا اجرا ہے جسے جامعہ کے علمی دستاویز کی حیثیت سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس عظیم کام کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے میں جامعہ کے فعال و متحرک اساتذہ کی اس نئی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان کے بازوؤں میں قوت اور عزم و ارادے میں استقلال اور پختگی عطا فرمائے اور اس مجلہ کو رشد و ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ اللہ رب العزت ان معاونین و مخلصین کے کاروبار اور تجارت میں برکت عطا فرمائے جو علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کی حیات سے لے کر اب تک خالص خوشنودی الٰہی اور رضائے مصطفیٰ ﷺ کے لیے بے نام و نمود اور شہرت کے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں لگے ہیں۔ جنہیں علامہ علیہ الرحمۃ اپنی زندگی میں بے پناہ دعائیں دیتے تھے اور جوان کا دم قدم ساتھ دیتے تھے انہیں بھی اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے اور جو ہمارے عزائم کی تکمیل میں کسی بھی طرح سے بے لوث تعاون دے رہے ہیں اللہ انہیں دارین کی سعادتوں سے ہم کنار کریں۔ آمین

محمد حسنین برکاتی

جنرل سکریٹری جامعہ ہذا

تأثرات

حضرت علامہ عبدالحفیظ صاحب قبلہ

سربراہ اعلیٰ الجامعة الاشرفيه مبارک پور اعظم گڑھ یوپی

ومنیجنگ ٹرسٹی جامع حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی

حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے احباب کی طرف سے خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مجلّہ ''کاروان رئیس القلم'' کی اشاعت سے بے حد خوشی ہوئی۔ اس موقعہ پر میں احباب جامعہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اس شخصیت کی زندگی کے گوشوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جنھوں نے پوری زندگی قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے صرف کی اور دینی وملی ضرورتوں کو پورا کرنے میں قوت وتوانائی خرچ کی۔ آج بھی حضرت علامہ جیسے جذبات کے حامل افراد کی ملت کو ضرورت ہے۔ کاش! ہم لوگ ان کے درد کو محسوس کرتے ہوئے اپنے کردار وعمل کے ذریعہ وقت کی طاغوتی طاقتوں سے قوم وملت کی حفاظت اور ان کے اندر حرارت ایمانی پیدا کرنے کے اسباب فراہم کرتے۔ امید ہے کہ اس مجلّہ سے قوم کو تسلی اور اصلاح کی راہیں مہیا ہوں گی۔

رب تعالی احباب کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس کے ذریعہ ہماری بے حسی کو ختم فرمائے۔

آمین بجاہ حبیبه سیدالمرسلین علیه الصلاۃ والتسلیم

عبدالحفیظ عفی عنہ

۱۱/اگست ۲۰۰۷ء

تأثرات

امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب قبلہ شیخ الحدیث دار العلوم نور الحق چرہ محمد پور فیض آباد

کسی تصویر کو دیکھنے کے مختلف زاویے ہوسکتے ہیں، ایک عام آدمی کسی تصویر کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اس کے مقابلے میں ایک دیدہ ور کا زاویۂ نگاہ بہت مختلف ہوتا ہے، دیدہ ور کی گہری نگاہیں تصویر کے ان گوشوں کا بھی احاطہ کرتی ہیں جن کا ایک عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا عام آدمی اور دیدہ ور کے مشاہدہ کا یہ فرق صرف کسی تصویر کے حسن وقبح کے اظہار تک محدود نہیں ہے بلکہ اس مشاہداتی فرق کی حد میں ایک معمولی تصویر سے لے کر قوموں، ملکوں اور ملتوں کے ماضی، حال، مستقبل کے مشاہدوں تک وسیع ہوجاتی ہیں، ایک عام نگاہ جب کسی قوم کے عروج وزوال، یا ماضی و مستقبل کا مطالعہ کرتی ہے تو اس کو چند خوش کرنے والے یا غمگین کرنے والے واقعات کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا، لیکن جب ایک دیدہ ور اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے اس کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ انہیں واقعات کی تہہ میں جا کر نتائج کے ایسے موتی نکال لاتا ہے جو ایک عام آدمی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوتے۔ یہ ''دیدہ وری'' اگر ماضی کے واقعات سے متعلق ہو تو اس کو ''بصیرت'' کہا جاتا ہے، اور اگر اس کا تعلق مستقبل سے ہو تو اس کو ''فراست'' کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے کچھ خاص بندوں کو مستقبل میں جھانکنے کا ایک خاص شعور عطا فرماتا ہے اس کو حدیث پاک میں ''فراست ایمانی'' فرمایا گیا ہے۔

رئیس القلم قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فراست ایمانی کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا، قوم وملت اور مسلک وجماعت کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ ان گوشوں اور پہلوؤں پر نگاہ رکھی جو عام نگاہوں سے روپوش رہے، ''جامعہ حضرت نظام الدین اولیا'' ان کی اسی فراست ایمانی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، جس وقت عام طور پر جماعت میں روایتی قسم کے مدارس کھولنے کا رواج تھا اس وقت حضرت علامہ صاحب قبلہ نے حال کی ضرورت اور مستقبل کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نوعیت کے ادارہ کے قیام کی ضرورت محسوس فرمائی، اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کی بنیاد رکھی، جماعتی سطح پر یہ اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے، جہاں مدارس اسلامیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو عالمی زبانوں پر عبور حاصل کروایا جاتا ہے، ساتھ ہی مطالعۂ ادیان، دعوتی اسلوب میں تحریر وتقریر کی مشق، اور مناہج دعوت وتبلیغ سے کما حقہ روشناس کرانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، تاکہ عالمی معیار کے ایسے دعاۃ اور مبلغین قوم کو دیے جاسکیں جو زمانۂ جدید کے دعوتی مواقع کو استعمال کرکے دور جدید میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں اپنا کردار ادا کریں۔ اپنے یوم تاسیس ہی سے جامعہ نے اپنی منزل اور اپنا ہدف متعین کردیا تھا اور آج بھی جامعہ اپنے بانی حضرت علامہ ارشد القادری کے بنائے ہوئے آفاقی خطوط پر اپنی منزل کی طرف کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

تاسیس جامعہ کے وقت بانی جامعہ کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ مدارس کے فارغین کو عصری جامعات میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع میسر ہوں تاکہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے آشنا ہوسکیں، مزید یہ کہ عصری جامعات میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ کو جماعتی دھارے سے جوڑا جاسکے، جامعہ نے اس سلسلہ میں بھی کافی خوش آئند اقدامات کئے ہیں آج جامعہ کے فارغین جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد جیسی عالمی شہرت یافتہ جامعات کے مختلف شعبوں میں عرفان وآگہی کے منازل طے کر رہے ہیں، آج ہماری جماعت کے نوجوانوں کی ایک اچھی تعداد عالم اسلام کی عظیم یونیورسٹی جامعہ ازہر مصر میں علوم شرعیہ اور ادبیہ میں کمال حاصل کرنے میں دن رات کوشاں ہے، دراصل یہ بھی اسی جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کا فیض ہے، غالباً یہ اہل سنت کا واحد ادارہ ہے جہاں سے باقاعدہ ہر سال طلبہ کے وفود ازہر

شریف میں تعلیم حاصل کرنے بھیجے جاتے ہیں، جامعہ کی ان تمام کامیابیوں میں بانی جامعہ کے خلوص، اور للہیت کے علاوہ جامعہ کے جواں سال اساتذہ کی محنتیں، کاوشیں اور قربانیاں بھی شامل ہیں، مولانا نعمان ازہری، مولانا سجاد عالم مصباحی، مولانا انوار احمد بغدادی، اور مولانا ذکی اللہ مصباحی حفظہم اللہ تعالیٰ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان حضرات کے علم وعمر میں برکتیں عطا فرمائے۔ بانی جامعہ حضرت علامہ ارشد القادری کے درجات بلند فرمائے، اور جامعہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

بجاه سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیه وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین.

تأثرات

حضرت بحرالعلوم مفتی عبدالمنان اعظمی صاحب قبلہ
دارالعلوم شمس العلوم، گھوسی، ضلع مئو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده و نصلي و نسلم على رسوله الكريم و آله و أصحابه اجمعين

امابعد! رئیس القلم حضرت علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ طبقۂ اہل سنت و جماعت میں ان نامور علماء وقائدین میں تھے جو قومی اور دینی مسائل کے حل کے سلسلہ میں نہایت سرگرم اور فعال صلاحیتوں کے مالک تھے۔اوراس کے لیے ہردم وہ نئے آفاق کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔

جامعہ حضرت نظام الدین اولیا (رضی اللہ عنہ) کوانہوں نے ہندوستان کی راجدھانی میں اس عزم وارادہ کے ساتھ قائم کیا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں تقابلی مطالعہ کے لئے یہ ادارہ ایک اہم مرکز کا کام دے۔تاکہ دین وملت کی خدمت زیادہ مؤثر طریقہ پر انجام دیا جاسکے۔

حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے ابتدائی ضرورتوں کے موافق عمارت کی تعمیر اپنی زندگی میں ہی مکمل کردی تھی۔تعلیمی جدوجہد کے سلسلہ میں ابتدائی زینہ جملہ مذاہب کی سرکاری زبان سے آگاہی بلکہ اس میں مہارت حاصل کرنا ضروری تھا۔چنانچہ اس کا انتظام بھی انہوں نے عربی اور انگریزی زبان کی تعلیم سے کردیا تھا۔جس سے فوری طور کچھ مزید فوائد بھی حاصل ہوئے اور ہورہے ہیں۔

مولانا کی جگہ پر کام کرنے والے ارکان واساتذہ نے جن کے قبضہ میں ادارہ مولانا کے وصال کے بعد سے اب تک ہے۔پوری جدوجہد کے ساتھ مولانا کے اس کام کو سنبھال رکھا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کارخیر میں ان کی مددفرمائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان قوم اس ادارے کی بھرپور امداد کرے تاکہ مولانا کے تمام اہداف کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاسکے۔اور یہ ادارہ مختلف ادیان عالم کے مطالعہ کا ایک اہم مرکز بن سکے۔**وما ذلک علی اللہ بعزیز**.

عبد المنان اعظمی

۲۲/جولائی ۲۰۰۷ء

تأثرات

فقیہ النفس مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی صاحب

اخلاف کے جو افراد اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کی بیکراں جد وجہد اور مساعی کو پیش نگاہ رکھ کر آگے بڑھتے ہیں بالعموم وہی اس کارگاہ حیات میں راستوں کے نشیب وفراز سے بآسانی گذر کر منزل مقصود تک پہونچ پاتے ہیں۔

مجھے یہ جان کر اطمینان بخش مسرت ہوئی کہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی امسال اپنا سالنامہ مجلّہ ''کاروان رئیس القلم'' کے دلکش عنوان سے شائع کر کے اپنے بانی رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کا فریضہ انجام دینے جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اس گوشہ کی جانب خصوصی توجہ دی جائے گی۔
میں اس کے تعلق سے جامعہ کے اراکین، اساتذہ اور طلبہ سب کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور مبارکباد دیتا ہوں۔

فقیر محمد مطیع الرحمٰن رضوی غفرلہ

۳۱ رجولائی ۲۰۰۷

تأثرات

حضرت مولانا محمد عبد المبین نعمانی قادری
المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارک پور اعظم گڑھ (۲۷۶۴۰۴)(یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده ونصلي ونسلم علی رسوله الکریم وآله وصحبه أجمعین

علم کی فضیلت اور علما کی اہمیت مسلمات سے ہے۔ یوں ہی وہ علمی مراکز جہاں قوم کے نونہال زیور علم وتربیت سے آراستہ کیے جاتے ہیں ان کی عظمتوں سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رئیس التحریر قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ بلاشبہ جماعت اہل سنت کے مقتدر علماء میں تھے۔ دین کی دعوت وتبلیغ کا جذبہ آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس حقیقت سے آپ بالکل منفرد تھے کہ دینی تقاضوں کی تکمیل اور مذہب حق کی سربلندی وبقا کی خاطر آپ وقت کے ساتھ قلم ورقم ہر ایک کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار رہا کرتے تھے۔ فروغ دین کا جذبہ بیکراں آپ کو ملک وبیرون ملک چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ملک وبیرون ملک آپ نے کئی دینی مراکز اور علمی ادارہ قائم کیے۔

آپ کی زندگی کا آخری عظیم کارنامہ ''جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء'' دہلی ہے، جس کے قیام کا مقصد آپ نے یہ بتایا تھا کہ دینی درسگاہوں سے جو طلبہ فارغ ہوں گے ان میں سے منتخب طلبہ کو دینی دعوت کے لیے عربی وانگریزی میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے داخلہ لے کر ٹریننگ دی جائے گی تا کہ وہ عالم اسلام اور دیگر مقامات پر جا کر مذہب حق کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ الحمدللہ! گزشتہ کئی سالوں سے جامعہ میں اسی نہج پر تعلیمی وتربیتی سلسلہ جاری ہے۔ حضرت علامہ کے انتقال کے بعد بڑی تشویش تھی کہ یہ سلسلہ کیسے آگے بڑھے گا لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ علامہ کے تربیت یافتہ رفقا اور مزاج شناس احباب نے اس ادارے کو فروغ دینے میں کوتاہی نہیں کی اور بدستور کام جاری ہے بلکہ پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر طریقے سے جامعہ کا تعلیمی کارواں آگے بڑھتا جارہا ہے جو بڑا خوش آئند اور بڑا حوصلہ افزا ہے۔

دہلی کی سرزمین پر جہاں اہل سنت وجماعت کا کوئی قابل ذکر ادارہ نہیں تھا حضرت قائد اہل سنت نے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء قائم کرکے پوری جماعت پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس لیے میری پوری ملت اسلامیہ سے پرزور اپیل ہے کہ اس ادارے کو پروان چڑھانے میں سردھڑ کی بازی لگادیں بلکہ اس کو مزید وسعت دینے کی بھی کوشش کریں۔ افسوس کہ فی الحال ادارہ جس تنگ نائے میں زندگی گزار رہا ہے وہ اس کے شایان شان نہیں۔ ملت کے باہوش اور فکرمند افراد اور اہل ثروت حضرات سے میں گزارش کروں گا کہ جامعہ کی توسیع کے لیے بھرپور جدوجہد کے لیے تیار ہوکر جامعہ کو آگے بڑھائیں تا کہ تعلیمی کام کرنے والے فی الحال جو گھٹن محسوس کر رہے ہیں اس سے نجات پائیں اور کھلی فضا میں پورے حوصلے کے ساتھ کام کرنے میں آسانی محسوس کریں۔

یہ جان کر بے پناہ مسرت ہوئی کہ جامعہ کے طلبہ ایک سالانہ مجلہ نکال کر علمی مظاہرہ کررہے ہیں۔ میری نیک خواہشات اور مخلصانہ دعائیں ان طلبہ، اساتذہ اور ارکان سب کے ساتھ ہیں۔ مولیٰ عزوجل اس جامعہ کو اور ترقی دے۔ آمین . بجاہ سید المرسلین علیه وآله الصلاة و التسلیم.

محمد عبد المبین نعمانی قادری۔ ۱۷؍رجب المرجب ۱۴۲۸ھ

تأثرات

حضرت علامہ الحاج مفتی عبدالمنان کلیمی
مفتی شہر مرادآباد وصدر مجلس علمائے ہند

مخدومی رئیس القلم حضرت علامہ ارشدالقادری قدس سرہ جس علمی وفکری اور عملی شخصیت کا نام ہے وہ محتاج تعارف نہیں ۔ جماعت اہل سنت کی تاریخ وخدمات کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ مخدومی حضرت علامہ ارشدالقادری صاحب کا ذکر نہ کیا جائے ۔ حضرت علامہ ارشدالقادری صاحب اس ذات گرامی کا نام ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہر میدان علم وفضل میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

عقائد وکلام ، ردومناظرہ ، مدارس ومساجد، تصنیف وتالیف ، خدمت وقیادت اور فکر وسیاست کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس میں حضرت علامہ موصوف کی عظیم الشان ، قابل قدر اور لائق فخر یادگار موجود نہ ہو۔ میرے نزدیک حضرت علامہ اپنے بہت سارے ہم عصر اور اقران پر ایسے حاوی اور فائق تھے کہ ان سے آگے بڑھنا تو دور کی بات ہے ان کی مثال بھی قائم نہیں کر سکے ۔ اگر ہم یہ کہیں تو ذرہ برابر بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت علامہ عظیم انقلابی شخصیت کے مالک تھے، مثال کے طور پر تصنیف وتالیف میں کتاب زلزلہ اور زیروزبر اور لالہ زار کی اب تک کوئی نظیر سامنے نہیں ہے ، مساجد ومدارس میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء اور جامعہ فیض العلوم اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت علامہ کی فکری ، فقہی اور نظریاتی تجدید وانقلاب ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ انہوں نے جماعت اہل سنت کی فقہ وقضا کی اہم ضرورت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ادارۂ شرعیہ کے نام سے جماعت اہل سنت کو ایک عظیم الشان پلیٹ فارم عطا فرمایا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک اہم موقع پر فرزندان اشرفیہ کے سامنے استاذ گرامی استاذ العلماء جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے مسرت وانبساط کے عالم میں فرمایا تھا کہ اگر علامہ ارشدالقادری کی طرح تین اور پیدا ہو جائیں تو ہم پورے ہندوستان پر جماعتی فتح ونصرت کا جھنڈا گاڑ دیں گے۔ اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ الجامعۃ الاشرفیہ کے تعارف کے لیے کسی پوسٹر اور پمفلٹ کی ضرورت نہیں ہے علامہ ارشدالقادری جیسے فرزندانِ اشرفیہ کافی ووافی ہیں۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ حضرت علامہ کی تاریخ وخدمات اور جماعت اہل سنت کی علمی وعملی سرگرمیوں سے عالم اسلام کو روشناس کرنے کے لیے آپ کی عظیم علمی وانقلابی یادگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی جانب سے ایک سال نامہ ''کاروان رئیس القلم'' کے نام سے اشاعت پذیر ہونے جارہا ہے اس عظیم الشان پیش کش پر مجھے اس لئے بھی زیادہ خوشی ہے کہ میں اپنے زمانہ طالب علمی سے لے کر حضرت کے وصال تک علامہ کے انقلابی خدمات سے روشناس ہوتا رہا بلکہ بعض موقعوں پر ان کا شریک عمل بھی رہا۔

حضرت علامہ کے تعلق سے نہایت افسوسناک اور مایوس کن ایک پہلو کی طرف اشارہ کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ ۱۹۹۵ء میں ہندوستان کی راجدھانی سرزمین دہلی پر ''آل انڈیا سنی کانفرنس'' کا انعقاد فرما کر جماعت اہل سنت کے لیے ایک تاریخی اسلامی یونیورسٹی کا داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے لیکن اپنی ہی جماعت کے کچھ افراد کی وجہ سے علامہ کا یہ عظیم الشان تاریخی منصوبہ ناکام ہوگیا، میں پورے فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس موقعہ سے میں ہیچمداں ہی تھا جس نے کھل کر علامہ کے اس آفاقی منصوبے کی بانگ دہل تائید کی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو ابہام وخفا کے ساتھ قارئین تک پہنچانے کی میں نے کوشش کی ہے۔

اس تلخ حقیقت کے باوجود بھی علامہ کے عزم واستقلال میں ذرہ برابر بھی جمود اور تزلزل نہیں آیا اور آپ کا کاروان علم وتعمیر منزل مقصود کی

طرف رواں دواں رہا جس کی عملی تصویر جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی شکل میں ہماری نگاہوں کے سامنے پورے علمی وفکری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے میں اس موقعہ سے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے تمام اساتذہ وطلبہ اور معاونین خاص طور پر محقق عصر مولانا سجاد عالم صاحب مصباحی اور فاضل گرامی مولانا محمد ذکی اللہ صاحب مصباحی کو کاروان رئیس القلم کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور یہ عہد کرتا ہوں کہ میں جس لائق ہوں ان کے ساتھ ہوں۔

فقیر ہیچمداں یہاں یہ تحریر کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہے کہ آپ (حضرت علامہ ارشد القادری) کا اکرم العلماء، فخر ملت حضرت علامہ مفتی شاہ محمد نذیر الاکرم نعیمی علیہ الرحمہ سے تعلق خاص تھا، اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ آپ دونوں ہم عصر تھے دوسرے یہ کہ دونوں حضرات ہند و بیرون ہند کی تمام علمی و جماعتی سرگرمیوں میں ایک دوسرے کے زبردست مؤید و معاون تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بنفس نفیس نہایت محبانہ اور مخلصانہ انداز میں عرس اکرمی میں تشریف فرما ہوئے اور حضرت فخر ملت اور ان کی دینی خدمات اور فقیر راقم السطور سے متعلق اپنے ایسے تأثرات واحساسات کو قلمبند فرمایا جو ہمارے لئے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خیر اندیش
فقیر عبد المنان کلیمی

۲۰۰۷/۸/۵

تأثرات

حضرت مولانا شمس الہدیٰ صاحب مصباحی

استاذ عربی ادب جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

راجدھانی دہلی میں ایک سروے کے مطابق تقریباً اسی (۸۰) فی صد مسلم اہل سنت وجماعت سے آج بھی وابستہ ہیں مگر بیس سال قبل وہاں جانے پر بڑی اجنبیت محسوس ہوتی تھی۔ غیروں کا زور وشور، مسلم قیادت کے نام پر بدمذہبوں کا پیش پیش رہنا ہوتا۔ جب کہ آج راجدھانی میں جس سمت نکلیں اپنے مدارس ومکاتب، اپنے کتب خانے، اپنی تنظیموں کا غلغلہ نظر آتا ہے۔ اس جمود کو توڑنے میں، اس تعطل کو ختم کرنے میں اہم رول قائد اہل سنت رئیس القلم علامہ ارشد القادری رحمہ اللہ کا ہے جنہوں نے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء اس جذبے سے قائم فرمایا کہ اپنے قیمتی افراد عربی وانگریزی زبان وبیان کی خاطر در بہ در ٹھوکر نہ کھائیں اور غیروں کے دروازے پر دستک نہ لگائیں نیز اس کے ذریعہ سے بلاد عرب اور مغربی ممالک میں اپنے مذہب حق کو فروغ دیا جائے۔ کیوں کہ آپ نے عرصۂ دراز تک جائزہ لیا، ہزاروں تکالیف برداشت کر کے وہاں قیام فرما کر ''ورلڈ اسلامک مشن''، تنظیم قائم فرما کر علامہ قمر الزماں اعظمی، علامہ شاہد رضا نعیمی جیسی متحرک وفعال شخصیتوں کو ذمہ داریاں سونپیں۔ یہ حضرات متعدد ملکوں میں مستحکم اقدامات فرما رہے ہیں۔

عالمی سنی دعوتی تحریک ''دعوت اسلامی'' کا خاکہ علامہ قادری صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ہی بنایا تھا اور اس سلسلے میں پہلی میٹنگ شہر کراچی کی جس مسجد میں آپ نے کی تھی فقیر نے بچشم خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ تحریک آسٹریلیا سے لے کر یورپ، امریکہ تک جو کام کر رہی ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔ قوم مسلم کے اندر سنت پر عمل اور بدعملی سے نفرت پیدا کرنے میں شب وروز کوشاں رہتی ہے۔ دہلی کی سرزمین پر ہم اہل سنت کا سر بلند کرنے والوں میں علامہ یٰسین اختر مصباحی کا نام بھی آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔

مجھے بھی یہ سعادت ملی کہ ۱۹۹۳ء میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی تیسری منزل کی چھت ڈالنے کا افتتاح میرے ہاتھ سے کرایا گیا اور میرا جب بھی کسی کام سے دہلی جانا ہوتا تو علامہ مرحوم کے حکم پر جامعہ میں ہی قیام رہتا اور تعلیم کا کچھ جائزہ بھی لے لیتا حتی کہ جامعہ اشرفیہ کے ارباب حل وعقد سے دہلی شہر کے لیے دو سال کی خاطر مجھے طلب بھی فرمایا تھا مگر تعلیمی امور کے پیش نظر وہاں کے لیے مجھے اجازت نہ مل سکی۔ ہمیں امید ہے کہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء جہاں دیدہ، متحرک اسٹاف علامہ مرحوم کی روح پرفتوح کو سکون پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گا۔

اللہ هو الموفّق ويهدي السبيل.

شمس الہدیٰ عفی عنہ

۶ راگست ۲۰۰۷ء

تأثرات

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ صاحب

شاہ ٹولی، داناپور کینٹ، پٹنہ۔۸۰۱۵۰۳

بیسویں صدی عیسوی میں اہل سنت وجماعت کے آسمان علم وفضل کانیرّ تاباں، ادب وصحافت کاشہریار، میدان عمل کاغازی، زبان وبیان کاساحر، قرطاس وقلم کاامین ایک نابغہ روزگار یعنی رئیس القلم علامہ ارشدالقادری ایسی فعال ومتحرک شخصیت تھی جس کی دور دور تک کوئی مثال نہیں۔ ارض وطن سے سرزمین یوروپ تک علامہ ارشدالقادری کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے علم وعمل کے مضبوط مراکز اور سنیت کے مستحکم قلعے تعمیر کردیے ہیں۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی ان میں سرفہرست ہے۔ دین متین اور اسلامی علوم کی یہ آماجگاہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور کارکردگیوں کے ساتھ مسلسل ترقی پذیر ہے۔ یہ کچھ میں اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ اس دینی وملّی ادارے سے بنام ''کاروان رئیس القلم'' ایک موقر مجلہ شائع ہورہا ہے۔ میری دلی دعاء ہے کہ ربّ تعالیٰ اسے اور اس کی مجلس ادارت کو عزم بالجزم وشرارِ زندگی عطافرمائے تاکہ حضرت رئیس القلم رحمۃ اللہ علیہ کا مشن قائم رہے نیز اس سے فیوض وبرکات کی نہریں جاری ہوں آمین ثم آمین!

رونداگانِ طریقت بہ نیم جو نخرند
قبائے اطلس آنکس کہ عاری از ہنراست

طلحہ رضوی برقؔ عفی عنہ

۳۱؍جولائی ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر خواجہ اکرام صاحب
اسسٹنٹ پروفیسر
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خدا آباد رکھے اس چمن کو

رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذات گرامی اپنے آپ میں صدا نجمن تھی۔ ایسی شخصیات برسوں بعد اس جہان فانی میں نزول کرتی ہیں۔ بقول میر تقی میر۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

حقیقت یہی ہے کہ انسان تو وہی ہے جس کی زندگی انسانوں کے لیے نہ صرف مثالی بن جائے بلکہ ان کے جدو جہد اور مذہب وملت کے لیے ان کے کارہائے نمایاں مشعل راہ بھی بن جائیں۔ علامہ ارشد القادری کی شخصیت بھی ایسی ہی ہے جنھوں نے نہ صرف ہندستان میں بلکہ مغربی اور افریقی ممالک تک علم وفضل کا چراغ روشن کیا۔ ان کے کارنامے اور ملک وقوم کے لیے ان کی خدمات کا بیان چند الفاظ میں ناممکن ہے۔ لیکن یہاں میں ان کے اس مثالی کارنامے کا ضرور ذکر کرنا چاہتا ہوں جو یقیناً بے مثل ہے۔

آج اکثر اہل علم مدارس کی تعلیم کے حوالے سے اپنے تحفظات کا ذکر کرتے ہیں اور موقع بے موقع اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی نے آج تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مدارس کے تعلیم یافتہ طلبہ وطالبات میں جو چنگاری ہے اسے صرف ہوا دینے کی ضرورت ہے۔ اگر انھیں صحیح سمت میں لگا دیا گیا تو یہ ملک وقوم کے لیے بیش قیمت سرمایہ بن سکتے ہیں۔ کیونکہ آج کی دنیا میں سب سے بڑی کمی کا جو احساس ہے وہ اخلاقیات کے حوالے سے ہے۔ آج ہمارے کرداروں میں اقدار کی سخت کمی ہے۔ ہر طرف کساد بازاری اور مفاد پرستی کا دور دورہ ہے ایسے میں عہد حاضر کے تمام تعلیمی ادارے ترقی کی ہوڑ میں محض مادی تعلیم کو اپنا مقصد ومنہاج بنائے ہوئے ہیں، پھر ان سے کسی طرح کی اخلاقیات کی توقع کرنا بے سود ہے۔ اور جب بات یہی ٹھہرے گی تو ہمارے معاشرے میں نہ صرف کرب وانتشار ہوگا بلکہ ہر طرح کی بدعنوانی اور فتنہ پردازی ہی نظر آئے گی۔

دوسری جانب محض مدارس میں دینی تعلیم کے حصول کے بعد اصلاح وتبلیغ کا کام تو کیا جاسکتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ اس عہد میں صرف دین کی تعلیم سے اصلاح کا کام بھی پورے طور پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اردگرد کے معاشرے اور زمانے کی نبض کو پہچانیں، تبھی یہ ممکن ہے کہ ہم دین کی بھی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ علامہ ارشد القادری کی دور بین نگاہوں نے اس تقاضے کو سمجھا اور ہندستان میں پہلا ایسا ادارہ قائم کیا جو مدارس کے فارغین کی ٹریننگ اور دیگر علوم سے آشنائی کے سمت میں ایک ایسا قدم تھا جس نے مدارس کے طلبہ کو ایک نئی راہ دی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی طرز پر اور بھی مدارس بنائے جائیں اور کم از کم یہ جو جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء ہے اسی کے فروغ اور ترقی کے لیے کام کیا جائے۔ ہمارے علمائے کرام اس سلسلے میں سب سے زیادہ اور سب سے بہتر کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

میں جامعہ کے طلبہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اس طرح کے مجلّے کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ خدا ان کے حوصلے کو سلامت رکھے اور وہ اس طرح کے اشاعتی کام انجام دیتے رہیں تاکہ یہ دستاویز دور دور تک لوگوں تک پہنچے اور اپنا تعارف بھی کرائے اور ان کی حمایت بھی حاصل کرے۔

خواجہ اکرام

حضرت مفتی بحر العلوم عبد المنان صاحب قبلہ
سے
اساتذہ جامعہ ہٰذا کی گفتگو

حضرت علامہ مفتی بحر العلوم صاحب کا ہالینڈ کے تبلیغی دورہ کے ویزا کی حصول یابی کے سلسلے میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء میں قیام رہا۔ اس دوران یہاں کے اساتذہ نے مختلف اوقات میں کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی طور پر آپ سے گفتگو کی۔ اس گفتگو کے چند گوشے سوال وجواب کی شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ (مدیر)

سوال:۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ کے عظیم کارناموں پر مختصر روشنی ڈالیں۔

جواب:۔ مبارک پور کی حقیقی آبادی تو شروع ہی سے سنی صحیح العقیدہ تھی لیکن عروج ایام سے گمراہ ہوں کے تمام فرقے وہاں پیدا ہوگئے تھے جس کی وجہ سے طبقۂ اہل سنت بالکل دب گیا تھا۔ حضور حافظ ملت کی تشریف آوری سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ مراسم سنیت کو نئی زندگی ملی اور باطل فرقوں کی دسیسہ کاریوں سے سنی مسلمان محفوظ ہوگئے۔ مبارک پور کا فائدہ یہ ہوا کہ پوری دنیا میں ایک علمی مرکز کی حیثیت سے اس کا نام روشن ہوا اور اہل مبارک پور کو دنیاوی فائدہ یہ ہوا کہ آپ کے دم قدم کی برکت سے مسلسل پچیس سال سے کاروبار نہایت اچھا رہا اور قومی پیمانے پر فائدہ یہ ہوا کہ دار العلوم اشرفیہ کی علمی جدوجہد نے سنیوں کو وقار بخشا۔

سوال:۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات میں سے کس لمحہ نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

جواب:۔ حضور حافظ ملت کا ہر لمحہ متاثر کن اور مثالی ہوتا تھا، کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔

سوال:۔ فتاویٰ رضویہ کی ترتیب واشاعت کی راہ میں مشکلات اور چیلنجز کیا تھے؟

جواب:۔ فتاوی رضویہ کی اشاعت میں بنیادی دشواری تو سرمایہ کی تھی پھر مسوّدہ اس قدر خستہ ہوگیا تھا کہ اس کا قابو میں آنا مشکل معلوم ہوتا تھا اور یہ بھی کمی تھی کہ طباعت واشاعت کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل علم اور اہل مال کی طرف سے جیسا تعاون ہونا چاہئے تھا ایسا تعاون نہیں ہوا۔

سوال:۔ اب تک پوری جماعت کی طرف سے رضویات پر جو کام ہوا اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں۔ مزید رضویات پر کیا کچھ ہونا باقی ہے؟

جواب:۔ پاکستان میں کام اچھا ہو رہا ہے۔ ابھی مزید کا کیا سوال ابھی تو اعلیٰ حضرت کے تمام مخطوطات ہی شائع نہیں ہو پائے اور جو شائع ہو چکے ہیں ان کی ترتیب وتہذیب بھی ناقص ہے۔ الغرض کام تو بہت سارے ہیں اور جب کوئی کام کرنے کو تیار ہوگا تو اور کام بھی نکل آئیں گے۔

سوال:۔ نت نئے مسائل شرعیہ کے حل کے لئے مجلس شرعی کے قیام اور موجودہ سرگرمیوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب:۔ کام تو ہو ہی رہا ہے مگر ہمارے یہاں اتفاق واتحاد بلکہ یہ کہئے کہ اخلاص کی کمی ہے۔

سوال:۔ عصریات کے تناظر میں علوم اسلامیہ مثلاً اصول فقہ، عقائد اور علم کلام کی ترتیب جدید کس حد تک ناگزیر ہے؟

جواب:۔ بالکل ضروری ہے لیکن اس کے لیے علوم جدیدہ وقدیمہ دونوں کے ماہرین کی ضرورت ہے اور ایسے جامع کا مجھے علم نہیں جو دونوں میں کمال رکھتا ہو۔ ایک عرصے سے تمام علماء اہل سنت سے بار بار ذکر کر رہا ہوں کہ عقائد کے باب میں کچھ جدید تصادمات کا ذکر ہونا چاہئے اور قدیم میں از کار رفتہ کی تہذیب ہونی چاہئے، پر کون کرے؟

سوال:۔ ہماری اسلامی درسگاہوں میں اصول دعوت وتبلیغ، تقابل ادیان اور تاریخ وغیرہ جیسے مضامین کی شمولیت کس حد تک ضروری ہے؟

جواب:۔ ضرورت تو ہے مگر ایسا نصاب جو تمام کی تعلیم کا متحمل ہو اس کا پڑھنے والا ملنا مشکل ہے اس لیے طریقہ کار یہی ہونا چاہئے جس طالب علم کی طبیعت جس علم کے مناسب ہو اس کو اسی میں مہارت پیدا کرنے کی سبیل نکالی جائے۔

سوال:۔ اسلام ایک عالمگیر اور بین الاقوامی مذہب ہے جس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہے۔ اس تناظر میں طلبۂ مدارس اسلامیہ کا عصری درسگاہوں کی طرف رخ کرنا کتنا مفید یا کتنا مضر ہے؟

جواب:۔ اس کی ضرورت بھی ہے مگر فی الحال تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہاں جو جانے والے ہیں صرف دنیا کی طلب میں جاتے ہیں دین ان کے نزدیک ثانوی درجہ میں بھی نہیں ہوتا، اس کا کیا علاج ہے!

سوال:۔ آپ کی نظر میں کیا جملہ ارباب مدارس اسلامیہ "یکساں نصاب تعلیم" کی طرف سنجیدہ قدم اٹھا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

جواب:۔ اس کا جواب پیچھے گزر چکا۔

سوال:۔ آزادی کے بعد ہم علماء عرب سے بالکل کٹ گئے۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس عدم تعلقی کے جماعتی سطح پر مثبت اور منفی اثرات کیا ہیں؟

جواب:۔ سستی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کویت کے ایک بڑے عالم سے کراچی میں ملاقات ہوئی وہ یہ کہنے لگے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بعد تم لوگوں میں کوئی اتنا بڑا عالم پیدا نہیں ہوا جس کے رشحات قلم اہل عرب کو متاثر کر سکیں مگر اب تو یہ بیماری دور ہو گئی ہے۔ مصر وغیرہ کے بڑے بڑے اداروں میں یہاں کے علماء حصول علم کے لیے جا رہے ہیں۔

سوال:۔ کیا ہمارے علماء کو اسلامی مزاج کے مطابق سیاست کا سرگرم رکن رہنا چاہئے؟ سیاست سے ہماری دوری کے نقصانات کیا ہیں؟

جواب:۔ اس جواب میں اقبالؔ کا ایک شعر یاد آیا۔

میں بھی پابندئ نسواں سے ہوں محزون بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

سوال:۔ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی شخصیت کے کس پہلو نے آپ کو متاثر کیا؟ علامہ کا قائم کردہ ادارہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ اس تناظر میں آپ اس طرح کے اداروں کی کتنی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

جواب:۔ حضرت علامہ ارشد القادری نہایت ہی مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے اور کسی اقدام کے لیے وہ قافلہ کا انتظار نہیں کرتے تھے۔ ہر میدان میں وہ تنہا ہی سرگرم سفر ہو جاتے تھے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْا مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

ترجمہ: وہ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر دیئے پیچھے نہ احسان رکھیں نہ تکلیف دیں ان کا نیک (اجر) ان کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم۔

ابتدائیہ

ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب
امیر جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

اللہ جانے وہ کون سی ساعت سعیدہ تھی جب والد گرامی قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان نے عہد حاضر کے واقعی تقاضوں کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ''جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء'' کی شکل میں ایک ایسے ادارے کے قیام کا منصوبہ بنایا جو پورے برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد و تنہا ہے۔

کسے خبر تھی کہ بے سروسامانی کے عالم میں رکھا جانے والا ایک سنگ بنیاد صرف چند سالوں میں ایک صحت مند تحریک میں تبدیل ہوجائے گا جس کی دھمک زمین کی وسعتوں تک پھیلی گی۔ جس کے دور رس اثرات سے فکر ونظر کے پیمانے تبدیل ہوں گے۔ تحقیق وجستجو، ترقی وارتقاء اور عزت ووقار کی نئی جہتیں کھلیں گی۔ اور نئی نسل کے علماء وفضلاء کے لیے عصری علوم وفنون کا ایک نیا آفاق جنم لے گا۔

عقیدت ومحبت کے پس پردہ یہ روشنائی کا ناجائز استعمال نہیں بلکہ دیانت وانصاف کی عینک سے ناقابل تردید حقائق کا یہ ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے۔ یقین نہ آئے تو تحریک جامعہ سے قبل اور بعد کے فارغین کی طویل فہرست پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیں اور پھر اپنے ضمیر کی آواز پر ماضی اور حال کے درمیان موازنہ کریں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ یہ واضح طور پر محسوس کریں گے کہ پہلے ہمارے نوجوان علماء کی عمومی منزل مقصود صرف ایک ہی راہ پر گامزن تھی اور اب وہ کئی ایک جہتوں سے آشنا ہو گئے ہیں۔

پہلے عصری علوم وفنون کے حامل علماء کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے قابل تھی اور اب جدھر نگاہ اٹھایئے وہاں ہم نظر آئیں گے جو غیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بالکل انہیں کے لب ولہجے میں گفتگو کر کے انہیں حق کی سربلندی کے آگے جھکنے پر مجبور کرنے کی خداداد صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

یہ بھی قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کے جذبۂ اخلاص وعمل کی کارفرمائی ہے کہ عالم اسلام کی مشہور ومعروف یونیورسٹی جامعہ ازہر مصر سے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا الحاق عمل میں آیا اور دس سالوں سے پابندی کے ساتھ ہمارے علماء کی کھیپ وہاں سے علوم عربیہ ودینیہ میں کمال حاصل کر کے لوٹ رہی ہے۔

گرامی قدر! یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک طرف یہاں نوجوان علماء کو انٹرنیشنل زبانوں میں تحریر وتقریر، بحث ومباحثہ اور انداز تخاطب کا دل موہ لینے والا ہنر سکھایا جاتا ہے تو دوسری طرف عصری علوم وفنون کے زیور سے انہیں آراستہ وپیراستہ کر کے مستقبل میں ملت اسلامیہ کی قیادت کے لیے تیار بھی کیا جاتا ہے۔

اور کہنے دیا جائے کہ دعوت وتبلیغ، افہام وتفہیم اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں ''تحریری صلاحیت'' کی حیثیت بجاطور پر مرکزی کردار کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اہل سنت نے ہمیشہ اس کی اہمیت کا ادراک کیا اور اس جانب وہ آنے والی نسلوں کو راغب بھی کرتے رہے۔

اگر یہ جاننے کا شوق ہو کہ رئیس القلم علیہ الرحمہ کو قلم کی طاقت وقوت کا کس قدر ادراک تھا تو صاحب طرز ادیب حضرت علامہ یٰسین اختر مصباحی کے نام سے منسوب وہ خط پڑھیے جو ''دارالقلم'' کے قیام کے اعلان پر آپ نے انہیں لکھا تھا۔

رئیس التحریر حضرت مولانا محمد یٰسین اختر مصباحی صاحب مدیر مسؤل ماہنامہ حجاز جدید نئی دہلی۔

بیرون ملک کے سفر سے واپسی کے بعد مئی ، جون کے مشترک شمارے کا اداریہ پڑھا۔ حجاز کی زمین پر اپنے خون جگر سے جو نئے نئے گل بوٹے آپ نے کھلائے ہیں، دیدۂ شوق کی آسودگی کے لیے وہی کیا کم تھا کہ اس بار آپ نے دماغ کی سب سے اونچی سطح پر ایک ایسا گل کھلایا ہے کہ اس کی خوشبو سے کاغذ کا پیراہن تک معطر ہوگیا ہے۔ اپنے بہت سارے ذیلی شعبوں کے ساتھ ''دارالقلم'' کے قیام کا اعلان پڑھ کر میں حیران وششدر رہ گیا کہ آپ کے متعلق میرا سب سے اونچا تصور یہ تھا کہ آپ ایک بہت اچھے صاحب قلم، ایک فلک پیما مفکر، ایک صاحب طرز ادیب اور جذبات واحساسات کے ایک انقلابی ترجمان ہیں لیکن تازہ اداریہ کے ذریعہ اس حیثیت سے پہلی بار متعارف ہوا کہ آپ مستقبل کے بہت بڑے منصوبہ ساز بھی ہیں۔ خدائے قدیر آپ کی ان انگلیوں کی حفاظت فرمائے جن کی گرفت میں اب تک قلم تھا لیکن اب وہ ایک شکستہ حال قوم کی نبض پر ہیں۔

آپ بھی بدلتے ہوئے حالات کا یہ تماشہ دیکھ رہے ہوں گے کہ اب بتدریج زبان کی مصنوعات کی مارکیٹ ڈاؤن ہورہی ہے یہاں تک کہ جو طبقہ صرف الفاظ کے کاروبار پر اب تک زندہ تھا وہ اپنی معیشت کے لیے کسی اور ذریعہ معاش میں سرگرداں ہے۔

زبان کی بے ثباتی اور زوال پذیری کے اس رخ پر جب میں غور کرتا ہوں تو سورۂ علق کی آیت کریمہ '' عَلَّمَ بِالْقَلَمِ '' کی اہمیت ایک طلوع ہونے والے سورج کی طرح چمکنے لگتی ہے۔ آخر اس میں مشیت کا کوئی راز تو ہے کہ '' عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ '' کا ذریعہ زبان کو نہیں قلم کو بنایا گیا۔

اسلام کے حکیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر قلم کے ذریعہ قرآن کو محفوظ نہ کیا ہوتا تو آخر تنہا زبان کب تک اس کی حفاظت کرتی۔ اور سورۂ ن کے ابتدائیہ میں تو قلم کا سر اتنا اونچا ہوگیا ہے کہ اسے ان معظم ہستیوں کی صف میں کھڑا کردیا گیا ہے جن کی مشیت نے قسم استعمال فرمائی ہے۔ اور اس اعزاز کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ وَالْقَلَمِ کے بعد وَمَا يَسْطُرُوْنَ بھی ہے جس نے متنبہ کردیا کہ یہ شرف صرف لکھنے والے قلم کو حاصل ہے، جو قلم کسی لکھنے والے ہاتھ تک نہ پہنچے وہ کسی قابل ذکر اعزاز کا مستحق نہیں ہے۔

منصوبے کے مطابق '' دارالقلم '' میں آپ لکھنے والے ہاتھ ڈھالیں گے، انگلیوں کو قلم پکڑنا سکھلائیں گے اور دماغ کو خام مال فراہم کریں گے تاکہ قلم کا اعزاز اصحاب قلم تک پہنچ سکے۔

خدا آپ کو نظر بد سے بچائے اور آپ کے جذبے کی تکمیل کے لیے پردۂ غیب سے وسائل فراہم کرے۔ خدا نے چاہا تو آپ اس خارزار وادی میں مجھے بھی شریک سفر پائیں گے۔ والسلام

پہلی بار بزم '' کاروان رئیس القلم '' میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے میں پورے ایمان ویقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج صرف آپ ہی محظوظ نہیں ہورہے ہیں بلکہ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی پاکیزہ روح بھی قبر انور میں شاداں وفرحاں ہوگی کہ ان کا لگایا ہوا ایک ننھا سا پودا اب ایک ایسے گلستاں میں تبدیل ہوگیا ہے کہ جہاں سے فکر وفن، علم وہنر اور بصارت وبصیرت کا ایک '' کارواں '' نکل پڑا ہے۔

اس پر سعید موقع پر میں اپنے برادر گرامی حضرت مولانا فیض ربانی مدظلہ العالی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی قدم قدم پر ہمارے شریک سفر رہی۔ اسی طرح جناب حسنین برکاتی صاحب بھی بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اخیر میں خصوصی طور پر جامعہ کے اساتذہ حضرت مولانا محمد ذکی اللہ مصباحی صاحب، حضرت مولانا محمد سجاد عالم صاحب، حضرت مولانا نعمان احمد ازہری صاحب اور حضرت مولانا انوار احمد بغدادی صاحب کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی شبانہ روز جدوجہد کے نتیجے میں یہ خوبصورت سالنامہ آپ کے پیش نگاہ ہے۔

اسی طرح ان تمام معاونین ومخلصین کا بھی شکریہ جنہوں نے ادارتی ٹیم کے ساتھ دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر ممکن تعاون کیا۔

اللہ رب العزت سبھوں کو اجر جزیل سے نوازے۔ آمین ☆☆

قوم مسلم کی موجودہ صورت حال

ایک لمحۂ فکریہ

محمد ذکی اللہ مصباحی☆

امت محمدیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ رب تبارک وتعالیٰ نے اسے خیر امت کا لقب دیا۔اس اعزاز کی شرط کے طور پر اللہ تبارک وتعالی نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تذکرہ فرمایا۔یہ تذکرہ خود بتا رہا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر وشر کے امتزاج کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ارشاد ہے:فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس:۸) ''پھر دل میں اس کی بدکاری اور اس کی پرہیز گاری ڈال دی''۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ انسان کے اندر منفی اور مثبت دونوں طرح کے عوامل ومحرکات موجود ہیں۔اگر وہ مثبت عوامل کے ذریعہ فلاح انسانیت کا کام انجام دے تو یہی نیکی اور کامیابی ہے۔اس کا واضح بیان یوں ہے:وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر:۱-۳) ''انسان خسارے میں ہے مگر ایمان والے، اچھا کام کرنے والے اور حق اور صبر کی تلقین کرنے والے'' اور اگر وہ منفی عوامل کے ذریعہ فساد انسانیت کا سودا کرے تو یہی بدی اور شر ہے۔اس سے بھی معلوم ہوا کہ اس عظیم الشان لقب کا مستحق اسے صرف یونہی قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کے کاندھوں پر اسی قدر ایک عظیم ذمہ داری عائد کی گئی۔وہ ہے **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر**۔

بادی النظر میں یہ ذمہ داری آسان سی دکھتی ہے مگر معروف اور منکر کے پہلوؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''خیر معروف سے عبارت ہے۔معروف ان جانی پہچانی اچھائیوں،نیکیوں اور بھلائیوں کو کہتے ہیں جس کو سب اچھا، بھلا اور بہتر مانتے ہیں۔معروف مثبت کو کہتے ہیں۔معروف عالمگیر ہوتا ہے۔یہ وقت اور ملکوں کی سرحدوں سے پار لا محدود اور لا متناہی ہے۔کوئی فرد،قوم یا خطہ معروف کا منکر ہو کر نہ تو محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔یہ ایک ایسی لازمی ضروری چیز ہے جو سانس کی طرح تہذیب کی حیات کی ضمانت ہے۔جس دن خیر ختم ہو جائے گا حیات انسانی کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔امت مسلمہ اس خیر کے ضمیر سے اٹھی وہ خاک ناب ہے جو انسانیت کی گل سر سبد ہے۔اس لئے اس کا وجود حیات انسانی اور تہذیب ارضی کی ضمانت ہے۔

منکر:معروف اور خیر کی ضد ہے۔یعنی وہ جانی پہچانی برائیاں جن کو سب برا سمجھتے ہیں۔یہ منفی عوامل کا نام ہے جو تخریب وشر سے عبارت ہے۔خیر کی طرح یہ بھی عالمگیر اور لا متناہی ہے۔خیر اس وقت تک قائم اور غالب نہیں آ سکتا جب تک منکر اور منکر قوت کا استیصال نہیں ہوتا۔امت مسلمہ کی لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف خیر کا علم بردار بنے بلکہ منکر کا استیصال بھی کرے تا کہ خیر کو غالب آنے کا موقع ملے اور انسانیت اپنی منفی خصوصیات پر قابو پانے کے لائق ہو جائے۔یہ کام اجتماعی عمل کا متقاضی ہے،جس میں پوری انسانیت کو حصہ لینے کی دعوت دی جائے گی۔اس طرح منکر کے استیصال اور معروف کے قیام کے لئے ایک عالمی جدو جہد کا آغاز ہوگا جس کی قیادت خیر امت کے ہاتھ ہو گی یعنی امت مسلمہ کے ہاتھ'' (ڈاکٹر ابو ذر کمال الدین،امت مسلمہ کا مستقبل:ہدف،چیلنج اور ترجیحات)

پھر یہ کہ اس خیر وشر کے لیے علم کے ساتھ عمل کی ضرورت پڑے گی۔علم کے حصول کے بغیر خیر وشر میں امتیاز وتفریق ممکن ہی نہیں اور جب علم ہی سے کنارہ کشی اور پہلو تہی برتی جائے گی تو عمل کی نوبت ہی نہ آئے گی۔اگر کوئی علم کے بغیر عمل شروع کر دے تو غلط روی کا اندیشہ بہر حال موجود ہے۔اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم میں علم وعمل کا حکم ضمناً موجود ہے۔گویا کہ امت مسلمہ کی زندگی علم،عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معجون مرکب ہے۔اگر علم ہو مگر عمل نہیں تو بیکار،عمل ہے مگر علم کی دولت سے محروم تو یہ بھی بے سود ہے اور جب

دونوں چیزیں مفقود ہوں گی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تصور ہی ناممکن ہے۔

آج دوسرے اقوام عالم جدید وقدیم تعلیم کے ہتھیار سے لیس ہیں۔ ان میں زبردست اور حیرت انگیز طور پر عمل بھی ہے مگر یہ علم و عمل محض مادیت کے حصول کے لیے ہے۔ فلاح انسانیت اور اس کے تحفظ وبقا کے لیے نہیں ہے۔ اس تناظر میں ہم قرون اولیٰ اور مابعد کے زمانے پر نظر ڈالتے ہیں تو ان ادوار کے مسلمان علم و عمل کے زیورات سے مزین ہونے کے ساتھ بحسن وخوبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کو سرانجام دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود بھی ہر طرح کی دینی اور دنیاوی سعادتوں سے بہرہ ور تھے اور ان کی قیادت اور رہنمائی میں چلنے والے لوگ بھی خوش حال اور خوش باش تھے۔ ان میں جیسے جیسے ان چیزوں سے متعلق کمی آتی گئی اسی قدر وہ قعر مذلت میں گرتے چلے گئے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ قبل از آمد اسلام دنیا وحشت و بربریت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسلام آنے کے بعد رسول گرامی وقار ﷺ نے تنِ تنہا ہر جہت سے اپنے ماننے والوں، پیروکاروں اور سسکتی، بلکتی اور دم توڑتی انسانیت کی کامیاب قیادت ورہنمائی کے ساتھ پورے بنو آدم کو زندگی گزارنے کے وہ رہنما اصول دیے جن پر عمل پیرا ہو کر آج بھی کوئی قوم دینی اور دنیوی سعادتوں سے ہمکنار ہوسکتی ہے اور ہو رہی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels "(Dr.micheal H. Hart,The 100, New York 1978)

''وہ (محمد ﷺ) تاریخ (انسانی) میں تنہا وہ شخص ہیں جو دینی اور دنیوی دونوں سطح پر زبردست کامیاب تھے''۔ زمانۂ نبی ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کا دور آیا تو ہر قسم کی قیادت تنہا ایک شخص نے انجام نہیں دی بلکہ ملکی سیاست کے لیے الگ افراد تھے اور تعلیمی رہنمائی کے لیے الگ افراد تھے۔ مابعد کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا کہ صلحاے امت اس فریضہ کو انجام دیتے رہے اور ان میں بھی یہی طریقہ رائج رہا مگر بنیادی چیزیں: علم اور عمل کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پائی جاتی رہیں۔ لیکن آج کی جو صورت حال ہے وہ کچھ حوصلہ افزا نہیں۔ ہماری عددی کثرت یقیناً ہے لیکن نہ کوئی علمی دبدبہ ہے نہ کوئی عملی اقدام اور نہ کوئی اثر ورسوخ۔ کہنے کو مسلم ممالک کی تعداد ساٹھ پینسٹھ ہے۔ ان کی اپنی حکومت ہے وسیادت ہے۔ وہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں مگر درون خانہ جھانکنے سے بڑی تشویش ناک صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا ہے کہ ان پر عالمی طاقتیں مسلط ہیں جو ان اسلامی ممالک کے اندر بھی اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ پس پردہ انجام دے رہی ہیں۔

عالمی قیادت اور ہماری کوتاہیاں: آج جو قوم اپنی بنیادی تعلیم کے ساتھ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ اور ان کے وسائل وذرائع سے مسلح ہے اسی کی بلا شرکت غیرے بالا دستی ہے۔ اسی کی قیادت وسیادت ہے۔ اسلاف نے ہم جدید نسلوں کے لیے سائنس، ٹکنالوجی اور علوم و معارف کے جو خزانے چھوڑے تھے ان پر مزید تحقیق وریسرچ کرنے کی بجائے ہم نے انہیں زینت طاق بنا ڈالا اور ایک دوسرے پر تکیہ کر لیا۔ نتیجۃً دوسرے اقوام عالم نے انہیں کا اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کرکے بڑی مکاری اور چالاکی کے ساتھ انہیں اپنے کارنامے شمار کرنے لگے۔ انہوں نے ہماری کوتاہیوں کا غلط استعمال اور ناجائز فائدہ اٹھا کر انتھک جدوجہد کی اور ہماری محنت اور کوشش کو اپنی جانب منسوب کر ڈالا۔ جنہیں ہم علم کی بھیک دیا کرتے۔ جنہیں ہم انسانیت کا درس پڑھاتے اور امن وسلامتی اور خیر کی دعوت دیتے آج وہی قومیں ہمیں علم اور دعوتِ خیر کا کاسۂ دریوزہ گری لے کر اپنے دروازے پر آنے پر مجبور کر بیٹھے ہیں۔ ہمیں اس وقت بڑا قلق ہوتا ہے جب عصری علوم سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو فن اور علم سے متعلق مسائل ومبادی کے بارے میں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ فلاں امریکی، فرانسیسی، جاپانی اور روسی وغیرہ سائنسداں، فلسفی اور مؤرخ کا اس مسئلے میں یہ نظریہ اور رائے ہے۔ ان میں کوئی مسلم امریکی، فرانسیسی، جاپانی اور روسی سائنسداں، فلسفی اور مؤرخ نہیں ہوتا۔ کیا ان علوم وفنون (Arts and Sciences) میں ہمارے کارنامے نہیں ہیں؟ ضرور ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ کسی مسلم مؤرخ، فلسفی اور سائنسداں کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ ان کی رائے اور نظریے کو

ان علوم وفنون میں کوئی حیثیت ووقعت کیوں نہیں ملتی؟ کیا اس وقت ہمارے پاس عالمی معیار کے افراد نہیں ہیں؟ کیا یہ تعلیم کو دینی اور عصری علوم میں بانٹنے کا نتیجہ نہیں ہے؟ اس سمت میں غور وفکر کے ساتھ عملی اقدام کی ضرورت ہے۔

ہم نے دینی علم کو اپنے لیے مخصوص کرلیا اور دیگر علوم کو دوسروں کے حوالے کردیا جب کہ ''سائنس اور اسلام میں کوئی بُعد نہیں۔ معاش اور اسلام میں کوئی لڑائی نہیں۔ سیاست اور اسلام میں کوئی دوری نہیں۔ ہر وہ چیز جو انسانی معاشرہ کو پاکیزگی، ترقی، امن اور خوش حالی سے ہم کنار کرے اسلامی ہے اور اسلامی دائرے میں پسندیدہ وگوارہ۔ اسلام نے تجربات کرنے، جوکھم اٹھانے، نئی جہت تلاش کرنے اور ہفت اقلیم فتح کرنے سے نہ کل روکا تھا اور نہ آج روکتا ہے'' (ڈاکٹر ابوذر کمال الدین، امت مسلمہ کا مستقبل ہدف، چیلنج اور ترجیحات)

دوسری تشویش ناک بات یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ذریعے بھی ہم سے وہ کام نہ ہوسکا جو ہونا چاہیے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ جو اسلام مختصر سی مدت میں اخلاق ومروت اور انسانیت کے درس کے ذریعہ پوری دنیائے انسانی پر بڑی تیزی کے ساتھ پھیلا آج وہی اسلام عالمی عدالت کے کٹہرے میں یہ صفائی دینے کے لیے مجبور ہورہا ہے کہ اسلام دہشت گردی کا درس نہیں دیتا ہے۔ انسانیت کا علم بردار ہے۔ دنیا میں امن چاہتا ہے۔ اس نے قتل واحد کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے اور ایک جان کے تحفظ کو پوری انسانیت کی صیانت بتاتا ہے۔

مسلم ممالک کا اتحاد اور اس کی حیثیت: اتحاد کے نام پر اسلامی ممالک کی تنظیم ''تنظیم اسلامی کانفرنس'' (OIC) ہے۔ اس کے رکن تمام اسلامی ممالک ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں تمام اسلامی ممالک کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا (اگرچہ نام کے ہی سہی) یقیناً حوصلہ افزا ہے۔ مگر اب تک کے نتائج بتاتے ہیں کہ ان کی نشستن، گفتن اور برخاستن کا کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی اثر۔ اس سال امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے واشنگٹن ڈی، سی میں تقریر کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ ''تنظیم اسلامی کانفرنس میں امریکہ کی نمائندگی کے لیے ایک خصوصی امریکی ایلچی (مندوب) مقرر کیا جائے گا جو مسلم ممالک کے نمائندوں کے سامنے امریکی نقطۂ نظر کی وضاحت کرے گا''۔ (ہندوستان ایکسپریس، ۲۹ جون ۲۰۰۷ء) اس اعلان سے امریکہ نے اپنے ناپاک ارادے کو الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر اسلامی اتحاد میں نقب زنی کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ اسلامی ممالک کے تئیں ان کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے کسی ہوش مند پر مخفی نہیں۔ کیا جس قوم کی سرشت میں مسلم کی عداوت وشقاوت ودیعت کردی گئی ہو اس سے کسی قسم کی خیر کی توقع اور امید کی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسلامی ممالک کی حیثیت کیا ہونی چاہیے: اللہ کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے مسلم ممالک کو بے پناہ ایسے قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے جن کے بغیر نظام زندگی کا چلنا دشوار ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ اسلامی ممالک ان وسائل کا اپنے ملکی مفاد کے لیے استعمال کریں اور جو قومیں ان کے عرصۂ حیات کو تنگ کرنے کے لیے سرگرداں ہیں ان کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کریں وہ ان وسائل کو غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو یا تو فروخت کرچکے ہیں کہ کم ازکم ان کی شراکت وحصہ داری ان میں ضرور ہے۔ ان اسلامی ممالک کے سربراہوں کے پاس عیش وطرب کی وجہ سے نہ تو قوت فکر ہے اور نہ قوت عمل کہ اپنے اپنے ممالک کے افراد کو متحرک کرسکیں۔

مسلم اُمّہ کے سامنے موجودہ چیلنجز: اس وقت پوری قوم مسلم کے سامنے کئی طرح کے مسائل ہیں۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو علاقائی یا ملکی ہیں اور کچھ بین الاقوامی ہیں۔ علاقائی مسائل کچھ خطے کے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں مگر بین الاقوامی مسائل سے پوری انسانی برادری متاثر ہوتی ہے۔ آج حقوق انسانی، اظہار آزادی رائے اور مساوات کے نام پر اسلام کو بدنام کرنے کی منظم سازشیں رچی جارہی ہیں۔ میڈیا ان مسائل کو ایسے انداز میں پیش کرتا ہے کہ عام آدمی کی بات تو دور کی ہے، پڑھے لکھے طبقہ کے ذہن ودماغ کو بھی وہ اپیل کرنے لگتا ہے۔ وہ بھی ان کے دام فریب میں پھنس کر اسلام کی صاف وشفاف شبیہ پر کیچڑ اچھالنے لگتے ہیں۔ یہی اسلام مخالف قوتوں کا منشا ہے کہ وہ اپنا کام خود اسلام کے حامیوں سے کروائیں تاکہ انہیں اسلام کو بدنام کرنے کا موقع زیادہ سے زیادہ میسر ہو۔ آج ہمیں بھی ان وسائل سے لیس ہونے کی ضرورت ہے جن سے ہمارے مخالفین پوری طرح لیس ہیں۔ اور جن

مسائل کو لے کر معاندین اسلام اس کے خلاف زہریلی مہم چلا رہے ہیں ان کی جدید تعبیر اور اس کی مکمل حقیقت وسچائی دنیا کے سامنے پرزور انداز میں پیش کی جائے۔

دعوتی مشن اور مسلم اُمّہ: پہلے ہماری دعوت وعمل کا دائرہ کچھ وسیع نہ تھا۔ ہم انہی سادہ لوح پڑھے اور بے پڑھے لکھے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کراتے تھے جو یا تو پہلے ہی سے ان سے واقف ہوتے تھے یا کم از کم وہ مسلمان ضرور تھے مگر اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ناواقف تھے۔ اس کا مثبت فائدہ یہ ہوتا تھا کہ جو ان تعلیمات سے واقف تھے ان کے قلوب میں اور جلا پیدا ہوتا اور جو نابلد تھے وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہوجاتے تھے۔

اسلام آفاقی ہے۔ اس کے اصول وضوابط ہمہ گیر ہیں۔ اس لحاظ سے دنیا کے ہر اس خطہ میں بسنے والے اس اصول پسند اور اعتدال پسند اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم اور غیر مسلم طبقہ تک اسلام کی صحیح اور روشن تعلیمات کو مختلف زبانوں پیش کی جائیں جس کے پاس غلط ذرائع (Wrong Sources) سے اسلام کی تعلیمات پہنچنے کی وجہ سے وہ اس کے تئیں غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔ اس کے لیے جن افراد کی ضرورت ہوگی پہلے ان کو تیار کرنا از بس ضروری ہے۔

آخری بات: میں نے جن مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان سے ہر ذی شعور واقف ہے۔ مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی کمی پر اپنے اپنے دلی کرب واضطراب کا اظہار وہ مختلف وسائل سے کرتے ہیں اور کررہے ہیں مگر اس سمت میں عملی اقدام نہ ہونے کی وجہ سے موجودہ اکیسویں صدی میں جس انقلاب کو دعوت دینا ہے اس کا منظم آغاز نہیں ہو پارہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس کرے اور ملت بیضا کی بہبودی کے لیے ہر زمانے اور ہر حالت اور ہر علاقہ کی ضرورت کے مطابق کام کرے۔

☆ فاضل مضمون نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے فارغ التحصیل اور جامعہ ہذا میں عربی ادب کے استاد ہیں۔

☆☆☆

باب اول

قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری

اور

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

پس منظر اور پیش منظر

علامہ یٰس اختر مصباحی☆

سرزمین دہلی ۱۹۴۷ء میں ایسے روح فرسا اور المناک دور سے گذری کہ اس کے تصور ہی سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایک قیامت صغریٰ تھی جو یہاں کے مسلمانوں کے سر سے گذرگئی۔ مہرولی شریف، قرول باغ، سبزی منڈی وغیرہ سے مسلمانوں کا مکمل انخلا ہوگیا۔ دہلی کے بیشتر مسلمان ترک وطن کر کے کراچی سدھار گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں یہیں شہید کردیے گئے۔ خانماں برباد دہلی کے علاقۂ جامع مسجد، لال کنواں وبلیماران میں کچھ مسلمان بچ بچا کر اور سمٹ سمٹا کر محصور ومقید ہو گئے۔ باڑہ ہندوراؤ دہلی کی بھی یہی داستان اور وہاں کا بھی کچھ ایسا ہی سماں تھا۔

یہاں صرف مفتی اعظم دہلی حضرت مولانا محمد مظہر اللہ نقشبندی خطیب وامام مسجد شاہی فتح پوری دہلی (متوفی ۱۹۶۶ء) کی ذات مرجع اہل سنت کی حیثیت سے باقی رہ گئی تھی۔ ایک دوسری شخصیت حضرت مولانا ابوالحسن زید مجددی (متوفی ۱۹۹۳ء) سجادہ نشیں خانقاہ حضرت شاہ ابوالخیر چتلی قبر دہلی کی تھی جو عوامی کم علمی زیادہ تھی۔ بائیس خواجگان کی چوکھٹیں مدتوں سونی رہیں۔ ایک طرف گردش روزگار کے شکار مسلمان خوف کے مارے گھروں سے نکلنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہے تھے تو دوسری طرف ان کے وہ سرپرست اور رہبر ورہنما علما ومشائخ نہیں رہ گئے تھے جو انھیں ان آستانوں سے وابستہ رہنے کی ترغیب دے سکیں۔

بڑی تیزی کے ساتھ جمعیۃ العلما اور تبلیغی جماعت نے یہاں کے مذہبی ماحول پہ اپنا قبضہ جمالیا۔ کانگریس کی قربت نے جمعیۃ العلما کی کامیابی کے سیاسی دروازے کھول دیے اور تبلیغی جماعت نے گھر گھر محلہ محلہ، مسجد مسجد پہنچ کر لٹے پٹے، دبے کچلے، تھکے ہارے، ہانپتے کانپتے مسلمانوں کو اپنی جانب مائل کرلیا۔ مذکورہ دونوں علما کی موجودگی کے باوجود کانگریسی حکومت کے سایے میں علمائے دیوبند چھاتے چلے گئے اور اس وقت کے حالات ایسے سنگین اور ناگفتہ بہ تھے کہ کہیں سے ان کی پرزور مزاحمت کھل کر نہ ہوسکی جس کی وجہ سے اپنے مقاصد میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوگئے۔ دہلی کے مسلمان جو صدیوں سے عقیدت واحترام اولیا و بزرگان دین کی شمع اپنے دل میں روشن کیے ہوئے تھے اس کی لَو تو کوئی نہ بجھا سکا مگر حوادث کے تھپیڑوں نے اسے مدھم ضرور کردیا تھا جسے رفتہ رفتہ تیز کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر افسوس کہ دہلی سے متصل علاقۂ مغربی اترپردیش کے سہارنپور کی علما کی سرگرمی وتیزگامی اور مرادآباد وبریلی وپیلی بھیت وبدایوں کے علمائے اہل سنت کی دہلی سے بے اعتنائی اور سرد مہری کی وجہ سے ایسا کچھ نہ ہوسکا جسے آج ہم فخر ومسرت کے ساتھ بیان کرسکیں۔

ہاں! ایک مرد درویش وقائد مخلص اور مرد مجاہد ضرور ہمیں نظر آتا ہے جس نے دہلی کی طرف خاطر خواہ توجہ کی اور ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اس کے لیے عملی قدم بھی اٹھایا جس کا نام ہے مجاہد ملت حضرت مولانا الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری اڑیسوی (متوفی ۱۹۸۱ء) علیہ الرحمۃ والرضوان!

مجاہد ملت علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک شاگرد وخلیفہ حضرت مولانا عبدالرب حبیبی مرادآبادی کو دہلی کے سپرد کیا اور انھیں ہدایت دی کہ تم دہلی میں رہ کر وعظ وتبلیغ کرو، وہاں کے مسلمانوں کو مراسم ومعمولات اہل سنت سے قریب تر رکھو۔ رضا کارانہ طور پر گھر گھر جا کر میلاد وفاتحہ کرو۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد مظہر اللہ صاحب دہلوی علیہ الرحمۃ کے تعاون سے حضرت مولانا عبدالرب حبیبی صاحب نے کئی سال تک دہلی میں یہ خدمت انجام دی۔ اور مجاہد ملت علیہ الرحمۃ اپنی جیب خاص سے ان کا سارا انتظام فرماتے رہے۔ دہلی کے لیے مجاہد ملت کے اس عملی آغاز کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی اسے آپ نے فراموش نہ فرمایا اور اپنے آخری سفر دہلی میں آپ نے کوشش فرمائی کہ سلسلۂ عالیہ برکاتیہ

دارالقلم قادری مسجد روڈ ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ ۲۵ موبائل نمبر: 9350902937

کے بزرگ حضرت سیدنا ابراہیم ایرجی قادری (درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۳) کے مزار کا دروازہ عام زائرین کے لیے کھول دیا جائے۔ اس کے لیے حضرت مجاہد ملت نذرانے کی ایک بڑی رقم پیشکش بھی کر چکے تھے۔ اور ذمہ داروں سے آپ کی بات بھی ہو چکی تھی ۔ اسی طرح علاقۂ جامع مسجد میں کوئی مکان خرید کر وہاں ایک سنی ادارہ قائم کرنے کے لیے بھی آپ کوشاں تھے اور اس کے لیے بھی اسی سفر میں آپ نے سلسلہ جنبانی فرمادی تھی۔

دہلی کے لیے چند متحرک وفعال علمائے اہل سنت کا دوسرا قابلِ ذکر اقدام ''سنی اوقاف کانفرنس'' منعقدہ دسمبر ۱۹۶۱ء ہے جس نے مسلمانوں کے حقوق ومطالبات واضح اور پرزور لفظوں میں حکومت ہند کے سامنے پیش کیے اور جمعیۃ العلما کی کارکردگی پر بھی کھل کر تنقید کی۔ کانفرنس جامع مسجد دہلی کے باہر مشرقی حصے کے وسیع میدان میں ہوئی تھی اس کی مجلس استقبالیہ کے چیئر مین مولانا امداد صابری دہلوی تھے۔ حضرت مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی، حضرت مولانا سید اسرار الحق، حضرت علامہ ارشد القادری، حضرت مفتی غلام محمد رضوی ناگپوری اس سنی اوقاف کانفرنس کے محرک ومنتظم تھے۔ خطبۂ صدارت برہان ملت حضرت مفتی برہان الحق رضوی جبل پوری (متوفی ۱۹۸۴ء) نے پیش فرمایا تھا۔ حضرت مفتی اعظم ہند مولانا الشاہ مصطفیٰ رضا قادری بریلوی (متوفی ۱۹۸۱ء) کی دعاوسرپرستی اس کانفرنس کو حاصل تھی۔

آزادی ہند کے بعد دلّی میں ہونے والی یہ عظیم الشان سنی اوقاف کانفرنس اپنے متعینہ اغراض ومقاصد کے علاوہ سیاسی حیثیت سے ایک سنگ میل ثابت ہوئی اور یہیں سے بعض علمائے اہل سنت سیاسی میدان میں سرگرم عمل ہوئے اور ایوان پارلیمنٹ تک پہنچ گئے۔ مثلاً حضرت مولانا سید مظفر حسین صاحب کچھوچھوی نے ۱۹۶۲ء کے پارلیمانی الیکشن میں مرادآباد سے ریپبلکن پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑکر لوک سبھا کی سیٹ جیت لی پھر ۱۹۸۰ء میں بہرائچ سے کانگریس کے ٹکٹ پر لوک سبھا کا الیکشن جیت کر دوبارہ پارلیمنٹ تک پہنچے۔ اوراسی سال مولانا اسرار الحق صاحب بھی سنجے گاندھی کی توجہ سے کانگریس کی طرف سے راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں عالی جناب بیکل اتساہی صاحب کو کانگریس پارٹی نے ممبر راجیہ سبھا بنایا اور ۱۹۹۰ء میں مولانا عبید اللہ خان اعظمی جنتادل کی طرف سے ممبر راجیہ سبھا بنائے گئے جو اپنی خوش قسمتی سے اب تک لگاتار تین مرتبہ ممبر راجیہ سبھا منتخب ہو چکے ہیں۔

قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ چاروں ممبرانِ پارلیمنٹ اہل سنت کے اسٹیج سے ابھرے اور اسی کی برکت سے ایوان پارلیمنٹ تک پہنچے۔ ان حضرات نے قومی وملی زندگی میں اپنے سیاسی اثر ورسوخ سے جو کچھ بھی کام کیا اور کرایا ہے وہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن ایک بڑا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ دہلی کے اندر اپنی کوئی تنظیم، اپنا کوئی ادارہ، اپنا کوئی دارالعلوم، اپنا کوئی دعوتی وتبلیغی مرکز بنانے حتّٰی کہ اپنی کوشش سے ایسی کسی عمارت کے لیے دوچار اینٹ رکھنے کی بھی ان حضرات نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی۔ اور یہاں کوئی ایسی یادگار نہیں چھوڑی جسے ان کا کام سمجھا جا سکے اور جہاں ان کا نام لیا جا سکے۔

تقریباً ۱۹۷۰ء تک مسلمانوں کی آبادی دہلی کے اندر نہایت محدود تھی جو دہلی نمبر ۶ میں بے چارگی وکس مپرسی اور خوف وہراس کے عالم میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی مگر ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اتر پردیش اور بہار کے مسلمانوں نے دہلی کا رخ کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ دہلی ونئی دہلی کے مختلف علاقوں میں محنت مزدوری کرکے اپنے چھوٹے موٹے آشیانے تعمیر کرنے لگے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہ رفتار تیز تر ہوگئی اور اب اللہ کا شکر ہے کہ دلی ونئی دہلی کے ہر چھوٹے بڑے علاقے میں کسی نہ کسی حیثیت سے مسلمان موجود ہیں جہاں وہ محنت مزدوری کے علاوہ پرائیویٹ اور سرکاری ملازمتوں سے بھی وابستہ ہیں اور تعلیمی وتجارتی اعتبار سے ماضی کے مقابلے میں مسلمان اس وقت بہتر پوزیشن میں بھی ہیں اور ان کی سیاسی حیثیت بھی بنتی جارہی ہے۔

اتر پردیش اور بہار کے یہ مسلمان اپنی صوبائی روایات اور اپنی مذہبی ومسلکی شناخت کے ساتھ یہاں آکر آباد ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی اپنی شناخت کے ساتھ اپنی اپنی سینکڑوں مساجد ومدارس بھی تعمیر کرلیے ہیں۔ چنانچہ بیس پچیس سال کے اندر کی وہ نوتعمیر شدہ مساجد جن کی کمیٹی اور امام ومؤذن سنی بریلوی مسلک سے وابستہ ہیں ان کی تعداد لگ بھگ دوسو ہو چکی ہے۔ اور انہیں مساجد کے اندر ان کے

چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی چل رہے ہیں۔ ان مساجد و مدارس کی برکت سے سال میں سینکڑوں جلسے بھی ہوتے ہیں جنھیں یوپی اور بہار کے علمائے اہل سنت خطاب کرتے رہتے ہیں۔

قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان (متوفّٰی ۲۰۰۲ء) جماعت اہل سنت اور دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے وہ نامور و قابل فخر فرزند ہیں جن کی خدمات کا دائرہ ہندو پاک سے یورپ تک پھیلا ہوا ہے اور جن کے قلم کی شوکت و عظمت کا پرچم اردو زبان کی مذہبی دنیا کے ہر خطے میں لہرا رہا ہے۔ ایک مدت دراز تک علامہ نے بہار و بنگال کو اپنا میدان عمل بنائے رکھا پھر ان کے طائر بلند پرواز نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں یورپ کی فضاؤں میں پرواز کرنا شروع کیا اور مبلغ اسلام علامہ شاہ احمد نورانی و پیر معروف حسین نوشاہی اور بعض دیگر علما و مشائخ اہل سنت کے اشتراک و تعاون سے اہل سنت کی ایک عالمی تنظیم ''ورلڈ اسلامک مشن'' کے نام سے قائم کی جس کے فیضان سے خصوصیت کے ساتھ برطانیہ و ہالینڈ کی تقریباً ہر مسلم آبادی سیراب ہو رہی ہے۔

اس کے بعد علامہ نے ۱۹۸۰ء میں ہندوستان کی راجدھانی دلّی کا انتخاب کیا اور یہاں ایک دارالعلوم قائم کرنے کا عزم مصمم فرمالیا۔ ۱۹۸۰ء ہی میں چونکہ علامہ کے دوسب سے قریبی دوست حضرت مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی اور مولانا سید اسرارالحق بالترتیب لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہو گئے تھے اس لیے ان کے یہاں قیام کی سہولت میسر آئی اور ان کے ذریعے دہلی میں کہیں بھی کوئی موقوفہ آراضی حاصل کرنا علامہ کی زندگی کا ایک اہم مقصد بن گیا اور اس کے حصول کے لیے شب و روز سرگرداں رہنے لگے۔ علامہ نے انتھک جدو جہد کی کہ وقف بورڈ دہلی سے اپنے ادارہ کے لیے کوئی زمین حاصل کرلیں۔ اس کے لیے انھوں نے نہ جانے کتنے ممبران پارلیمنٹ اور وزرائے حکومت کے دروازوں پر بار بار دستک دی۔ ایک زمانے میں عالی جناب عثمان عارف نقشبندی نائب مرکزی وزیر تعمیرات حکومت ہند کے ذریعے یہ کام کرنا چاہا۔ پھر ایک زمانے میں جناب سیتارام کیسری مرکزی وزیر تعمیرات حکومت ہند سے ایک وفد کے ساتھ ملاقات کی جس میں مَیں بھی شریک تھا اور اس سے پہلے عثمان عارف صاحب سے دو ایک ملاقاتوں میں بھی میری شرکت رہی مگر یہ ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ علامہ کے مذکورہ دوستوں نے بھی کسی دلچسپی کے ساتھ علامہ کا ساتھ نہیں دیا جس کا انہیں بے پناہ قلق تھا۔

میری معلومات کے مطابق ایک بار علامہ نے علاقہ جمنا پار کے فضل پور منڈاولی میں دوسو گز زمین اس وقت بڑے داموں سے مل خریدی تھی مگر افسوس کہ کچھ دنوں بعد کسی زمین خور نے وہ زمین ہڑپ کرلی۔ اسی طرح ایک بار دہلی وقف بورڈ نے یقین دہانی کرائی تھی کہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے مغربی افتادہ حصے میں آپ کے ادارہ کے لیے زمین الاٹ کردی گئی ہے اس پر قبضہ کرنا آپ کا کام ہے۔ لودھی روڈ پر بھی وقف بورڈ نے ایک بار آپ کو زمین دینے کا وعدہ کیا مگر یہ سارے وعدے اور یقین دہانیاں ہوائی ثابت ہوئیں۔ اور علامہ مدت دراز تک دربدر بھٹکتے رہے۔ تنگ آ کر علامہ نے سوچا کہ کسی مسجد کا کوئی حجرہ مل جائے تو اسے ہی اپنا آشیانہ بنا کر وہیں سے آگے کی طرف بھاگ دوڑ کی جائے اس کے لیے علامہ نے بنگال کے ایک معروف پیر حضرت ظلال القادری دربار عالیہ کلکتہ کے توسط سے پیر ضامن نظامی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی کو راضی کیا کہ وہ اپنے دولت کدہ کے سامنے کی اپنی ضامن المساجد کے گوشے میں ایک عارضی حجرہ تعمیر کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔ اور لگ بھگ ۱۹۸۷ء میں علامہ نے کسی طرح ایک چھوٹا سا حجرہ تعمیر کرا کے اسے ہی اپنی قیام گاہ اور کارگاہ بنالیا۔ پہلے مرحلے میں ایک مکتب کی شکل میں اسی ضامن المساجد کے اندر جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء قائم کیا۔ لیکن ادارہ کے لیے زمین کے حصول کا کہیں سے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا جس کے لیے علامہ نے مہرولی شریف کا رخ کیا۔ اور لگ بھگ ۱۹۹۱ء میں درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ریسیور جناب محمود قمر صاحب سے گفتگو کر کے وہاں درگاہ شریف کا ایک کمرہ عارضی طور پر حاصل کیا۔ مہرولی کے اندر ہی ایک موقوفہ آراضی جس پر ایک غیر مسلم خاندان قابض تھا اس سے بات چیت کی اور وہ ایک متعین رقم کے بدلے اپنا قبضہ ہٹانے کو تیار ہو گیا۔ دو قسطوں میں علامہ نے اسے اچھی خاصی رقم بھی حوالے کردی۔ ایک قسط کی ادائیگی کے وقت علامہ مجھے بھی اپنے ساتھ مہرولی شریف لے گئے تھے مگر سابقہ مراحل کی طرح یہ اقدام بھی

علامہ کے لیے ایک تلخ تجربہ ہی ثابت ہوا۔

ہر طرف سے تھک ہار کر علامہ نے ۱۹۹۲ء میں فیصلہ کیا کہ اب کوئی زمین خرید کر ہی اپنا کوئی ادارہ بنایا جاسکتا ہے اور وقف بورڈ دہلی کے چکر میں مزید وقت ضائع کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ چنانچہ ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی، ۲۵ میں زمین خرید کر جون ۱۹۹۲ء میں اس کا جلسۂ سنگ بنیاد منعقد کیا اور چند ماہ بعد اسی زمین پر ایک نقشے کے مطابق تعمیر شروع کرادی جو ۱۹۹۴ء میں مکمل ہوگئی۔ کچھ دنوں بعد ہی اس میں علامہ نے تعلیم و تدریس کا بھی انتظام کیا اور باضابطہ تدریسی آغاز ہوگیا جو آج جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

علامہ کے زرخیز اور جہاں دیدہ ذہن وفکر نے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے لیے علماودانشوروں کے مشورہ وتعاون سے ایک نیا نصاب تعلیم مرتب کیا جو دعوتی روح کے ساتھ عربی وانگریزی دوسالہ کورس پر مشتمل ہے۔ اپنی نوعیت کا یہ واحد اور پہلا تجربہ ہے جو علامہ نے کیا ہے اور ایک جماعتی ضرورت کی تکمیل کا سامان کرنے کوشش کی ہے۔

۱۹۹۵ء کے اخیر میں علامہ نے رام لیلا گراؤنڈ نئی دہلی میں ایک عظیم الشان ''سنی کانفرنس'' کی جس میں ہندوستان کے مشہور ومعروف علما ومشائخ اہل سنت نے شرکت فرمائی، ہزاروں سنی مسلمانوں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ اس کانفرنس میں حصہ لیا مگر افسوس کہ یہ کانفرنس ایک ایسے حادثے کا شکار ہوگئی جس نے علامہ کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور ان کے عزائم کو شکست وریخت سے دوچار کر دیا۔

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے سلسلے میں علامہ نے جتنی تگ ودو کی، جتنی پریشانیاں اٹھائیں، جتنے پاپڑ بیلے ان کا میں ایک عینی شاہد ہوں۔ کیونکہ ۱۹۸۴ء سے دلی میں میرا مستقل قیام ہے اور علامہ ۱۹۸۰ء سے قیام ادارہ کے لیے خانہ بدوش، خامہ بگوش اور کفش بردوش رہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۴ء تک علامہ کبھی دلّی میں ہوتے، کبھی جمشید پور میں، کبھی پٹنہ میں، کبھی ہوڑہ وکلکتہ میں، کبھی ملک کے دیگر مقامات اور غیر ملکی دورے پر۔ اس دوران ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ دو مہینہ دلّی میں کہیں عارضی قیام رہتا پھر کسی دورے پر نکل جاتے گویا آپ کی زندگی ایسے سیماب پارے کی طرح تھی جو سیماب پارہ ہر وقت تڑپتا رہتا ہے اور اسے کسی پہلو کبھی سکون میسر نہیں آتا۔

علامہ نے دہلی میں زمین کے حصول اور تعمیرات ادارہ کے لیے جتنی زحمتیں اٹھائی ہیں، جتنے دھوکے کھائے ہیں، جتنے چرکے انہیں لگے ہیں اگر کوئی دوسرا ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا مگر یہ علامہ ہی کا دم تھا کہ وہ ثابت قدم رہے اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر ہی دم لیا۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے قیام کا ایک بہت بڑا فائدہ جماعتی سطح پر یہ ہوا کہ سنی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ بالخصوص فرزندان اشرفیہ کا دہلی کی طرف ہوگیا۔ اور تقریباً ہر سال لگ بھگ دو درجن طلبہ دہلی آنے لگے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں اشرفیہ کی سند منظور ہوجانے کے بعد طلبہ کی تعداد دوچند ہوگئی۔ کچھ طلبہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا دوسالہ کورس مکمل کر کے اب جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ سے بی اے کرنے لگے اور کچھ طلبہ براہ راست وہاں داخل ہونے لگے۔ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جامعہ ہمدرد نئی دہلی، دہلی یونیورسٹی نئی دہلی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں مدارس اہل سنت کے فارغ التحصیل کئی درجن سنی طلبہ مختلف کورسوں میں زیر تعلیم ہیں۔

جامعہ ازہر قاہرہ سے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی سند کی منظوری کے بعد تقریباً ہر سال کئی طلبہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء سے جامعہ ازہر قاہرہ جانے لگے۔ اس طرح بہت سے طلبہ کے سامنے اپنی تعلیم اور ملازمت کے نئے نئے آفاق روشن ہوئے اور ان کا میدان عمل وسیع ہوگیا۔

علامہ کی خواہش اور ان کے معیارِ مطلوب کے مطابق تو نہیں مگر جو کچھ اور جتنا کچھ بھی ہوسکا اور اس وقت ہو رہا ہے وہ قابل ستائش ہے اور امید ہے کہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء مستقبل میں مزید بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا۔ جامعہ کے سبھی ٹرسٹی، اس کی مینجنگ باڈی اور تدریسی عملہ کے تعاون سے علامہ کے صاحبزادے مولانا غلام زرقانی کی سربراہی میں اس وقت یہ ادارہ سرگرم عمل ہے۔ مولانا سجاد عالم مصباحی، مولانا محمد نعمان احمد ازہری، مولانا انوار احمد بغدادی، مولانا محمد ذکی اللہ مصباحی دلچسپی اور ذمہ داری کے ساتھ تعلیم اور معیار تعلیم بہتر بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور جامعہ کا نام روشن کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

اس جامعہ کی جانب سے ایک سالنامے کا اجرا نہایت خوش آئند اقدام ہے جس کا میں استقبال کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ جہاں یہ

سال نامہ اپنی دعوتی روح کے ساتھ جامعہ کا ترجمان بنے گا وہیں ایک طرح سے علامہ کے ذوق تحریر کا بھی آئینہ دار ہوگا۔ اور جامعہ کے تعارف کے ساتھ علامہ کی فکری وقلمی خدمات سے قوم کو روشناس کرانے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ثابت ہوگا۔ اساتذہ اور طلبہ کو یہ حقیقت ذہن نشیں رکھنی چاہئے کہ بانی ادارہ حضرت علامہ ارشد القادری نے جس خلوص، جس لگن، جس حوصلہ، جس جذبہ اور جس اضطراب مسلسل کے ساتھ جامعہ کو قایم فرمایا ہے اس کا عکس جامعہ سے وابستہ سبھی اساتذہ وطلبہ کے اندر بھی نظر آنا چاہئے جبھی وہ صحیح معنوں مین جامعہ کے استاد اور اس کے طالب علم کہے جانے کے مستحق ہوں گے۔

علامہ کی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے قوم وملت اور جماعت کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی اور وہ کہیں بھی چین سے نہیں بیٹھے۔ انہیں میں نے جب بھی اور جہاں بھی دیکھا ہمیشہ اسی فکر میں غلطاں وپیچاں پایا کہ جماعت اہل سنت کی سرگرمی کے لیے کس جگہ کون سا کام کیا جائے؟ کس طرح اپنے لوگوں کو متحرک کیا جائے؟ اور کس طرح ان کے اندر جماعتی احساس وشعور کی روح پھونکی جائے؟

ان کے دیکھنے سننے والے ہزاروں لاکھوں افراد آج بھی گواہ ہیں کہ علامہ کی ہر تقریر، ہر تحریر اور ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ جماعت کے لیے وقف تھا اور وہ اپنے فکری شعور، قلمی طاقت اور منصوبہ بندی کے باب مین فائق الاقران والامثال تھے۔ اس لیے ان کی بارگاہ میں خراج عقیدت کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہوگا کہ ان کے کرب دسوز اور اضطراب مسلسل کو انفرادی طور پر نہ سہی اجتماعی طور پر باہم تقسیم کرلیا جائے اور ان کے مشن کو آگے بڑھایا جائے۔ ان کے پیغام کو عام کیا جائے اور ہر لمحہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا اپنے آپ کو عادی بنالیا جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق رفیق عطا فرمائے اور علامہ کی دینی وعلمی خدمات کے صدقے میں انہیں اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کو شب وروز ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

بجاہ حبیبہ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم

☆☆☆

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

میں تعلیم سے تدریس تک کا سفر

مولانا نعمان احمد اعظمی ازہری ☆

قائد اہل سنت رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی دینی، ملی اور علمی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ جہاں وہ سچے قائد قوم وملت تھے وہیں ایک پختہ قلم کار بھی تھے، ان کے قلم کی جولانی یہ تھی کہ قاری عش عش پکار اٹھتا، زبان اتنی طیب وطاہر اور پاکیزہ کہ غیروں نے اس کا برملا اعتراف کیا۔ لہجہ اور انداز بیان اتنا شائستہ وسنجیدہ کہ اپنے اور بیگانے سب نے داد وتحسین سے نوازا، اس کے ساتھ ہی حقیقت نگاری میں آپ امتیازی شان کے مالک تھے جس کی جیتی جاگتی مثال آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ''زلزلہ'' ہے۔

قرآن وسنت کے دعویدار اور توحید خالص کے ٹھیکہ دار جاہل عوام اور سیدھے سادھے لوگوں کو یہ مغالطہ دینے میں بڑی حد تک کامیاب تھے کہ وہ افراط اور غلو سے بہت دور ہیں جب کہ اہل سنت وجماعت کا بال بال غلو میں شرابور ہے لیکن یہ تو زلزلہ نے آشکار کیا کہ وہ اپنے اس قول میں کتنے سچے ہیں، اعتقاد وعمل میں تضاد کا جتنا حسین سنگم ان کے یہاں پایا جاتا ہے، شاید کہیں اور مل سکے۔

آج سے تقریباً ایک دہائی بیشتر جب میں مدرسہ شمس العلوم گھوسی میں دورہ حدیث کا طالب علم تھا۔ ایک طرف تو مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق وذوق تو دوسری طرف وسائل وذرائع کی قلت.... ایک عجیب پس وپیش کا ماحول تھا۔ انہیں دنوں حسن اتفاق سے ''زلزلہ'' جیسی کتاب میرے ہاتھ لگی۔ علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا نام تو بہت سنا تھا مگر ان کی پہلی تحریر سب سے پہلے زلزلہ کی شکل میں میرے مطالعہ کی میز پر آئی۔ میری علمی زندگی میں یہ پہلی کتاب تھی جس کو بالاستیعاب ازاول تا آخر میں نے ایک سے زائد مرتبہ پڑھی۔ مضامین پڑھ کر وہی تمنا مجھے بھی ہوتی تھی جو علامہ مرحوم کو محترم عامر عثمانی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر ہوتی تھی کہ اے کاش! تحریر کو آواز مل جاتی...

یہ بھی فطرت کا کرشمہ اور میری حرماں نصیبی کہیے کہ اب سے پہلے علامہ موصوف سے دست بوسی کا شرف نہیں ملا تھا۔ بعض پروگراموں میں دور دور سے زیارت ہوئی تھی۔ لیکن زلزلہ کے مطالعہ کے بعد آپ کی خداداد قلمی وفکری صلاحیت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ ملاقات کے لیے دل بے قرار تھا۔

ادھر میری تعلیم مکمل ہوئی، اور ادھر'' جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء'' میں باضابطہ تعلیم کے آغاز کا اشتہار اور دوسرے تعلیمی سال کے لیے اعلان داخلہ نگاہوں سے گزرا۔

دل میں خیال گزرا کہ علامہ موصوف سے فیض یاب ہونے کا اس سے زیادہ حسین موقع اور نہیں ہاتھ آسکتا کہ میں ان کے ادارہ میں داخلہ لے لوں۔ یہ رحمانی خیال آنا تھا کہ میں نے جامعہ کا فارم منگا کر پُر کر دیا۔ مگر شوال میں کسی سبب سے وقت جامعہ کے ہنگامی داخلہ امتحان میں نہ پہنچ سکا۔ ایک دن بعد علامہ موصوف سے بذریعہ فون رابطہ ہوا، اور میں نے اپنے داخلہ کے لیے التجا کی۔ آپ نے برجستہ فرمایا، ہمارے یہاں سفارشات کی قطعاً گنجائش نہیں۔ ہنگامی ٹسٹ ختم ہو کر پاس شدہ امیدوار کی لسٹ بھی جاری ہو چکی ہے۔ پھر بھی آپ اس قدر داخلہ کے متمنی ہیں تو آجایئے، انفرادی طور پر آپ کا امتحان ہو جائے گا، اگر ہمارے معیار پر کھرے اترے تو کسی سفارش کے بغیر آپ کا داخلہ ہو جائے گا۔

میں دلی پہنچا، ڈرتے ڈرتے علامہ موصوف کے چیمبر میں داخل ہوا۔ شرف دست بوسی حاصل کیا۔ ارد گرد چند لوگ جمع تھے، انہیں سے محو گفتگو تھے، میرا کام پوچھ کر پرنسپل صاحب کو ذمہ داری سونپ دی۔ علامہ موصوف اس وقت شیخ الجامعہ تھے، اور ایک طالب علم امیدوار کے ساتھ وہ انداز تخاطب! واقعی دلوں کو تسخیر کرنے کا ملکہ آں موصوف کو تھا۔ تحریری، تقریری امتحان کے بعد نہ جانے وہ کون سی نیک ساعت

☆: فاضل مضمون نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء فارغ التحصیل ہیں اور اسی جامعہ میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں

تھی کہ مجھ جیسے ناکارہ طالب علم کو کامیابی کا پروانہ مل گیا اور اس جامعہ میں داخلہ ہونا میری علمی زندگی کی معراج تھی۔اور آج بھی علامہ موصوف کا وہ تاریخی جملہ میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے جو کبھی آپ نے اس جامعہ کے تعارف میں رقم کیا تھا کہ ''اپنی گم نام شخصیت کو شہرہ آفاق بنانا ہو تو جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء میں داخلہ لیجئے''۔

باقاعدہ تعلیم کا آغاز کے بعد علامہ موصوف ہم سال اول کے طلبہ کی فجر بعد اپنے پاس کلاس لگاتے۔اور اس میں قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی سورتوں کا انگریزی ترجمہ سنتے۔

جامعہ ہذا میں تعلیمی نظام کو بہتر بنانے، اس کے دیگر امور کے نظم ونسق درست کرنے، طلبہ کے جائز مطالبے سننے اور اپنی علمی ودعوتی سرگرمیوں میں مشغول شخصیت کو کئی مرتبہ دیکھا گیا کہ آرام کا موقع نہیں ملتا، کبھی کبھی تو تکیہ پر ٹیک دے کر بیٹھے بیٹھے کچھ گھنٹہ آرام کر کے اپنی رات کی گھوٹی نیند پوری کر لی اور اس کے بعد بیدار ہونے پر بالکل ہشاش بشاش اور تازہ دم۔

رات کے دو بجے بھی اگر آئندہ کل کا کوئی منصوبہ ذہن میں آجاتا تو طلبہ کو جمع کرنے والی گھنٹی (Alarm) اسی وقت بج جاتی اور سب کو چیمبر میں حاضر ہونا پڑتا۔بعض طلبہ کی غیر حاضری پر سخت ناراض ہوتے اور مایوس کن لہجے میں فرماتے کہ ''ہماری جماعت میں کام کرنے کا جذبہ ہی نہیں ہے۔میں نے یہ جامعہ آرام وآرائش کے لیے نہیں جفاکشی کے لیے کھولا ہے۔آپ کو یہاں تن آسانی کے لیے نہیں بلکہ فوجی زندگی گزارنے کے لیے بلایا گیا ہے جو ہمہ وقت چاک وچوبند (Alert) ہوتے ہیں''۔

علامہ موصوف نے شخصیت کی تعمیر کے لیے جو طریقے اپنائے تھے وہ قابل ستائش ہے۔اس جامعہ کی چہار دیواری میں اس وقت صرف ایک چپراسی ہوتا جو اکثر اوقات علامہ موصوف کی خدمت میں اور جامعہ کے انتظام وانصرام میں مشغول ہوتا۔باقی اپنے کمروں کی صفائی، زینہ کی صفائی، مسجد (ہال) کی صفائی، صحن میں رکھے گلوں کی باغبانی ہم طلبہ پر باری کے ساتھ منقسم تھی۔یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ طلبہ کے اندر ذمہ داریاں محسوس کرنے کا شعور بیدار ہو، قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔کام کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔اس کے بعد کسی طالب علم کے متعلق سستی یا لاپرواہی کی شکایت پر زجر وتوبیخ کی مہمیز کے ساتھ دست وبازو کا استعمال بھی بعید نہ تھا۔

ذمہ داریوں کا احساس دلانا علامہ موصوف کا اولین درجۂ تربیت تھا۔چنانچہ اس کا انہیں شکوہ بہت زیادہ تھا کہ ہماری جماعت میں کوئی ذمہ داری نبھانا جانتا ہی نہیں۔اس تناظر میں علامہ موصوف نے نماز باجماعت کی پابندی کے لیے ہمارے سروں پر کوئی نگراں مسلط نہیں کیا۔پھر نماز فجر وعصر میں اکثر وبیشتر خود چیک فرماتے اور اکثر فرماتے کہ نگراں متعین کر کے آپ کو نمازوں کے لئے اٹھنے اور جماعتوں میں شرکت کا عادی بنائے جائے تو کون سا کمال ہوگا! ہاں کمال تو تب ہوگا جب آپ فرداً فرداً اپنی ذمہ داری محسوس کر کے بغیر کسی کی یاد دہانی کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوں۔تاکہ آنے والی قائدانہ زندگی میں ایک داعی کی ذمہ داری محسوس کرنے اور ذمہ داریوں کو نبھانے کی عادت پڑ جائے۔

طلبہ کو مؤدب مگر بے باک وجسارت مند، چھوٹے بڑے کا پاس ولحاظ مگر حق گو اور راست باز بنانے کے لیے بھی آپ کا طریقہ کار بڑا نرالا ہوتا۔جب بھی کوئی مہمان جامعہ کی زیارت کے لیے کہیں سے آتا، ہم طلبہ کو جمع ہونے کا فرمان جاری ہو جاتا۔ اس کے بعد آنے والے مہمان سے مخاطب ہو کر فرماتے یہ ہمارے طلبہ ہیں جو جدید عربی زبان وادب اور انگریزی میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ آپ کسی بھی اسلامی موضوع یا سلگتے مسائل پر مذکورہ زبانوں میں اظہار خیال کرا سکتے ہیں۔ ایسی بڑی اور قدر آور علمی شخصیتیں میں جن کے سامنے راقم کو چار ونا چار اپنے ٹوٹے پھوٹے لب ولہجہ میں لب کشائی کا موقع ملا، ان میں عزت مآب ڈاکٹر پروفیسر مسعود احمد صاحب قبلہ (پاکستان) عزت مآب ڈاکٹر سید طلحہ رضوی برق صاحب، عزت مآب شیخ ابوبکر احمد صاحب (کیرالہ) عزت مآب حضرت مولانا منان رضا خاں منانی میاں صاحب قبلہ (بریلی شریف) کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہیں کہ جس نے بھی علامہ موصوف کی موجودگی میں منتخب عناوین پر طلبہ کا برجستہ اظہار خیال ملاحظہ کیا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہا، طلبہ وجامعہ کی تعریف کی حضرت علامہ کے کارناموں کو سراہا اور دعائیں دی۔

روایتی مدرسوں سے ہٹ کر اس جامعہ کا نصاب تعلیم ہے۔بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بجا ہے کہ موجودہ ہندوستان کے تمام مدارس میں جامعہ ہذا

اپنی نوعیت کا منفرد اور بے مثال ادارہ ہے۔ جہاں فارغ التحصیل علماء کا داخلہ ہوتا ہے۔ اور دو سالہ مکمل نصاب تعلیم کے ذریعہ انہیں دین کا داعی بنایا جاتا ہے۔ رہنے سہنے اور خورد و نوش کا انتظام معیاری ہے۔ اساتذہ وطلبہ کے کھانوں میں کوئی تفریق نہیں۔ ہر طالب علم کو ایک تخت (Bed) اور ایک الماری دی جاتی ہے۔ جامعہ ہذا کے شروع تعلیمی سال میں RS. 500 وظیفہ بھی متعین تھا مگر بعد میں حالات کی نامساعدت کے باعث وظیفے موقوف کردیے گئے۔ ہماری کوشش ہے کہ جلد از جلد یہ جامعہ اپنے متعینہ خطوط پہ آجائے تاکہ وظیفہ دوبارہ جاری کرایا جائے۔ عام طور پر مدارس میں انشاء پردازی اور مضمون نگاری نصاب تعلیم کا جزء نہیں مگر جامعہ ہذا کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں ماہانہ وال میگزین بزبان عربی، انگریزی اور اردو شائع ہوتی ہیں۔ جس میں ہر طالب علم کی قلمی شرکت حتمی ہے اس کے علاوہ قلم کی پختگی اور ذوق مطالعہ بڑھانے کے لیے سال اول کے طلبہ سے پچیس صفحہ پر مشتمل علمی مقالہ بزبان اردو اور سال دوم کے طلبہ سے ۱۰۰ اصفحات پر مشتمل تحقیقی مقالے بزبان عربی یا انگریزی لکھوائے جاتے ہیں۔ اپنی جماعت کا وقار بلند کرنے اور اس کو جاہلوں کی جماعت سے تعبیر کرنے والوں کا منھ بند کرنے کے لئے علامہ موصوف نے کس قدر تگ و دو کیا اور کتنی مشقتیں برداشت کیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے آپ کی بے پناہ مصروف زندگی کا وہ باب نہایت اہم ہے جو جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی داغ بیل سے کھلتا ہے۔

ایسے بلند پایہ مفکر کے ذہن میں ایک ایسے تربیتی ادارہ کا خاکہ بننا آسان تھا مگر اس خاکہ کو روئے زمین پر محسوس شکل میں لانا اور اس کے بعد اس میں رنگ بھرنا بہت مشکل مرحلہ تھا، خود علامہ موصوف کی زبانی ہم نے اپنے کانوں سے سنا:

''بہار سے جب میں دلی آتا تو اپنے ساتھ ستو ضرور لاتا اور کتنے دن ایسے ہوئے جب معمول کے کھانوں کے بغیر صرف ستو کھا کھا کر گزارا کرتا، دلی میں ٹھہرنے کے لئے کوئی مسافر خانہ یا ہوٹل نہیں بلکہ محبوب الٰہی کی چوکھٹ پر ضامن المساجد میں اپنا سامان رکھ دیتا، اور وہیں سے کوشش کرتے کرتے یہ جامعہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا''

اس مقام پہ علامہ مرحوم کے کارناموں کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے کہ دہلی جیسی خشک سرزمین پر اہل سنت و جماعت کا وہ سرسبز و شاداب چمن بنایا گیا کہ آج ملک و بیرون ملک سے آنے والے کسی فرد کو یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ وہ دہلی میں کہاں قیام کرے گا؟ بلکہ اس کے لئے یہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا باب ترحیب ہر وقت کھلا ہوا ہے۔

ادارہ کھلنے کے بعد علامہ موصوف کا اگلا قدم اس جانب بڑھا جدھر اب سے پہلے دنیائے سنیت نے رخ نہیں کیا تھا۔ یعنی اس ادارہ کا الحاق (Affiliation) غیر ملکی یونیورسٹیوں سے کرانا۔ ۱۹۹۷ء میں شیخ الازہر عزت مآب ڈاکٹر محمد سید طنطاوی صاحب اپنے سرکاری دورہ پر ہندوستان تشریف لائے، موصوف کا حیدرآباد سمیت کئی شہروں کا دورہ ہوا۔ جب آپ کا دہلی میں دورہ ہوا تو علامہ موصوف بڑی کوشش کے بعد ان سے ملاقات کا ٹائم لینے میں کامیاب ہوئے۔ اور اسی ملاقات میں جامعہ کے الحاق کی درخواست شیخ الازہر کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس کے بعد علامہ موصوف بارگاہ خداوندی میں دعاؤں اور منتوں کی سوغات نچھاور کرتے رہے یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۹۸ء میں الحاق کا پروانہ یوں ملا کہ جامعہ کے تین طالب علم (بشمول راقم) کا داخلہ ہو گیا۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب ہمیں ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کا پروانہ ملا تھا اور یہ خوشخبری علامہ موصوف کو جب سنائی گئی تو آپ کی خداترس آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو امنڈ رہے تھے، اور یہی فرماتے تھے کہ جامعہ حضرت نظام الدین قائم کرنے کی میری محنت تر گئی۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہم تینوں طالب علم کے اہل خانہ کو اتنی مسرت نہیں ہوئی جتنی علامہ موصوف کو ہوئی۔

تعلیم مکمل ہونے کے بعد جب ہندوستان واپس ہوا اور دہلی جامعہ ہذا میں حاضر ہوا تو واقعی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ چمن سونا ہے، اور اس کا اصل باغبان ہمیں غریب الوطنی میں چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ دل میں بار بار یہ تمنا ہوتی اے کاش آج علامہ موصوف باحیات ہوتے تو قدموں میں گر کر ہم یہی عرض کرتے: حضور آپ کی محنت تر گئی۔

اس جامعہ اور بانی جامعہ کے ساتھ قلبی وابستگی مجھے بار بار جھنجھوڑ رہی تھی کہ یہ ادارہ میری خدمت کا زیادہ حقدار ہے۔ اس تناظر میں اسی وقت قدرے پیش رفت ہوئی تھی۔ مگر حالات وافراد کی ناموزونیت اس راہ میں حائل تھی۔

لیکن ماہ نومبر ۲۰۰۶ء کے نئے تعلیمی سال سے اس جامعہ میں خدمت کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ چوں کہ علامہ مرحوم کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے اور اس جامعہ میں آپ کے شب وروز دیکھنے کا حسین موقع میسر آیا تھا۔ ایسے ادارہ کے قیام کا مقصد اولین ہم نے حضرت علامہ کی زبانی سنا تھا۔ لہٰذا کام شروع کرنے کے لیے خطوط میرے لیے بالکل واضح تھے۔ گوکہ حالیہ چند سالوں میں جامعہ کو اپنے اصل ہدف سے ہٹا کر کسی اور جانب ڈال دیا گیا تھا، مگر الحمد للہ ابھی وقت گیا نہیں تھا، اپنے فرض کی ادائیگی میں کسی فرد کی ملامت کی قطعاً پرواہ کیے بغیر سب سے پہلے تعلیمی نظام درست کرنا شروع کیا، ہمارا کورس پورے دوسال میں محیط چار میقاتوں (Semesters) پر مشتمل ہے۔ ہر چھ مہینے پر مستقل امتحان ہونے لازمی تھے۔ مگر ہم نے معیار تعلیم بلند کرنے کے لیے یونیورسٹیوں کی طرز پر ہر تین مہینہ پر کلاس میں ٹسٹ (Internal Assessment) کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک نظام کے تحت زندگی گزارنے کے لیے ایک ضابطہ اخلاق جاری کیا۔ پندرہ روزہ وال میگزین پابندی سے نکلنا شروع ہوا۔ ہفتہ وار بزم میں اساتذہ کی شرکت لازمی قرار پائی۔

ایک اہم تبدیلی جو قابل ذکر ہے کہ درمیانی حالیہ چند سالوں میں نظام امتحان اتنا بدتر ہو گیا تھا کہ نتیجہ کس بلا کا نام ہے یہاں کے طلبہ جانتے ہی نہیں تھے، پھر کہاں کی پڑھائی اور کیسا امتحان؟ ہم نے امتحان کے بعد اہتمام برتا کہ کم سے کم مدت میں نتیجہ برآمد ہو۔ تاکہ طلبہ اپنی کارکردگی دیکھیں۔ اس کے ساتھ یہ لازم کر دیا کہ ایک ہی مضمون میں دومرتبہ ناکامی طالب علم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور ہوگی۔ الحمد للہ اس کا مثبت اثر ظاہر ہوا۔

علامہ موصوف کے خوابوں کی حسین تعبیر پیش کرنا ہی ہمارا نصب العین ٹھہرا۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ''کاروان رئیس القلم'' کی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارے طلبہ کی فکری پرواز، زبان وقلم کی شائستگی اور عربی وانگریزی زبانوں پہ ان کی قدرت اور علمی گہرائی کا اندازہ تبصرہ کے بغیر آپ ان کے مضامین سے لگا سکتے ہیں۔

ٹکنالوجی کے اس مقابلاتی دور میں ہر فرد کی زندگی مشین کی طرح ہوگئی۔ عام میدانوں میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے اس میں شرکت اور اس سے استفادہ ناگزیر ہے تو پھر علماء اس سے بے بہرہ کیوں ہیں۔ اور خاص کر دین کے داعی! میری یادداشت کے مطابق اس جامعہ میں کمپیوٹر کے متعدد سیٹ موجود تھے۔ مگر چارج سنبھالنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ سب خراب ہو کر کوڑے دانوں کی نذر ہو گئے۔ ہمیں سخت فکر دامن گیر ہوئی کہ ہم اپنے طلبہ کے لیے کمپیوٹر تعلیم (lab) کا انتظام کہاں سے کریں؟ اس کے لیے اساتذہ کی ٹیم کے ساتھ جامعہ کے سفیر سمیت ہم نے دہلی کے مخلصین اہل خیر کے دروازوں پر دستک دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم جہاں بھی گئے بامراد واپس آئے۔ اور اس وقت کم ہی سیٹ سہی مگر کمپیوٹر لیب قائم ہو گیا ہے۔

تحقیق وریسرچ کا کام سب سے زیادہ لائبریری پر منحصر ہے۔ اور جامعہ ہذا کا نصاب ہی ''تخصص فی الأدب والدعوۃ'' ہے۔ لہٰذا ہمیں ایک اچھی لائبریری کی سخت ضرورت ہے جس میں کم از کم اسلامی تراث کی مرجعی کتابیں موجود ہوں۔ تاہم ایک مستقل لائبریری'' مکتبہ نظامیہ'' موجود ہے اور حتی المقدور کتابیں دستیاب ہیں۔ ان شاء اللہ ہم کوشش کریں گے کہ جلد ہماری لائبریری خاطر خواہ کتابوں سے بھر جائیں۔

اس جامعہ کا قیام صرف شعبہ تخصص کے لیے عمل میں آیا تھا۔ مگر بعد میں باشندگان دہلی کے پیہم اصرار پر علامہ موصوف نے یہاں شعبۂ حفظ وقرأت کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ جس میں مقامی طلبہ کے علاوہ کچھ بیرونی طلبہ بھی ہیں۔

شاگرد کو اپنے استاذ کی بجا طور پر خدمت کرنی چاہیے۔ مگر ان کا استحصال ہونے اور ان کی پڑھائی میں رکاوٹ بننی والی خدمت کے ہم خلاف ہیں۔ لہٰذا بچوں کو ہدایت ہے کہ وہ اساتذہ یا تخصص کے علماء طلبہ کی خدمت گزاری میں زیادہ مشغول نہ ہوں۔

اس شعبہ کو مزید بہتر بنانے کے لیے اس میں بھی ہر ماہ تقریری ٹسٹ لازم کیا۔ ساتھ ہی اردو پڑھنے، لکھنے اور ادبی گفتگو کرنے کی غرض سے انہیں اردو سکھانا شروع کیا گیا۔

یہ تھی جامعہ ہذا کے آئینۂ تعلیم وتربیت کی ایک جھلک۔ مستقبل کے اور بھی عزائم ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو ان شاء اللہ انہیں بھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔

☆☆☆

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

قائد اہل سنت کے خوابوں کا شہر

مولانا مقبول احمد سالک مصباحی ☆

سازگار حالات میں قوموں کی رہنمائی اور پرسکون موجوں کے سہارے ساحل تک رسائی یکساں حیثیت کے حامل دو خوبصورت جملے ہیں۔اور یہ دونوں کام انجام دینے کے لیے کسی غیر معمولی قابلیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔لیکن حالات جب بپھرے ہوئے ہوں اور سمندر انگڑائیاں لے رہا ہو تو پھر وہاں ہوتا ہے صلاحیتوں کا امتحان اور جوہر قابل کی پرکھ۔اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ عبقری وہ ہے جو ماضی کے نقوش کو سنگ میل بنا کر اپنا راستہ طے کرتا ہے اور نابغہ وہ ہے جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔صحرا کی وسعت،کوہساروں کی فلک پیمائی اور سمندروں کے تھپیڑے اس کے لیے سد راہ نہیں بنتے۔وہ جس طرف رخ کرتا ہے اسی طرف اس کے لیے راستے بن جاتے ہیں۔وہ حالات کی طنابوں میں کسا ہوا نہیں ہوتا ہے۔حالات کی طنابیں اس کی انگلیوں میں گردش کرتی ہیں۔وہ ہواؤں کے رخ پر نہیں چلا کرتا، ہوائیں اس کے مزاج کی تابع ہوتی ہیں۔قائد وہ نہیں جو قوموں کو ان کے فکری لامرکزیت کے حوالے کر کے ایک نامعلوم مستقبل کی طرف دھکیل دے۔قائد وہ ہے جو نوشتہ دیوار پڑھ کر قوموں کی تقدیر کے سرنامے لکھا کرتا ہے۔

قائد اہل سنت رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ ایسی ہی ناقابل تسخیر اور افسانوی قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔اور ان کی زندگی کا ہر ورق میرے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔میرے فاضل دوست علامہ مفتی عبدالحکیم نوری نے گذشتہ ایک ماہ قبل جب ممبئی کو عارضی طور پر خیرآباد کہتے ہوئے کو لھوئی بازار ضلع مہراج گنج اور سدھارنگر شہر میں ایک ساتھ نوری شفاخانہ کے نام سے دو صحت مراکز قائم کیے اور حالیہ سفر میں، میں نے اس کی تفصیلات بچشم سر ملاحظہ کیں تو ان کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے (زوردار قہقہہ کے ساتھ) کہا تھا کہ پورے ملک میں ہم اور آپ دو ایسی شخصیتیں ہیں کہ کہیں بھی اور کبھی بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں۔انہوں نے تھوڑے توقف سے جملے کی معنویت اور دونوں شخصیتوں پر اس کے انطباق کو دیکھتے ہوئے جوابی قہقہہ لگایا تھا۔اور میرے نظریہ کو" صاد" کیا تھا لیکن میں اب اسی جملے کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ حضرت قائد اہل سنت کی شخصیت پر فٹ کر کے دیکھتا ہوں تو" ردیف وقافیہ" بالکل چست معلوم ہوتے ہیں۔

یقیناً حضرت علامہ شخصیت میں یہ کرشماتی خصوصیت تھی کہ وہ مرد قلندر کی طرح جہاں بوریا نشیں ہو گئے وہیں منزل بن گئی، جس شہر کا رخ کیا اس کی آب و ہوا تبدیل کر دی۔قارئین نے ان کی زندگی کے بہت سے تابندہ گوشوں کو ماہنامہ جام نور کے رئیس القلم نمبر میں مرتبہ نبیرۂ قائد اہل سنت علامہ خوشتر نورانی میں ملاحظہ کر لیا ہوگا۔سر دست یہ میرے موضوع میں شامل نہیں۔مجھے بار بار تقاضا ہو رہا ہے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں کچھ سپرد قلم کرنے کا، جہاں خود بھی کبھی استاذ عربی ادب اور پھر پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکا ہوں۔تقریباً چار سالوں تک میں نے اس ادارے کی بےلوث خدمت کی ہے۔اس دوران حضرت قائد اہل سنت کی مجاہدانہ زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔میں یہ نہیں کہتا کہ اس عرصہ میں علامہ کی سیمابی زندگی کے ناقابل انکار اثرات میرے لاشعور اور تحت شعور پر نہیں پڑے۔ایک وقت میں نے حضرت علامہ کی شخصیت پر لکھنے کا خاکہ تیار کیا تھا جو میری یادداشتوں پر مشتمل تھا۔ایک اندازے کے مطابق وہ پانچ سو صفحات میں مکمل ہو رہا تھا۔مگر وہ مسودہ وقت کی ستم ظریفی کی نظر ہو گیا۔اب امید بھی کم کہ وہ دوبارہ ہاتھ لگے اگر اس وقت اس کی تکمیل ہو جاتی تو ان کی زندگی کے کئی ایسے تابناک گوشے سامنے آ جاتے جو اب تک پردۂ خفا میں ہیں۔

حضرت علامہ کی سیرت وکردار پر گفتگو اس لیے غیر ارادی طور پر طویل ہوگئی کیونکہ ان کے ذکر کے بغیر جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا تذکرہ اور تبصرہ بھی ادھورا محسوس ہوتا۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء ایک ایسے قائد کے ولولوں، حوصلوں اور غیر مفتوح جذبوں کا آئینہ ہے جس نے سب کچھ قوم کے لیے کردیا۔ ہاں وہ قائد اہل سنت جس نے کبھی اپنی زندگی میں پیچھے مڑکر دیکھنا سیکھا ہی نہیں۔ ''شکست کا لفظ ان کی قاموس حیات میں ناپید تھا'' جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا وجود میرے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے جوایسے پرآشوب اور ناقابل یقین حالات میں معرض وجود میں آیا جب جماعت کا کوئی بڑا سے بڑا سورما شہر پناہ دہلی کی فصیل کو عبور کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

قافلے بہت آئے مگر سب نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے گذر گئے، مسند اقتدار بہت سی نامی گرامی شخصیتیں رسوخ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں اور آج بھی ہماری جماعت کے بعض افسانوی شہرت کے حامل لیڈران پارلی منٹ کے ایوان میں متمکن ہیں مگر شہر دہلی میں ان کے وجود کا کوئی نقش نظر نہیں آتا۔ اور اس طرح وہ اپنے تمام کروفر، جاہ وحشمت، لاؤلشکر اور طمطراق کے باوجود حرف غلط کی طرح مٹادیے جائیں گے حضرت علامہ اگر چاہتے تو وہ بھی مسند اقتدار تک رسائی حاصل کرسکتے تھے اور وہ بھی اس رسواکن طریقے سے نہیں جس کو لوگ آج اپنا کر قوم کو اپنی قابلیت کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ آنجہانی مسز اندرا گاندھی سے حضرت علامہ کی قربت ایک زمانے میں اس منزل تک پہنچ چکی تھی جہاں تک رسائی کا کوئی سیاسی دیوانہ مشکل سے ہی تصور کرسکتا ہے مگر یہ قربت حضرت علامہ کے راہ ومنزل کو تبدیل نہیں کرسکی۔ اور حضرت علامہ خاموشی کے ساتھ اپنے تعلیمی اور دعوتی مشن کی تکمیل کرتے رہے ان کے سیاسی ذرائع ان کے مذہبی مقاصد کا آلۂ کار بنتے رہے۔ بالآخر خاک وخون اور ابتلا وآزمائش کی ہزار زہرہ گداز منزل کو عبور کرکے جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کو کاغذ سے زمین پر منقش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ حضرت علامہ کی زندگی میں ہی یہ ادارہ عروج وارتقا کی ناقابل تسخیر بلندیوں تک پہنچ چکا تھا۔ بالخصوص جامعہ ازہر سے الحاق ان کا دیرینہ خواب تھا جو پورا ہوا۔ اس سلسلے میں ابتداء مولانا محمد حسین ندوی سابق پرنسپل جامعہ ہذا اور شیخ ابوبکر مسلیار کیرالا اور دوسرے مرحلے میں راقم السطور اور مولانا دین محمد مرحوم سابق استاد انگریزی جامعہ ہٰذا کی خدمات کو بہرحال قابل ذکر ماننا چاہیے۔

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء نے دہلی شہر کی فضا کو سنوارنے اور اس کی سخت مٹی کو نم کرنے میں بخوبی کامیابی حاصل کی ہے۔ دہلی کی مرکزی یونیورسٹیوں سے لے کر جامعہ ازہر مصر تک اس کے فاضلین کے ذہنی ارتقا اور ان کی عالمی سطح پر تحقیقاتی صلاحیتوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ خود راقم السطور کے لیے یہ تصور باعث فخر ہے کہ اس کے تلامذہ کی ایک معقول تعداد مختلف ممالک میں کلیدی اہمیت کے حامل قلمی ودعوتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جن کے علمی وادبی سرگرمیوں سے قارئین ماہ نامہ جام نور دہلی کے صفحات کے حوالے سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ جامعہ کی پیداوار کی پہلی کھیپ کا ایک ہونہار فرزند مولانا سجاد عالم مصباحی جامعہ کے تعلیمی نظم ونسق کو بخوبی سنبھال رہے ہیں اور دوسرے مرحلے میں فاضلین جامعہ کی دوسری نسل کے جواں سال عالم مولانا نعمان احمد اعظمی ازہری اس کی زلف برہم کو سنوارنے میں شب و روز مصروف ہیں اور یہ جامعہ کے لیے فال نیک ہے کہ مصر کے بعد بغداد کے علمی جاہ وجلال بھی جامعہ میں اپنی آب وتاب بکھیر رہا ہے اور مولانا انوار احمد علیمی فاضل جامعۃ صدام للعلوم الاسلامیۃ مسند تدریس کو زینت بخش رہے ہیں۔ یہ ساری خصوصیات جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کو حاصل ہیں۔ مولانا محمد ذکی اللہ نظامی استاد عربی ادب جامعہ ہٰذا اور مولانا محمد قاسم مصباحی استاد شعبہ کمپیوٹر کا اصرار ہے کہ میں جامعہ کے سالانہ مجلّہ کاروان رئیس القلم کے لیے کچھ نہ کچھ تحریر کروں۔ آج شام ہی کو پچھم ایکسپریس سے میرا ممبئی جانا طے ہے، انتہائی عجلت میں عادت کے مطابق جامعہ کی آفس میں بیٹھ کر تقریباً نصف گھنٹے میں یہ تحریر اس اپیل کے ساتھ مکمل کررہا ہوں کہ ارباب بست وکشاد اور جماعت کے درد مند افراد جامعہ کو دل کھول کر تعاون کریں اور حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی اٹھائی ہوئی تحریر کو ایک تناور درخت بنانے میں اپنا ملی کردار ادا کریں۔

نظمائے مدارس کو عموماً یہ شکوہ کرتے دیکھا جاتا ہے کہ ہماری

جماعت کی کوئی حکومت مالی سرپرستی نہیں کرتی جس طرح شیعی اور وہابی حکومتیں ہندوستان کے شیعوں اور وہابیوں کی کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں پیارے جسے آپ عیب کہہ رہے ہیں میری نظر میں یہی اپنا ہنر ہے۔ اگر ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تو آپ نہیں آپ کے باپ بہت پہلے کسی سنگ آستانہ کی جبیں سائی کرکے کسی بت کافر کے اسیر بن گئے ہوتے۔ آپ اس پر افسوس نہ کرے بلکہ شادی منائیں ہاں ہمارے سنی سرمایہ دار ہیں وہ اگر اپنے مراکز عقیدت کے عشرت کدوں کو سجانے کے بجائے صرف کارکردگی اور ضرورت کی بنیاد پر دولت صرف کریں تو یہ خلا ضرور پورا ہو سکتا ہے اور آج ہی ہو سکتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ہمارے سنی سرمایہ داروں کو اپنی دولتیں صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی توفیق رفیق مرحمت فرمائے۔

☆ قلم جادو رقم، ادیب العربیہ، امیر القلم حضرت مولانا مقبول احمد سالک مصباحی، بانی و مہتمم، جامعہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، نئی دہلی، جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کیرلی ادب کے سابق استاد اور پرنسپل ہیں۔ ☆☆☆

دھلی میں

اہل سنت کے عروج وزوال کا سرسری جائزہ

مولانا خوشتر نورانی ایڈیٹر جام نور
وناظم تعلیمات جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

قرون وسطیٰ میں دہلی (شاہ جہاں آباد) کی حیثیت ایک ایسے بین الاقوامی شہر کی تھی جہاں پورے ملک کی علمی، ادبی، تمدنی، ثقافتی، مذہبی اور متصوفانہ زندگی کا دل دھڑکتا تھا۔ شیفتہ نے کبھی دہلی کی اسی اعلیٰ اقدار کی حامل تاریخ کے پس منظر میں بے ساختہ کہا تھا کہ۔

عجب ہی شہر ہے دلی بھی شیفتہ ہر گز
میں روم وشام نہ لوں اس دیار کے بدلے

اس خلد بریں کی جغرافیائی نقشے میں آج بھی جہاں ایک طرف شاہی قلعوں کی برجیاں ارض ہند پر سلاطین وقت کی حکمرانی کے فسانے بیان کرتی ہیں تو شاہی مساجد کے بلند وبالا منارے ان کے سجود نیاز کے گواہ ہیں۔ اس کی شاہراہوں پر پائے جانے والے ٹوٹے کھنڈرات، مہرولی کے بوسیدہ آثار، بالا کوٹ اور کوٹلہ کے ویران مناظر اس کے سیاسی عروج وزوال کے علامات ہیں تو رات کے اندھیروں میں غالب وذوق کے مقبروں کی بجھتی ہوئی شمعیں ان سرمئی شاموں کی رازدار ہیں جب شاہی محلات کے بام ودر اور امرا کے آشیانوں میں شعر وسخن کی مجلسیں سجا کرتی تھیں۔ وہیں دوسری طرف گیارہویں صدی کے بعد قائم ہونے والی بائیس خواجگان کی چوکھٹ قرون وسطیٰ سے لے کر اٹھارہویں صدی تک دہلی کی خوش عقیدہ فضا کے روشن استعارے ہیں تو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے آبائی قبرستان کے پہلو میں جامعہ رحیمیہ کے کچھ باقی ماندہ آثار جہاں سے اہل سنت کے معتقدات کے تحفظ کے لیے قلمی اور تحریری تحریکیں چلائی جاتی رہیں۔

دہلی کی سیاسی وتمدنی تاریخ کے زریں اوراق کا جب ہم مطالعہ کریں گے تو ان تاریخی عبارتوں کے بین السطور سے ہمیں یہاں کی مذہبی تاریخ اور اس کی سرگرمیوں کا بھی پتا چلے گا۔ یوں تو دہلی کی سیاسی و تمدنی تاریخ کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے مگر اس کی قدامت کی شہادت اس وقت سے ملتی ہے جب اس کے کچھ آثار کی کھدائی کی گئی اور ان کی بنیادوں سے ہزار سال قبل مسیح کے تمدن سے تعلق رکھنے والی باقیات ہاتھ لگیں، مگر پھر گیارہویں صدی کے آغاز تک اس کی تاریخوں کے نشانات نہیں ملتے۔

انگ پال نے دہلی کو ۱۰۵۳ء میں بسایا، ایبک نے ۱۱۹۲ء میں اس کو فتح کیا لیکن اپنا مرکز لاہور ہی رکھا، مگر قرون وسطیٰ کی دہلی در حقیقت التمش کی رہین منت ہے، جس نے لاہور کو چھوڑ کر دہلی کو دار السلطنت بنانے کا عزم کیا اور یہاں ان علمی، ادبی، سماجی اور مذہبی اداروں کی بنیاد رکھی جنھوں نے دہلی کو صحیح معنوں میں متحدہ ہندوستان کا دل بنا دیا۔ ان علمی، مذہبی اور ثقافتی اداروں کی وجہ سے وسط ایشیا اور ایران کے بعض اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل علما، صوفیہ اور دانش وران دہلی اور اس کے اطراف وجوانب میں بس گئے، ابھی زیادہ عرصہ گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ دہلی نے بغداد، بخارا اور سمرقند کی جگہ لے لی اور اسلامی عقائد وعلامات کے ان مرکزوں کی انتہا دہلی کی ابتدا بن گئی۔ اور جب سقوط بغداد کے بعد اکناف عالم سے مخلوق خدا کے قافلے جوق در جوق دہلی کی طرف آنے لگے تو یہ شہر علم وفن، تہذیب وتمدن اور مذہب و تصوف کا ایک ایسا بین الاقوامی مرکز بن گیا جسے احتراماً ''حضرت دہلی'' کے لقب سے پکارا جانے لگا، خسرو نے اسے ''جنت عدن'' کہا تو عصامی نے اس کی خاک کو ''کبریت احمر'' سے تشبیہ دی۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے یہاں پندرہ محلے آباد کیے تھے جن میں سمرقند، کاشغر، غور اور خطا کے علما، فضلا اور صوفیہ کو الگ الگ بسایا گیا اور ان محلوں کے ناموں کو ان کے وطنی نسبت سے رکھا گیا۔ وقت گزرتا رہا علما وصوفیہ اسلامی افکار وعقائد کی تبلیغ کرتے رہے، اسلامی علوم وفنون پر مشتمل عربی و فارسی میں کتابیں تصانیف کی جاتی رہیں، نہ دن کے اجالوں میں کلمہ ونماز

کے نام پر اپنے گمراہ کن نظریات کی ترویج کرنے والی نام نہاد مسلم جماعتیں تھیں اور نہ اسلام کی نئی تفسیر پیش کرنے والے گروہ، نہ نبوت پر شب خون مارنے والے مجنون اور نہ تصوف کو سفسطہ اور افیون سے تعبیر کرنے والے جہلا۔ چنانچہ خانقاہیں سلوک ومعرفت اور روحانیت کا گہواہ بنی ہوئی تھیں اور علما کی محفلیں شریعت کے ایوان، جہاں ہر خاص وعام اور شاہ وگدا تہی دامنی کا گلہ کرتے ہوئے اپنی ناکام آرزؤں کے ساتھ ان کی چوکھٹ پر آتے اور اپنے خالی دامنوں کو بھر کر شاداں وفرحاں لوٹ جاتے۔ دہلی کے علم وفن اور عظمت وجلال کی حیثیت ترقی کے مدارج طے کرتی رہی، یہاں تک کہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں اس کی شہرت نصف النہار کو پہنچ گئی، اور محمد بن تغلق کے عہد میں اس کا علمی ماحول اپنے نقطۂ عروج پر جا پہنچا۔ اس وقت دہلی میں تقریباً دو ہزار خانقاہیں تھیں جو یہاں کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا اہم حصہ بنی ہوئی تھیں، صوفیہ کے یہ مراکز مختلف نوعیت کے تھے، خانقاہیں، جماعت خانے، زاویے اور دائرے، ان مراکز پر بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک حاضر باش ہوتا اور روحانی وعرفانی سعادت حاصل کرتا۔ ایک طرف اگر بندگان خدا کے قلوب واذہان کے تزکیہ، روحانی بالیدگی اور نفس کی تصفیہ کے لیے اپنے وقت کے یہ نفوس قدسیہ سرگرم تھے تو دوسری طرف اسلامی عقائد وافکار کی ترویج کرنے والے علما کی مقدس جماعت تھی جن کی سرگرمیوں کے نتیجے میں چودہویں صدی میں تقریباً ایک ہزار مدارس دہلی کے مختلف حصوں میں اپنی تابانیاں بکھیر رہے تھے۔ اس عہد کا سب سے عظیم الشان ادارہ مدرسہ فیروزی تھا جسے فیروز شاہ نے ۱۳۵۲ء میں قائم کیا، اور جس کی صدارت وقیادت اپنے عہد کے متبحر عالم دین حضرت مولانا جلال الدین رومی نے فرمائی جن کی علمی سطوت کا چرچا دور دور تک تھا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ قرون وسطی میں دہلی کے اندر ایسے زبردست عربی کے شعرا موجود تھے جن کے سامنے امرؤ القیس جیسا بلند پایا شاعر بھی بونا نظر آئے، اور جس پائے کے علما وفضلا دہلی میں سمٹ آئے تھے، بخارا، سمرقند اور بغداد ومصر میں بھی نہیں تھے، ان علما اور صوفیہ کی موجودگی نے دہلی کو رشک بغداد اور غیرت مصر بنا دیا تھا اور ان کی سرگرمیوں کے چرچے چہار دانگ عالم میں گونج رہے تھے۔ اس عہد کی منظر کشی کرتے ہوئے کبھی جوش وجنوں میں حضرت امیر خسرو نے فرمایا تھا کہ ''اس زمانے میں ہر پتھر کے نیچے ایک ہیرا تھا''۔

پندرہویں صدی میں دہلی پر تیمور کا حملہ ہوا اور اس کے بعد دہلی کی علمی وثقافتی مرکزیت ختم ہوکر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں منتشر ہوگئی، مگر علمائے اہل سنت کی سرگرمیاں جاری رہیں، معاشرتی سطح پر پارینہ اسلامی رسوم وروایات برقرار رہیں اور مذہبی سطح پر اسلامی اعتقادات بھی محفوظ رہے۔ سولہویں صدی میں سلطنت مغلیہ کے قیام کے بعد دہلی کا ارتقا تو شروع ہوگیا مگر اس کی علمی اور مذہبی مرکزیت واپس نہ آسکی۔ عہد مغلیہ کی دہلی دراصل شاہ جہاں کی دہلی ہے جس نے قرون وسطی کے زریں عہد کو واپس لانے کی ہر ممکن کوششیں کیں جو کسی قدر کامیاب بھی رہیں جن کے تابندہ نقوش آج بھی دہلی کی مرکزیت اور حسن ورعنائی کا پتا دیتے ہیں۔ اس زریں عہد کی تصویر کبھی میر نے یہ کہہ کر کھینچا تھا کہ۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اور مومن نے اس شہر کے لیے اپنے جذبات کی ترجمانی یوں کی تھی کہ۔

ہو صورت خاک دل لگنے کی جنت میں بھلا مومن
مری نظروں میں ہے شاہ جہاں آباد کا نقشہ

قرون وسطی کے سلاطین کے عہد میں دہلی صرف چشتیہ سلسلے کی مرکز تھی، مگر عہد مغلیہ میں تقریباً تمام روحانی سلاسل یہاں موجود تھے، عقیدت مندان اولیا کا یہاں ہجوم لگا رہتا تھا، اسی زمانے میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہ نے سلسلۂ نقشبندیہ کی دہلی میں بنیاد رکھی جس کو ان کے مشہور زمانہ مریدین وخلفا حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مقبول عام بنا دیا۔ ایک طرف حضرت خواجہ باقی باللہ کی تبلیغی وروحانی سرگرمیوں کے نتیجے میں آپ کا حلقۂ اثر مغل امرا اور منصب داروں تک پھیلا ہوا تھا تو دوسری طرف حضرت مجدد وشیخ عہد اکبری وجہانگیری میں اپنی خداداد صلاحیتوں اور سرگرمیوں سے نہ صرف عام افراد کی رہنمائی کر رہے تھے بلکہ سلاطین وامرا کی گمرہی پر بندش بھی لگا رہے تھے، نیز اسلامی عقائد کو مستحکم کرنے اور مروجہ فتنوں کے سدباب کے لیے تصانیف اور مکتوبات تحریر فرما رہے تھے۔ اسلامی عقائد کے استحکام کے لیے ان دونوں حضرات نے ارتداد

والحاد کے خلاف جس طرح تحریکیں چلا کر ملت اسلامیہ کی متاع ایمانی کی حفاظت کی ہے وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، جس کے نتیجے میں حضرت مجدد کو عہد جہانگیری میں پابند سلاسل بھی ہونا پڑا مگر قید و بند میں بھی آپ اعتقادی انحرافات کا مقابلہ کرتے رہے اور ہزاروں افراد کو ایمان کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

دہلی میں علمائے اہل سنت کا ورود ہوتا رہا اور اہل سنت کی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں اپنے وقت کی کثیر الجہات شخصیت حضرت شیخ ولی اللہ محدث دہلوی کی ۱۷۰۳ء میں ولادت ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ آپ کے ذریعے اہل سنت کی علمی و مذہبی سرگرمیاں منتہائے کمال کو پہنچ گئیں۔ آپ کے خانوادے میں ایسی ایسی نادر روزگار شخصیتوں کا ظہور ہوا جنہوں نے دہلی میں مسلک اہل سنت کو ایک نئی جہت عطا کر دی۔ برصغیر کے اعتقادی اور نستعلیقی روایات سے انحراف کرتے ہوئے پہلی بار دہلی میں ہی اسی خاندان ولی اللہی کے ایک مطعون شخص اسمٰعیل دہلوی نے ۱۸۲۵ء میں عبد الوہاب نجدی کی گمراہ کن نظریات پر مبنی کتاب ''التوحید'' اور ''رد الاشراک'' سے متاثر ہو کر اپنی رسوائے زمانہ کتاب تقویۃ الایمان لکھی اور اسلام کے تیرہ سو سالہ معتقدات اور روایات پر سوالیہ نشان کھڑا کرنے کی مذموم کوشش کی، جس کے نتیجے میں آج برصغیر کے کروڑوں افراد اہل سنت کے پارینہ عقائد سے منحرف ہو کر عقل بد اندیش کی رہنمائی میں جنم لینے والی مختلف جماعتوں میں بٹ گئے۔ جس وقت یہ کتاب منظر عام پر آئی، برصغیر کے سرخیل علمائے اہل سنت نے نہایت شد و مد کے ساتھ اس کتاب کا مختلف جہتوں سے دندان شکن رد فرمایا، جن کی تعداد مورخین نے تقریباً ڈھائی سو تک بتائی ہے، ان تردیدی کتب کی ایک بڑی تعداد علمائے دہلی بشمول خاندان ولی اللہی کے قلم معجز رقم کی شاہکار ہے۔

آخر کار ۱۸۵۷ء میں غدر کا وہ دن بھی آیا جب قرون وسطیٰ کی اس دہلی کا ''خورشید جہاں تاب'' نہ صرف سیاسی، ادبی، ثقافتی اور تمدنی بلکہ علمی اور مذہبی سطح پر بھی غروب ہو گیا اور روم کے شاندار ماضی کی طرح حضرت دہلی بھی ''دہلی مرحوم'' ہو گئی۔ روم کی طرح اس کی عبرت ناک اور دل آویز تاریخ کے پس منظر میں علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

سواد رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شان دل آویزی

انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک ہندوستان کے مختلف حصوں سے اپنے عہد کے جلیل القدر علما و فضلا، اہل سنت کے خلاف ابھرنے والے فتنوں کی سرکوبی کرتے رہے مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ دہلی کی سرزمین اپنے محافظین شریعت و طریقت سے خالی ہوتی رہی، ادھر نجدی افکار کی کوکھ سے جنم لینے والے مختلف گروہ نے سواد اعظم مسلک اہل سنت کے عقائد و نظریات سے ہٹ کر مختلف ناموں سے دہلی اور اس کے اطراف پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، دہلی سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر سہارن پور اور دیو بند میں اپنے تبلیغی، تعلیمی اور فکری مراکز کی بنیاد رکھی اور قلب دہلی میں اہل سنت کے مرکز عقیدت حضرت محبوب الٰہی کے آستانے کے پہلو میں بنگلہ والی مسجد سے ''تبلیغی جماعت'' کی تشکیل دی گئی تاکہ نماز اور کلمہ کی آڑ میں گھوم گھوم کر دہلی اور برصغیر کے مسلمانوں کے پارینہ عقائد کی بنیادوں کو کمزور کر دیا جائے۔ نہایت منظم طریقوں سے ان کے کئی گروپ مختلف محاذوں پر کام کر رہے تھے، ان کی ایک جماعت اگر تصانیف کے ذریعہ خواندہ طبقے کے سامنے اسلام کے پارینہ عقائد و روایات کو مشکوک بنا رہی تھی تو دوسری طرف نام نہاد ''اللہ والی جماعت'' حشرات الارض کی طرح زمین پر پھیل کر عام افراد کے اذہان کو پراگندہ کر رہی تھی، اور پھر ندوہ کے قیام کے بعد ان حضرات نے اسلامی عقائد و تعلیمات کو مغرب زدہ لبرل مسلمانوں کے فکری دھارے کے رخ پر پیش کر کے اہل سنت کی بساط کے سارے مہروں کو پیٹ کر رکھ دیا۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اُدھر ہندوستان انگریزی سامراج کے آہنی پنجوں سے آزادی حاصل کر رہا تھا اور اِدھر دہلی ان کے خود ساختہ عقائد و افکار کی غلام بن چکی تھی۔ جن خانقاہوں کے بام و در شب کے اندھیروں میں بھی منور رہا کرتے تھے اور جہاں سے سلوک و معرفت کی دشوار کن راہیں طے کرائی جاتی تھیں آج وہ مجلس شعر میں مفلس کے چراغ کی طرح شام ہی سے بجھے بجھے سے دکھائی دیتے ہیں، جو روحانی مراکز ان کی زد سے بچ گئے اور آج بھی مراجع خلائق بنے ہوئے ہیں وہاں ان

کی اولادیں شکم پروری کے لیے اپنے آباواجداد کی چوکھٹوں سے وابستہ تو ہیں مگران کے افکاروخیالات اور کردارواعمال میں سنیت کی موہوم سی جھلک دکھائی دیتی ہے جو غالبًا ان آستانوں سے ان کی معیشت کا شاخسانہ ہے۔شریعت کے فلک پیماایوان ویران ہوگئے اور جو بچ گئے وہ چند بوسیدہ کمروں میں سمٹ کرنجدیت کی سرائے یا تبلیغی جماعت کی شب گزاری کے اڈے بن گئے،مساجد سے اہل سنت کے ائمہ کیا رخصت ہوئے،عشق رسالت اور آداب انبیا واولیا کے جنازے اٹھ گئے،دہلی اوراس کے اطراف میں قائم ہونے والی بین الاقوامی درسگاہیں تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کے مراکز بن گئے اور گھروں میں قرآن کی تلاوت کے ساتھ ساتھ پردہ نشین عورتیں ''بہشتی زیور'' کی تلاوت کی خوگر ہوگئیں۔ وقت اپنے پروں کے سہارے اڑتا رہا، اہل سنت کا کاروان اسلاف بھی رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا رہا اور ہمارے باقی ماندہ علما صرف اپنے مدارس ومساجد کی توسیع اور جلسہ وجلوس کے ذریعہ اپنے اقتصادی استحکام کے لیے ممبئی کے ''بھنگار خانوں'' اور کلکتہ کے ''بوچڑ خانوں'' میں بیٹھے سرمایہ داروں کی دہلیز پر گداگری کرتے رہے،مگرشریعت وطریقت کی راجدھانی ان کے لیے شجرممنوعہ بنی رہی۔

آخرکار اہل سنت کے لیے اپنے سینے میں سیماب صفت دل رکھنے والے وارفتہ جگر مجاہد قائد اہل سنت رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں علم و فن، سیاست وقیادت اور شریعت وروحانیت کی دارالسلطنت دہلی کی طرف متوجہ ہوئے اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیا جیسے عظیم الشان اوراپنی نوعیت کے منفرد ادارہ کے لیے ایک آفاقی منصوبہ تیار کیا جو فارغین علما کو بین الاقوامی زبانوں میں تعلیم اور عصری تقاضوں کے پیش نظر دعوتی تربیت دے سکے-ابھی حضرت علامہ مرحوم حکومت کانگریس سے اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے دہلی کے کسی پرفضا مقام پر زمین کے حصول کی خاطر جدوجہد کرہی رہے تھے کہ قیافہ شناسوں نے یہ سمجھ لیا کہ دہلی میں اہل سنت کی سرگرمیوں کی بہاریں لوٹنے والی ہیں۔ دہلی میں حضرت علامہ نے اہل سنت کی سرگرمیوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جن صبرآزما مشکلات ومصائب کو گلے سے لگایا اور بے یارومددگار ایک بنجر زمین کولالہ زار بنانے کی جس طرح اس اجنبی شہر میں آبلہ پائی کی وہ تاریخ کا ایک حصہ بن گیا ہے، بڑے سے بڑے شقی القلب پر بھی یہ'' داستان شوق رہ نوردی'' رقت طاری کردیتی ہے۔صفحات کی تنگی دامن گیر ہے ورنہ دہلی کی زلف برہم سنوارنے کی اگر پوری تاریخ لکھ دی جائے تو آنکھیں اشک آلود ہوبھی جائیں تومقام حیرت کیا ہے؟

جس زمانے میں آپ کی قیادت وعلمیت کی شہرت ہندوستان سے نکل کر پاکستان، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے مختلف خطوں میں گونج رہی تھی،آپ بستی حضرت نظام الدین میں ایک چھوٹی سی مسجد کے بوسیدہ کمرے میں ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کردہلی میں اپنی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے منصوبے تیار کررہے تھے، دہلی کی سڑکوں کی خاک چھان رہے تھے اور حضرت محبوب الٰہی کے آستانے پر اپنے مشن کی تکمیل کے لیے آہ وزاریاں کررہے تھے،لوگوں نے اپنی چشم حیرت سے یہ بھی دیکھا کہ اپنے وقت کا ایک عظیم مناظر، بے بدل قائد اور صاحب طرز مصنف بوسیدہ سی چٹائی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے روٹیاں بنارہا ہے اور صبح کی پکائی ہوئی روٹیاں رات کو کھارہا ہے۔زندگی کے اسی نشیب و فراز اور جہد مسلسل کے بیچ وزیراعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے ۸۰ء کے دہے میں بستی نظام الدین کے قریب لودھی روڈ پر زمین کا ایک وسیع ٹکڑا جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے لیے الاٹ کردیا،مگرقسمت ابھی اتنی مہرباں نہ تھی،آخر ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کا قتل ہوااور حضرت علامہ کی امیدوں کا شیرازہ بھی بکھر کر رہ گیا۔ اندرا کے قتل کے نتیجہ میں دہلی اوراس کے اطراف میں ہندو اور سکھ فساد بھڑک اٹھا جس سے جہاں ہزاروں بے گناہ جانیں تڑپتی ہوئی لاشوں میں تبدیل ہوگئیں وہیں حضرت علامہ کے سجائے ہوئے حسین خواب بھی حقیقت سے محروم ہوگئے۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کانگریس کی وزیر محسنہ قدوائی جو اسی وزارت سے تعلق رکھتی تھیں،حضرت علامہ کو کسی دوسری جگہ زمین الاٹ کرنے کے بہانے ان سے اصل زمین کے کاغذات واپس لے لیے اوراس کے بعد دوسری زمین کے الاٹ منٹ کا وعدہ کبھی پورا نہ کیا گیا۔ برسوں حضرت علامہ کی کوششیں سیاست کے گلیاروں کا طواف کرتے کرتے دم توڑ دیں، ویسے بھی سیاست میں اقتدار کی دہلیز تک

رسائی کے لیے کیے ہوئے وعدے کب پورے ہوتے ہیں؟۔

آنجہانی راجیو گاندھی نے جب وزارت عظمیٰ کی کرسی سنبھالی تو حضرت علامہ نے انہیں ان کی حکومت کا وعدہ یاد دلایا، مگران وعدوں کی تفتیش ہوتے ہوتے کئی برس گزر گئے، اور جب آرزوؤں کی تکمیل کا وقت آیا تو راجیو گاندھی زندگی سے رشتہ توڑ گئے اور ایک بار پھر حضرت علامہ کے منصوبے زمین پر اترنے سے محروم رہ گئے۔ آخر اپنی بکھری ہوئی ہمتوں کو جوڑ کر ایک بار پھر انھوں نے اپنے تئیں زمین کے حصول کے لیے ملک و بیرون ملک کے غیور سنیوں کو آواز دی، جس کے نتیجے میں ذاکر نگر اوکھلا میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے لیے زمین کا ایک بڑا حصہ خرید لیا گیا اور سنیت کے مرکز کی خشت اول رکھی گئی۔

ادھر جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے پلیٹ فارم سے حضرت علامہ نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور دوسری طرف اپنے صاحبزادے محترم غلام ربانی صاحب کو دہلی میں سنیوں کا ایک اشاعتی ادارہ بنام ''مکتبہ جام نور'' قائم کرنے کا حکم فرمایا، یہ وہ دور تھا جب اہل سنت کا کوئی بھی ادارہ دہلی میں نہیں تھا اور گمراہ کن نظریات پر مبنی کتابیں دہلی کی دکانوں اور مکانوں کی زینت بنی ہوئی تھیں، آپ نے اپنے صاحبزادے کو ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا حکم فرما تو دیا مگر آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ بدعقیدگی کی زد پر دینی شوکتوں کے لیے سنیت کا چراغ جلانا کتنا مشکل ہوتا ہے، مگر اسلام وسنیت کی سرفرازی کے لیے انہیں اپنی ہی نہیں اپنے خانوادے کے ہر فرد کی قربانی عزیز تھی۔ دہلی میں جب مکتبہ جام نور قائم ہوا اور دھیرے دھیرے جب اس کی کتابوں اور اشاعت کی خبر مسلکی تعصب میں گرفتار دہلی کے دیگر اشاعتی اداروں کو ہونے لگی تو ایک طوفان بدتمیزی سنیت کے اس اشاعت خانے کا طواف کر رہا تھا، سنیت کی کتابوں کی اشاعت پر ان اداروں نے اسے کفر وشرک کی ترویج کے مساوی گردانا، بعض نے دکان کی دہلیز پر چڑھ کر گالیوں سے نوازا تو چند ایک نے اجتماعی بائیکاٹ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان تمام مصائب سے گزرتے ہوئے جام نور نے جن چند کتابوں سے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا، اس کا گراف بڑھتے بڑھتے اہل سنت کی تقریباً تین سو کتابوں کی اشاعت تک پہنچ گیا اور ہزار بندشوں کے باوجود یہ لوگ اہل سنت کی اشاعت پر بند نہ باندھ سکے، اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ اہل سنت کا واحد ادارہ جو تنہا بدمذہبیت سے برسرپیکار تھا، تنہا نہیں رہا، اس کی اس مسلکی جنگ میں روح پھونکنے کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں سے اہل سنت کے اشاعتی ادارے دہلی میں قائم ہونے لگے، رضوی کتاب گھر، فاروقیہ بک ڈپو، مکتبہ نعیمیہ، کتب خانہ امجدیہ، رضا بک ڈپو، مکتبۃ المدینہ، اسلامک پبلیشر اور قادری کتاب گھر اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ آج سنی عقائد پر مشتمل اردو، ہندی اور انگریزی میں ہزاروں کتابیں ان اشاعتی اداروں سے طبع ہو کر نہ صرف دہلی بلکہ ملک و بیرون ملک کے ایک بڑے حصے میں پہنچ کر اسلام وسنیت کو جلا بخش رہی ہیں۔ دہلی کی مذہبی اردو مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہل سنت کی ایک اشاعتی بزم سجی ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کل تک جو لوگ ان کتابوں کی اشاعت کو کفر و شرک کی ترویج سمجھتے تھے اور اس کے مطالعے کو صنم کدے کی کنجی، آج وہ تمام ادارے انہی کتابوں کو خود شائع کر رہے ہیں، یہاں تک کہ جو کتابیں سنی اشاعتی اداروں کی ذاتی ملکیت ہیں انہیں بھی چوری چھپے یہ ادارے شائع کرنے سے باز نہیں آرہے ہیں:

انہی کو تھی ذکر مے سے نفرت، یہی تھے زاہد، یہی تھے حضرت
ذرا کوئی ان سے پوچھے، اب ان کے ہاتھوں میں جام کیوں ہے؟

عقائد کی بنیاد جب مفادات پر رکھی ہو تو انہیں زمیں بوس ہونے میں ایک لغزش ہی کافی ہے۔

۱۹۸۴ء میں حضرت علامہ کے ہی ایما پر قاری محمد میاں مظہری دہلوی نے سنیت کا ترجمان ماہنامہ ''قاری'' نکالنا شروع کیا اور سنی نظریات پر مشتمل مذہبی صحافت میں ایک اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۸۸ء سے مولانا یٰسین اختر مصباحی نے ماہنامہ ''حجاز'' جاری کیا اور ساتھ ہی ایک عظیم تصنیفی وتالیفی ادارہ دارالقلم کی بنیاد رکھی، ماہنامہ نے جہاں اہل سنت کے فروغ میں ایک موثر کردار نبھایا وہیں دار القلم کے قیام نے حضرت علامہ کی سرگرمیوں کو یقیناً رفاقت اور توانائی بخشی اور اب ۱۹۹۸ء سے مولانا موصوف کی ہی ادارت میں رضوی کتاب گھر کے زیر اہتمام ماہنامہ ''کنزالایمان'' نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

ادھر ۱۹۹۴ء میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے باقاعدہ قیام کے بعد حضرت علامہ کی قیادت میں اہل سنت کی علمی و تبلیغی سرگرمیاں اپنے عروج پر پہنچ گئیں اور جماعت کی علمی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ہمارے جو طلبہ صرف مدارس کی چہار دیواری کو ہی علمی دانش گاہوں کا منتہائے کمال سمجھتے تھے اور درس نظامیہ کو علم وفن کا نقطۂ عروج، انہیں جامعہ نے علم وفن، زبان وادب اور دعوت وفکر کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا، نتیجے کے طور پر انگریزی وعربی زبان کی تعلیم وتعلم کا ایک نیا مزاج پیدا ہوا، مدارس کے بوسیدہ ٹاٹ پر بیٹھنے والوں کو میز وکرسی پر تعلیم حاصل کرنے کا سلیقہ آیا، ایک کمرے میں چند الماریوں پر مشتمل بے ترتیب کتابوں کو علم وفن کا سرمایہ سمجھنے والوں کو یونیورسٹیوں میں لاکھوں کتابوں پر مشتمل ایک عظیم علمی ذخیرے کو دیکھ کر لائبریری کے وسیع مفہوم سے شناسائی ہوئی اور جن یونیورسٹیوں میں سنیت مزاج فرد کا وجود چراغ لے کر تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتا تھا، آج جامعہ کے قیام کے بعد دہلی کی کئی سینٹرل یونیورسٹیز میں ہمارے درجنوں طلبہ کی بہاریں نظر آتی ہیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ جو وسیع الخیال طلبہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بین الاقوامی جامعات میں جانے کی آرزو لیے مچل رہے تھے، ان کے لیے جماعت اہل سنت کی تاریخ میں پہلی بار عالم اسلام کی عظیم یونیورسٹی جامعۃ الازہر مصر کے راستے کھول کر جامعہ نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، آج زوال پذیری میں بھی اس کے وجود کی اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔

۱۹۹۵ء میں حضرت علامہ کی قیادت میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے زیر اہتمام دہلی کے رام لیلا میدان میں لاکھوں افراد پر مشتمل ایک عظیم الشان ''سنی کانفرنس'' کے انعقاد نے دہلی میں اہل سنت کی سرگرمیوں کا نقارہ بجا دیا، اس کانفرنس کے بعد ایوان سیاست سے دہلی کی عام شاہراہوں اور گلی کوچوں تک میں سنیت کی دھمک محسوس کی جانے لگی، اس کانفرنس کے دوران حضرت علامہ نے دہلی اور اس کے اطراف وجوانب میں مساجد کے دبے کچلے ائمہ اور چھوٹے بڑے علما کو متحد کر کے انہیں سنیت کی سرگرمیوں کے لیے مہمیز لگایا اور اہل خانقاہ سے اپنی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے درخواست کی، آج اسی کا نتیجہ ہے کہ دہلی اور اس کے اطراف میں رفتہ رفتہ چھوٹے بڑے مدارس ومساجد کا قیام عمل میں آنے لگا، اہل سنت کی توسیع کے لیے مجالس ومذاکرے اور فقہی سیمینار کی بزمیں آراستہ کی جانے لگیں اور جلسہ وجلوس کا انعقاد ہونے لگا اور اب حال یہ ہے کہ جن علما، فضلا اور صوفیہ کے بابرکت قدموں سے دہلی محروم تھی، غالب کے لفظوں میں وہ ''علمائے تازہ واردان بساط'' بھی ''ہوائے دل'' کے لطیف جھونکوں سے اس کی سرگرمیوں کو تازگی بخش رہے ہیں۔

☆☆☆

العلامة أرشد القادري (رحمه الله)

وجامعة حضرة نظام الدين أولياء بنيو دلهي

أنوار أحمد خان بغدادي ☆

في عام ١٩٤٧م تحررت الهند من براثن الاستعمار البريطاني بعد جهد جهيد وأحداث دامية،لعبها الإنكليز طوال مئة سنة ، قتل فيها أشراف البلد وخيارها ،وطمست آثارها المعنوية ،وسلبت القيم الخلقية ونهبت ثرواتها. تراها فلا تتذكر أنها الهند التي كانت طائرة ذهبية من قبل ، صاغها المسلمون الأماجد الذين حكموا البلاد بالعدل والإنصاف ،كما لا يخفى على من درس تاريخ الهند. وإذا كان لا بد لكل استعمار من مخلفات مأسوية، فقد كانت مخلفات الاستعمار البريطاني أفظع وأقذر مما تتصور، فلم تخرج الهند من سيطرة هذا الكابوس إلا بائسة منهوكة القوى في جميع المجالات ولجميع الطبقات إلا من تمسك بذيل السياسة الإنكليزية ، وأما المسلمون الذين كانوا هم أولوا الأمر فقد تداولت أيامهم وانقلبت أزمانهم بمكر الإنكليز ، ودار بهم الدوائر وأحاطت بهم المشاكل ، وذلك بزرع بذور الخلافات من قبل الإنكليز بين الشعب الهندي على مختلف المستويات،عرقيا كإثارة القضايا الحساسة بين الهندوس والمسلمين بالتشكيك والتزييف في ملفات التاريخ مثل قضية المسجد البابري ، وجغرافيا كمشملة كشمير ، وعقديا بإحداث فتنة التيارات الهدامة في الفكر الإسلامي.هذه وغيرها من المشاكل . قد أضرّت بحياة المسلمين أكثر من أضرت بهم، فكأن الاستعمار لم يهدف في ذاته إلا الاسلام الذي أصبح غريبا في بلد كان معقله.وبالجملة أدت هذه الخلافات إلى ضعف الاقتصاد الذي عرقل في سبيل النهوض والتقدم.

في غضون أحداث التحرير ومخلفات الاستعمار الماسوية تكدرت أجواء دلهي، عاصمة الهند القديمة والحديثة ، وتنغص صفوها وتغيرت خريطتها بالنسبة للمسلمين، حيث غار ماؤها وجفت نضارتها الإسلامية بالقتل والهجرة والحرمان، وأصبحت مساهمة المسلمين في "دلهي الجديده" ضئيلة لا تقدّر ولا تحاسب إلا ما اشتغل به أصحاب النحل الحديثة من المسلمين. وأما الأغلبية الساحقة منهم فلم يظفروا إلا بالحرمان ، وبالأخص أهل السنة والجماعة الذين كان بأيديهم القيادة قبل الانكليز. وظلت هذه المدينة على هذا الغرار أربعين سنة لا نجد فيها مساهمة فعالة من قبل أهل السنة والجماعة سوى ما يقدر مثقال فتات المائدة، حتى زحف إليها قائد أهل السنة والجماعة،الأديب الأريب، والمفكر الفذ ،رمز القوة والعزم، والهمة والتدبير ، فضيلة الشيخ العلامة أرشد القادري (رحمه اللّه)الملقب بـ"رئيس القلم" الذي شعر بالمسؤولية تجاه هذا الجانب فأقام بها مؤسسة تعليمية عالية المستوى ، وسماها بـ (جامعة حضرت نظام الدين أولياء) في حي ذاكر نغر بنيو دلهي التي غدت مركزا للعلم ،كما نفخت في أرواح الشبان المسلمين نفحات الحب والإيمان تجاه النبي الأكرم عليه أفضل الصلاة والتسليم. وبهذه الخطوة المباركة من قبل العلامة المذكور (رحمه اللّه)قد تقوت جماعة السنة في العاصمة ، ودبّ في جسمها روح الأمل والحياة وأصبح لأهل السنه والجماعة وزنا في دلهي الجديدة.

من هو العلامة أرشد القادري ؟

هو الأديب الأريب رئيس القلم العلامة أرشد القادري بن

الشيخ عبد اللطيف بن الشيخ عظيم الله ، ولد في قرية "سيده فور" من محافظة "بليا" في ولاية "أوتار براديش" الشمال الشرقي من الهند. وكانت بيئته التي فتح فيها عينيه علمية ودينية ،فقد كان أبوه عالما ورجلا متدينا من محبي الشيخ عبد القادر الجيلاني (رضي الله تعالى عنه)، كما كان جده وأعمامه وأبناء أعمامه علماء ورجال متدينين ومحافظين على الأخلاق والإسلام.

وإذا كان الأمر كذلك فقد كان من الطبيعي أن يصطبغ هذا الطفل بصبغة الدين ، وحقا فقد تربى في أحضان علوم الدين لدى أبيه وجده وهو في نعومة أظفاره من العمر ،حيث درس عليهما الكتب الإسلامية الابتدائية ، ثم اتجه إلى مركز الدراسات الإسلامية الجامعة الإشرفية بمباركفور حيث جلالة العلم ،حافظ الملة والدين المحدث الشيخ العلامة عبدالعزيز المرادآبادي (رحمه الله) يعطر أريجه العلمي الخالد أصقاع البلاد، فكأنه علم وفي راسه نار، أم أنه ضوء لامع يتهافت عليه الطلاب تهافت الفراش على النور، وهو يرويهم جميعا بغاية من الشفقة والحنان. ومن جملة من لازم الشيخ صاحبنا العلامة أرشدالقادري الذي قضى ثماني سنوات فى حضرته العالية يشفي غليله وينور شخصيته حتى تخرج لديه في العلوم الشرعية في سنة ١٩٤٤م.

بعد التخرج اتجه العلامة إلى التدريس ولكنه سرعان ما تحول من وظيفة التدريس داعيا إسلاميا ، يخطب ويكتب في الدفاع عن الإسلام وملته البيضاء متجولا في أرجاء الهند وخارجها بدون تعب ومل حتى استطاع زرع الإيمان والإخلاص في القلوب الميتة من جديد . وبقي على هذه الوطيرة من خدمة الإسلام بأحسن وجه حتى وافاه الله في عام ١٩٩٣م.(رحمه الله رحة واسعة وأدخله فسيح جناته).

كان العلامة يتمتع بذكاء خارق وحضور الشخصية وبموهبة علمية قوية ، ومن جانب آخر كان كثير الحركة ،وقوي العزم، مرهف الإحساس، شديد التيقظ ، من أصحاب التدبير والتنظيم ، قضىٰ حياته كلها في إيقاظ شعور الأمة تجاه القضايا الحساسة من الفكر القويم والمنهج الإسلامي العدل الذي طغت عليهما جاهلية القرن العشرين من الفساد في العقيدة والأخلاق .فتصدى لها العلامة بكل قوة وحماس ، راكضا وراء الحل، داعيا إلى الفكر الإسلامي القويم من أقصى بلاد الهند إلى أدناها ، لا يضع تر حاله إلى الحد، بل يسعى إلى تحقيق أهدف تسمو بالأمة الإسلامية إلى مدارج عالية من السعادة وهنأ ة البال والازدهار.

لقد أعطى الله العلامة أرشد القادري مواهب فطرية من قلم سيال ولسان ناطق استخدمهما في خدمة الإسلام فقد كان أديبا بارعا ، له ذوق سليم. ولكتاباته نفحة أدبية خاصة تستقطب القلوب،كما كان خطيبا مصقعا، له أسلوب جميل يجذب إليه الأذهان والأفئدة. فبالقم واللسان كليهما ظل العلامة يدافع عن حياض الإسلام وبياضه ويرد على أصحاب البدع والضلالة وأصحاب الهوى والخيانة ردا مقذعا وبالأخص على أولئك الظالمين الذين ملئت قلوبهم حنقا ووقاحة تجاه الحبيب المصطفىٰ عليه التحية والثناء.

كان العلامة يستخدم قلمه و لسانه فى حملاتة الدعوية كثيرة النطاق وكان النجاح له مؤزرا حيثما أرسى سفينته، وذلك لأن له عقلا سليما وقلبا مفعما بالحب والإيمان ينبض بالحيوية التامة ، مما استطاع به الوصول إلى ما لم يصل إليه غيره من معاصريه فقد نراه يبني المساجد ويفتح المؤسسات التعليمية ويؤسس المنظمات والحركات ذات التوجيه الإسلامي بجانب المولفات التي تتميز بالجودة النوعية والنفحة الإسلامية. كل هذا وذاك فى حياة عادية وأسلوب ساذج بسيط،ترى أعماله فى مختلف المستويات فى عصر شحة الرجال فتندهش على ما جاء به هذا الرجل الموهوب ، أكثر الله أمثاله،وإليك نماذج من أعماله:

(أ) من مؤلفاته:

(أ) محمد رسول الله في القرآن الكريم (الأردو)

(٢)لسان الفردوس(الأردو)

(٣) مصباح القرآن (الأردو)

(٤)إظهار العقيدة (مجموعة شعرية)(الأردو)

(٥)صدائے قلم (مجموعة الرسائل)(الأردو)

(٦)الزلزلة (الأردو)

(٧)زير وزبر.(الأردو)

(٨)دعوة الإنصاف وغيرها من المؤلفات التي تجاوز ٢٦ مؤلفا.

(ب) المساجد التي وضع حجرها الأساس:

(١) مسجد مكة في جمشيدفور من ولاية بهار(٢) مسجد مفتاح العلوم في راوركيلا من ولاية اريسا.

(٣) المسجد القادري في تيلكو من بهار.

وغيرها من المساجد وضع العلامة حجرها الأساس في أرجاء بلاد الهند وخارجها. ولا شك أن هذا الشئى يدل على إخلاصه وعمله في الدين.

(ج) الموسسات التعليمية التي أسسها:

(١) جامعة مدينة الإسلام في دين هاغ هولندا (٢) كلية التبشير الإسلامي في بريد فورد/البريطانيا.

(٣) دارالعلوم عليمية في سورينام/ أميريكا(٤) مدرسة فيض العلوم في جمشيد فور/بهار.

(٥) دارالعلوم ضياء الإسلام هورا/ بنغال(٦) مدرسة مدينة العلوم ميورود/بنگلور.

(٧) الجامعة الغوثية الرضوية سهارنفور/ يوپی(٨) جامعة حضرت نظام الدين أولياء /ذاكرنغر دلهي.

هذه وغيرها من المؤسسات التعلمية التي تتجاوز ٢١ مؤسسة في مختلف أرجاء الهند وخارجها. نكتفي بهذا القدر خوفا من الإطالة.

(د) المنظمات والجمعيات التي أقامها:

(١) World Islamic Mission- أسس في مكة المكرمة ومركزها الرئيس في لندن.

(٢) الدعوة الإسلامية: منظمة دعوية عالمية شارك في تاسيسها مع نخبة من العلماء في كراتشي باكستان.

(٣) الإدارة الشريعة /بتنا / بهار.

(٤) الجبهة الإسلامية المتحدة رائيفور /ايم پی.

هذه وغيرها من المنظمات والجمعيات التي شارك العلامة في تاسيسها وتنظيها. وهذا مما يدل على فكره الثاقب وشعوره البالغ تجاه قضايا الأمة وسُبل ترقيتها.

(هـ) مساهمته في المؤتمرات الوطنية والعالمية:

١ـ مؤتمر الجمعيات والجماعات / طهران /ايران.

٢ـ مؤتمر الدعوة الإسلامية العالمية /طرابلس/ ليبيا.

٣ـ مؤتمر الحجاز / لندن بريطانيا.

٤ـ مؤتمر الإمام أحمدرضا / كراتشي /باكستان.

٥ـ مؤتمر المبلغ الأعظم عبد العليم الصديقي / امستردم /هولندا.

٦ـ مؤتمر العالم الإسلامي / بغداد / العراق.

٧ـ مؤتمر جمعية العلماء السنة لعموم الهند / كانفور الهند.

هذه وغيرها من المؤتمرات شارك فيها مساهمة فعالة، بل كانت شخصيته رمز النجاح والارتياح لأي مؤتمر حضره. وعلى صعيد آخر كان يقيم نفسه المؤتمرات حول القضايا الساخنة، ويدعو إليها الشخصيات الإسلامية من الهند وخارجها. ومن هذه المؤتمرات التي نظمها العلامة: المؤتمر السني لعوم الهند في دلهي / الهند.

هذه نبذة من أعمال العلامة أرشد القادري، العظيمة التي تدل على عبقريته في عصرنا الحاضر. ومن جملة الأعمال الدعوية والآثار التعليمية والتربوية التي قام بها العلامة على الصعيد الوطني والعالمي تاسيسه: (جامعة حضرت نظام الدين أولياء) في أرض دلهي الجديدة التي كانت قفرة جدبة بالنسبة لأهل السنة والجماعة، فبها تألقت آفاق دلهي بأنوار المصطفى عليه التحية والثناء، وبها دويت في أرجائها نغمات الحب والإيثار تجاه النبي المختارﷺ. ولا زالت الأمور ترجع إلى حياضها شيئا فشيئا بتأنق وازدهار، إن شاء الله عزوجلّ.

جامعة حضرت نظام الدين أولياء:

كما قلنا إن الجامعة حضرت نظام الدين أولياء أسسها العلامة أرشد القادري (رحمه الله) نظراً لضرورة ملحة في عام ١٩٨٩م وسماها بهذا الاسم نسبة إلى الداعي الصالح الصوفي

الواصل سيدنا الشيخ نظام الدين الملقب بـ"الأولياء (ت:٧٢٥هـ) وهو الذي يرجع إليه الفضل في ترسيخ العقيدة الإسلامية في النفوس في شبه القارة الهندية . ومرقده في" بستي نظام الدين" مرجع للعامة والخاصة، ومما يذكر أن العلامة لم ينسب هذه الجامعة إلى هذه الشخصية إلا لملابسات وعلاقات قوية بين أهداف الجامعة التي رمى إليها العلامة من وراء التاسيس وبين حضرة الشيخ نظام الدين أولياء (رحمه الله). وذلك أن الشيخ كان له دور فعال في تعمير القلوب بحب النبي ﷺ والإيمان وإرشادهم نحو الطريق القويم وإخراجهم من أوحال الكفر والذنوب. فإيحاءً من أعماله الدعوية العظيمة سمى العلامة هذه الجامعة باسمه الشريف تيمنا وتشرفا.

اكتملت بناية الجامعة الأولى في عام ١٩٩٤م وبدأت الدراسة فيها في عام ١٩٩٥م . وفي مدة يسيرة حصلت هذه المؤسسة على مكانة ـ لا باس بها ـ بين المدارس الإسلامية فقد حصلت على المعادلة التعلمية بالازهر الشريف/ مصر، وبذلك استطاع متخرجوها أن يفدوا إلى الأزهر الشريف. ولازالت هذه المعادلة نشطة إلى يومنا هذا إذ يفد من طلابها إلى الأزهر مجموعة كبيرة ،كما تخرج منهم مجموعة في الأزهر، ولهم الآن سمعة علمية حسنة ودور فعال في أداء مهام الدعوة والإرشاد بأحسن الوجوه.

من أهداف الجامعة :

تهدف الجامعة في كيانها إلى ما يأتي:

١ ـ إعداد جيل مثقف بالعلوم الإسلامية والآداب العربية.

٢ ـ إعداد دعاة إسلاميين يقومون بعبء الدعوة الإسلامية في العالم ضمن المنهج الصحيح والعقيدة الإسلامية بعيدا عن التعصب والتطرف والمغالاة، ولهم روح نشطة قوية عامرة بحب الدعوة والإرشاد.

٣ ـ إعداد نخبة علمية متحلية بمظاهر الأخلاق الإسلامية بحركة العلم والقلم والقرطاس.

أقسام الجامعة وكلياتها:

لازالت هذه الجامعة في بداية خطواتها وهي في الطريق إلى الأمام بروح حماسية بفضل أساتذتها وأركانها.

وتضم الجامعة حاليا كليتين : (١) كلية الأدب والدعوة (٢) كلية القرآن.

أما كلية القرآن فهي تضم ثلاثة أقسام : (١) قسم تحفيظ القرآن الكريم (٢) قسم تجويد القرآن

(٣) قسم تعليم القرآن الكريم (الناظرة).

أما كلية الأدب والدعوة فهي بمثابة الكلية ، مدة الدراسة فيها سنتان موزعة على أربعة فصول بمنهج جامع خاص ، فيه كل ما يحتاج إليه الداعي من لغة وأدب وثقافة. وتفتح هذه الكلية مصراعيه لطلبة المدارس الإسلامية الذين يتخرجون فيها بشهادة الفضيلة في العلوم الإسلامية.

إلى جانب هذه الأقسام العلمية هناك أقسام إدارية، منها : دار الإفتاء ، والمكتبة ،وقسم الصحافة والإعلام، وقسم النشر والتوزيع، وقسم البحث والتحقيق ، فضلا عن النوادي الثقافية لطلبة الجامعة باسم : (المجلس الثقافي) ويضم هذا المجلس النوادي العربية والإنكليزية للتمرن على الخطابة والكتابة في كلتا اللغتين:العربية والإنكليزية ، حسب مقتضيات الدعوة. ويقيم الطلبة هذه النوادي بإشراف الأساتذة كل ليلة الجمعة.

والجدير بالذكر أن الجامعة توفر لطلبتها خدمات السكن والطعام والكتب مجانا. مع أن الجامعة لا تاخذ منحة حكومية وإنما جميع مصاريفها على عاتق المخيرين المخلصين .

وفي آخر المطاف نحن نعبر عن سعادتنا وابتهاجنا بما أحرزت الجامعة من خطوات متقدمة في أهدافها العظيمة ، داعين إلى الله القدير أن يحفظها من عين سوء، ويجزي موسسها العلامة أرشد القادري جزاء الخير ويرفع درجاته يوم القيامة.

☆☆☆

استاذ الادب العربي في جامعة حضرة نظام الدين اولياء
ومتخرج من جامعة صدام للعلوم الاسلامية بغداد

رئیس القلم کا تبلیغی اور دعوتی شاہ کار

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

مولانا محمد مہتاب عالم☆

اسلام ایک صاف وشفاف، پاکیزہ اور آسان سا مذہب ہے، جس کے اندر دشواری و پیچیدگی اور زوروزبردستی کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن شریف میں ہے:"لا إکراه في الدين قد تبين الرشد من الغي"(سورۂ بقرہ) دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت اور گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ بلکہ اسلام ایک ہمہ گیر اور مکمل نظام حیات کا نام ہے، جس نے اپنے متبعین کو دشواری اور پریشانی میں نہیں ڈالا بلکہ انسانی زندگی کے تمام مسائل اور مراحل کا حل ڈھونڈھ نکالا ہے، اور اسی مذہب اسلام کے ماننے والوں کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اور آگے سورۂ آل عمران میں ہے:"إنّ الدين عند الله الإسلام" بیشک سب سے اچھا اور بہتر دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہے تو جو اللہ کا سب سے پسندیدہ دین ہے اس میں اس کے ماننے والوں کے لئے دشواریوں اور پریشانیوں کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے۔

لیکن اس کی شفافیت اور پاکیزگی کے باوجود آج کے اس پُرفتن دور اور نازیبا ماحول میں اسے بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کبھی اسے اور اس کے ماننے والوں کو دہشت گرد کہا جاتا ہے، تو کبھی کٹر پسند اور دقیانوس مگر اس کے لئے یہ کوئی بات نئی نہیں ہے بلکہ آج سے چودہ سو سال پہلے کی گذشتہ تاریخ سے بھی اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ بے دینوں اور اسلام دشمن طاقتوں کے ذریعہ اس صفحۂ ہستی سے مٹا نے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

اور سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں سے ایثار کا جذبہ، اسلام کی چاہت اور رسول کی محبت کا خاتمہ کیا جا رہا تھا مگر جو بھی اسے مٹانے نکلا خود ہی مٹ گیا، جو بھی اس کے چاہنے والوں کے دلوں سے اس کی چاہت اور محبت کا خاتمہ کرنا چاہا، وہ خود ختم ہو گیا اور جنہوں نے اسے جادوئی اور خود ساختہ مذہب بتا کر اس کے متبعین سے اس پہ مر مٹنے کے حوصلے اور ایثار وقربانی کے جذبے کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ضلالت اور گمرہی کے قعر عمیق میں ڈبونا اور ختم کرنا چاہا، وہ خود اس کی صداقت اور پاکیزگی کے عظیم سمندر میں غرق ہو گیا اور اس کی حقانیت کے قائل ہو گیا اور اسلام اپنی آب وتاب کے ساتھ اپنی صداقت وحقانیت کے سہارے پھلتا پھولتا رہا۔ اور ساتھ ہی احسان عظیم ہے اس رب قدیر کا جس نے باطل قوتوں کی سرزنش، مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت اور امت مسلمہ کی بھٹکتی نیا کو پار لگانے کے لئے سرکار دوعالم ﷺ کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے حق وباطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا اور دعوت وتبلیغ کے لئے جہد مسلسل بن گئے۔

اس سلسلہ کی ایک شاندار کڑی بزرگان دین، سلف صالحین، اولیاء عظام اور صوفیۂ کرام کی حیات مبارکہ ہے جنہوں نے خانقاہ کی سادہ اور سنجیدہ زندگی، زہد وتقویٰ، پاکیزہ خیال اور دعوت وتبلیغ کا جذبہ لئے اپنے آپ کو امت مسلمہ کی تعلیم وتربیت اور مذہب اسلام کی نشرواشاعت کے لئے وقف کر دیا تھا اور تنہائی سے لے کر محافل، مجالس اور گلی کوچہ میں جا جا کر بلا خوف وخطر لوگوں کو مذہب اسلام کی دعوت دی، اس کے اسرار ورموز کو لوگوں پہ آشکارا کیا، اور اس کی حقانیت کا پرچم لہرایا، ان بے لوث اور خدا پرست حضرات کی انتھک کوشش اور حسن اخلاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلا تفریق مذہب وملت کے کثیر تعداد میں لوگ اسلام کے آغوش میں سمٹ گئے۔ اس سلسلہ کی ایک اور اہم اور شاندار کڑی اس دور کے مفکر ہیں، مبلغین، حساس اور دور اندیش علماء اور فضلاء کی جماعت ہے جنہوں نے اپنی فکری، علمی تبلیغی دعوت اور اسلامی مدارس کے ذریعہ اسلامی احکامات اور رسول ﷺ کے فرمودات کو بچوں سے لے کر جوانوں تک، جوانی کے حسین دہلیز پہ قدم رکھنے والے جوانوں سے لے کر عمر کے آخری مراحل طے کرنے والے بزرگ

☆ [illegible] جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء [illegible]

حضرات تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، اپنوں میں بیگانوں، میں شہروں میں، دیہاتوں میں غرض کہ ہر جگہ اور ہر محفل ومجلس میں عام کیا اور مذہب اسلام میں شمولیت کی دعوت دی، ان علماء اور فضلاء کی کثرت، روایتی مدارس کی بہتات اور اس کے فارغ التحصیل فضلاء کی تبلیغی سر گرمی، زبان وبیان کی دلکشی اور تحر وتقریر کی زور بیانی نے بہت سارے کمالات دکھائے، دعوت وتبلیغ کے مشن کو آگے بڑھایا اور کامیابی بھی حاصل کیئے مگر عالمی تناظر اور بدلتے حالات اور تقاضے کے پیش نظر جب اس کا محاسبہ کیا گیا تو یہ ساری سرگرمیاں کسی ضلعی یا ریاستی سطح سے تجاوز نہ کرسکیں۔اور وقت وحالات کے دور کو بھانپنے والا اور امت مسلمہ کی نبض کو پہچاننے والا ہر شخص اس حد بندی کو توڑ کر اپنے تبلیغی اور دعوتی مشن کو شہر آفاق بنانے اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب وثقافت کے پروردہ فرزندان کی صدائے توحید کو یورپ کی خوبصورت گلیاروں تک میں عام کرنے کا درپے تھا، مگر تہی دامن افراد اپنے تبلیغی اور دعوتی جذبہ سے سرشار اپنی کس مپرسی پر آنسو بہاتے رہے اور صاحب ثروت اور ذی استعداد افراد اس سے اپنی نظریں بچاتے رہے کوئی شخص اس کی طرف پیش قدمی کرنے کو تیار نہیں ہوا۔

لیکن ایسے نامساعد حالات میں سنگلاخ وادیوں کو لالہ زار بنانے والا، حق وباطل کے معرکوں میں سرگرم رہنے والا صرف ایک درویش صفت مجاہد تھا جسے دنیائے سنیت رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔جنہوں نے دعوت وتبلیغ کے اہم کام کا بوجھ اپنے نازک اور کمزور کاندھوں پہ اٹھایا اور عمر کا بیشتر حصہ مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت میں گذار دیا، اور اس مشن کے فروغ اور بقاء کے لئے موصوف نے ملک اور بیرون ملک کے بیشتر حصے میں بہت سارے تعلیمی اور تربیتی ادارے، اسلامی مدارس اور عصری اسکول وغیرہ قائم کیئے، ہندوستان کے کچھ ہی اضلاع اور ریاستیں ایسی ہوں گیں جہاں موصوف کے قائم کردہ مدارس اور مساجد نہ ہوں گے ورنہ علامہ قادری نے اپنی دانائی، دانشمندی اور دوروندیشی سے بدلتے حالات اور تقاضے کے پیش نظر امت مسلمہ اور اہلسنت وجماعت پہ وارد ہونے والے سوالات کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لئے دینی مدارس، ادبی گہوارے اور دعوتی مشن کا جال پورے ملک میں بچھا دیا تھا۔ جب موصوف نے یہ محسوس کیا کہ میرے قائم کردہ یہ دینی مدارس، مساجد اور تکلینکی ادارے دعوت وتبلیغ کے کام کو بحسن وخوبی انجام دینے سے قاصر ہیں اور اس کا دائرہ محدود ہے تو علامہ قادری نے ایک ایسا منصوبہ تیار کیا کہ ہمیں اپنے مشن کے فروغ وبقا کے لیے اور حدود کی بندھنوں کو توڑنے کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہئے، جہاں سے ہماری آوازن کی گونج قومی اور بین الاقوامی سطح تک محسوس کی جا سکے اور اس حقانیت کی چیخ وپکار سے بدعقیدوں اور گمراہوں کے بلند و بالا ایوان میں زلزلہ آجائے جس کے لئے انہوں نے ہندوستان کا دل کہا جانے عظیم شہر دہلی کا انتخاب فرمایا اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا ایسا عظیم الشان اور فلک بوس قلعہ تعمیر کیا جس کے ذریعہ عوام الناس کے قلوب کو مسخر کرنے اور گمراہوں کی بدعقیدگی اور گمرہی کی بلند وبالا عمارتوں کو زیر وزبر کرنے میں کوئی دیر نہ لگی۔یہی وہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء ہے جس میں مختلف مدارس کے فارغ التحصیل نوجوان فضلاء کو داخلہ دیا جاتا ہے، اور خاص طور سے عربی اور انگریزی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے، جس کے لئے دوسالہ تخصص فی الادب والدعوہ کورس کا مکمل انتظام ہے یہاں زیر تعلیم طلبہ کے لئے بہترین طعام وقیام اور ماڈرن سہولیات کا اچھا انتظام ہے۔ جو طلبہ کے دل ودماغ کو تازگی اور توانائی فراہم کرنے میں، بلند وبالا اور روشن خیال فکر وعمل میں کافی معاون ثابت ہوتے ہیں، ساتھ ہی طلبہ کی زبان وبیان، اور تحریر وتقریر میں دلکشی اور نیا پن پیدا کرنے کے لئے کئی ایک انگریزی عربی اور اردو کی انجمنیں اور مسابقتی بزم منعقد کی جاتی ہیں اور دعوت وتبلیغ کے طریقۂ کار سے آگاہ کیا جاتا ہے، اور جہاں تک میرا ماننا ہے وہ یہ کہ ہمارے دینی اور روایتی مدارس ان چیزوں سے بالکل ہی خالی ہیں، جن سے میری درخواست اور میری رائے یہ ہے کہ چھوٹے مدارس جہاں یہ چیزیں اور سہولیات موجود نہیں ہیں اس کی طرف دھیان دینا چاہئے اور بڑے مدارس جو ایسا کر سکتے ہیں انہیں اپنے مدارس میں اس کا انتظام کرنا چاہئے تاکہ اپنے پروردہ افراد کو زندگی کے کسی موڑ پہ احساس کمتری کا شکار نہ ہونے دیں اور وقت کے ساتھ کاندھے سے کاندھا

ملا کر چلنے کی طاقت اور مذہب وملت کی طرف اٹھنے والی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی اوقات بتا کر حق و باطل کے بیچ خط فاصل کھینچ دینے کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔

حضرت علامہ ارشد القادری کے لیے ہمہ وقت یہی دعا نکلتی ہے کہ مولیٰ تعالیٰ انہیں اپنے خاص جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، موصوف نے دنیائے سنیت پر جو احسان کیا ہے اور جو عظیم اور اہم کار نامے انجام دیئے ہیں وہ رہتی دنیا تک ہر شخص کے لیے ایک مثال اور مشعل راہ ہے، اور خاص کر عصری جامعات اور یونیورسٹیز میں سنی صحیح العقیدہ طلبہ کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا اگر ایک دو تھے بھی تو وہ اظہار حقیقت سے خوف کھاتے تھے مگر علامہ قادری کا احسان اور خدا کا شکر ہے کہ اس وقت تقریباً دلی کی تمام یونیورسٹی میں بہت سارے سنی طلبہ موجود ہیں اور اپنی اپنی پسند اور اختیارات کے مطابق مختلف زبان (عربی، فارسی، اردو، فرنچ، چینی، جاپانی، اسپینش، رشین اور کورین ،وغیرہ) تاریخ وسیاست اسلامیات، اقتصادیات اور سائنس وغیرہ میں ریسرچ کر رہے ہیں اور ایک ایسا صالح اسلامی انقلاب لانے کے در پے ہیں کہ جس سے خوابیدہ معاشرہ جاگ اٹھے، نئی تہذیب وثقافت اور تاریخ وتمدن کا ظہور ہو، سبھی لوگوں کو بنیادی حقوق اور مذہبی آزادی حاصل ہو اور مذہب اسلام کی توسیع وترقی بھی ہو۔☆☆☆

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

اور مدرسہ فیض العلوم وقت کی اہم ضرورت

مولانا ہاشم رضا نظامی

یوں تو اس خاکدان گیتی پر لاکھوں بلکہ کروڑں شخصیتیں جنم لیتی ہیں مگر ان میں کچھ ہی ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جو قابل قدر اور قوم کے لئے سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی ہیں۔ رب قدیر ان کے اندر کچھ اس طرح گونا گوں خوبیاں اور ایسے ایسے اوصاف و کمالات پیدا کر دیتا ہے کہ وہ عام مخلوق سے ممتاز و افضل ہو جاتی ہیں۔ سلطان المناظرین، فاتح ایشیا و یورپ، قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہی چنندہ عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ یہی وہ ذات باکمال ہے جس میں رب تعالیٰ نے ایسی ایسی خوبیاں جمع کر دیں کہ جن پر آج ہر سنی صحیح العقیدہ مسلمان کو رشک ہے۔ ان کے تاریخ ساز کارناموں کو دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ جماعتی سطح پر کام کرنے کا جو جذبہ ایمانی ان کے اندر تھا وہ کسی اور کا حصہ نہیں۔ یقیناً دینی و تبلیغی اور افراد کی ذہن سازی جیسے امور کے لئے رب تعالیٰ نے انہیں بلا کا ذہن عطا کیا تھا۔

حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ۵/ مارچ ۱۹۲۵ء کو ضلع بلیا (یو پی) کے ایک سید پورہ نامی موضع میں ایک علمی خانوادہ میں ہوئی۔ مگر ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جمشید پور جھارکھنڈ میں گذرا۔ جمشید پور سے علامہ کو حد درجہ لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کا ابدی آرام گاہ مدرسہ فیض العلوم جمشید پور ہی بنا۔ جہاں سے آج پورے صوبۂ جھارکھنڈ، بہار و بنگال اور قرب و جوار کے تمام ریاستوں کے مسلمانوں کو رشد و ہدایت و حق و صداقت کی روشنی مل رہی ہے۔

استاذ العلماء حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی زیر نگرانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں علامہ قادری کی ایسی خصوصی تربیت ہوئی کہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ایک عظیم مفکر، لاجواب مناظر، بے مثال مقرر، بلند پایہ مصنف، ممتاز اہل قلم بن کر پوری دنیا کے سامنے ابھرے۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو علم و ادب، فکر و نظر، تالیف و تصنیف، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تدریس، تحریر و تقریر، صحافت و سیاست اور تحریک و تنظیم سے بھر پور نظر آتا ہے۔ بقول مولانا مقبول احمد مصباحی "وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جس میں ایک عالم سمایا ہوا ہے، دیکھنے والے حیران ہیں کہ یہ کس کان کا ہیرا ہے جس کی قیمت لگانے سے تجار عالم ورطہ حیرت میں ہیں" رئیس القلم نمبر صفحہ ۱۴۸۔

حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی قدر آور شخصیت اور ان کے جلیل القدر احسانات پر آج پوری دنیائے سنیت کو ناز ہے۔ وہ ہر میدان کے شہسوار اور بطل جلیل نظر آتے ہیں۔ اگر ان کو ایک عالمی شخصیت کہا جائے تو اپنی جگہ بالکل بجا و درست ہوگا۔ اس لئے کہ ہندو بیرون ہند ہر جگہ ان کے فضل و کمال کا ڈنکا بج رہا ہے اور دنیا کے گوشے گوشے میں ان کی فتح و شہرت کا علم بلند ہو رہا ہے خواہ وہ ایشیا و یورپ کی دھرتی ہو یا امریکہ و افریقہ کی سرزمین، غرضیکہ ان کا قائم کردہ دینی و اسلامی مشن چہار دانگ عالم میں جاری ہے۔

ہندوستان میں ان کے قائم کردہ اداروں میں فیض العلوم اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دو ایسے ادارے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مرکزیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر آج سے پچاس سال قبل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے گا کہ فیض العلوم جیسا مرکزی ادارہ کا قیام مشرقی ہند میں وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جس کو علامہ قادری نے فیض العلوم کے قیام و بنا کے ذریعہ کافی حد تک پوری کیا۔ دوسرا یہ کہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا قیام بھی عصری تقاضوں کی رو سے نہایت ضروری تھا، علامہ کے ان دونوں اول و آخر اداروں کو وقت اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے یقیناً مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔

مدرسہ فیض العلوم: جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے حکم اور علامہ قادری کی سعی پیہم و جہد مسلسل کی وجہ سے

جامعہ فیض العلوم کی بنیاد ان کے ہاتھوں رکھی گئی۔ جو آج صوبہ جھارکھنڈ کا دینی علمی ومرکزی ادارہ ہے۔ فیض العلوم نے مرکزیت کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اس لئے کہ صوبۂ جھارکھنڈ، بہار، بنگال، اڑیسہ اور دیگر ریاستوں کے سادہ لوح مسلمانوں کو راہ راست پر لانے اور اسلام کے نو نہالوں کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ فیض العلوم کا علمی فیضان آج ہر جگہ عام ہے اور اس کے علم وآگہی کا سرچشمہ اس طرح ابل رہا ہے کہ ہر تشنہ لب اپنی علمی پیاس بجھا رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس زمانے میں فیض العلوم کا قیام عمل میں آیا اس وقت پورے چھوٹا ناگپور میں کوئی اہل سنت وجماعت کا مستقل ادارہ نہ تھا۔ ایسے وقت میں فیض العلوم نے جمشید پور اور اس کے قریبی اضلاع میں دینی تبلیغی، تعمیری اشاعتی اور افراد سازی کے کارہائے نمایاں انجام دینے میں جو رول ادا کیا ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ فیض العلوم ہی کا فیضان کرم اور رب تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ آج جمشید پور اور اس کے باہر فیض العلوم کے کئی شاخیں اور تعلیمی ادارے وجود میں آئے جو آج بھی اسی کی زیر نگرانی چل رہے ہیں مثلاً (۱) مدرسہ دارالسلام آزاد نگر، (۲) مدرسہ عزیز العلوم جگسلائی (۳) مدرسہ گلشن بغداد ہزاری باغ (۴) ادارۂ شرعیہ پٹنہ (۵) اسلامی مرکز رانچی (۶) مدرسہ تنویر الاسلام ٹیلکو (۷) فلاحی مرکز آزاد نگر (۸) مدرسہ مدینۃ الرسول کوڈرما۔ مذکورہ بالا اداروں میں سے کئی ادارے ایسے بھی ہیں جو خودمختار اور آزاد بھی ہیں۔

فیض العلوم نے پچاس سال کی مدت میں ایسے ایسے علماء وفضلاء تیار کیا ہے جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور مسلک اہل سنت کی ترویج واشاعت اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ فیض العلوم کے فارغین عصری درسگاہوں میں بھی کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ آج تقریباً دہلی کی تمام یونیورسیٹیز میں فیضی برادران مل جاتے ہیں جو عصری تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہیں اور علامہ کے قائم کردہ مشن کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔ بہر حال جو بھی ہو جیسے بھی ہو ان تمام کا سہرا فیض العلوم اور علامہ موصوف کے سر جاتا ہے۔

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دہلی ہندوستان کا دل اور اس کی راجدھانی ہے۔ دہلی کے بغیر ہندوستان کا تصور کچھ نامکمل سا ہے۔ چونکہ یہی وہ شہر ہے جس سے تقریباً ساری دنیا کا تعلق ہے۔ غالباً اسی کو سامنے رکھ کر قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام وسنیت کے فروغ واستحکام اور اعلیٰ پیمانے پر دعوت وتبلیغ کا کام کرنے کے لئے شہر دہلی کا انتخاب فرمایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت دور اندیش اور انجام کی پرواہ قطعی نہ کرتے کہ آگے چل کر کیا ہوگا وسائل کی فراہمی کا مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ ان کی تحریروں اور تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ جامعہ کے قیام کے تعلق سے بے حد متفکر وپریشان رہتے تھے۔ آپ نے ایسی ایسی صعوبتوں کو برداشت کیا کہ بالکل ضعیفی اور لاغری کے عالم میں بھی جامعہ کی تعمیری وسائل کی فراہمی کے لئے بسوں پر سفر کیا ہے، آخر کار ان کی شبانہ روز کوششوں اور محنتوں کا ثمرہ بر آیا اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے لئے زمین حاصل ہوگئی جیسا کہ آپ خود مقدمہ معارف اسم محمد کے صفحہ ۱۷ پر لکھتے ہیں ''جامعہ نظام الدین اولیاء کے نام سے دہلی میں اہل سنت کے ایک دینی مرکز کے قیام کے لئے دس سال سے زمین کے حصول کے لئے میں کوشاں تھا، کافی جدوجہد کے بعد مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قریب ذاکر نگر میں ایک زمین حاصل ہوگئی ہے اس کی تعمیری وسائل کی تلاش میں کوشاں ہوں''

آخر کار ۶ رجون ۱۹۹۲ء کو جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا سنگ بنیاد رکھا گیا جو آج پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور مثال ادارہ ہے، جہاں مدارس عربیہ کے فارغین علماء وفضلاء کو بین الاقوامی ترقی یافتہ زبانوں میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے لئے خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ اور طلبہ کے اندر عربی وانگریزی میں اس قدر مہارت پیدا کر دی جاتی ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں تبلیغ ودعوت وارشاد کا کام کرنے میں اور اپنے مافی الضمیر کو عربی یا انگریزی میں ادا کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے ہیں۔

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا رابطہ ومعادلہ دنیا کی ممتاز ترین قدیم دینی دانش گاہ جامعہ ازہر مصر سے بھی ہے۔ جہاں ہر سال جامعہ کے فارغین دو سالہ کورس مکمل کرنے کے بعد جاتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ نظام الدین

اولیاء دہلی کی سرزمین پر سنی طلبہ کے لئے ایک پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا ہے۔آج اسی کا نتیجہ ہے کہ دہلی اور دیگر ریاست کی تقریباً تمام یونیورسٹیز میں اچھے اچھے کورسیز میں زیر تعلیم ہیں اور قائد اہل سنت کی فکر کو پروان چڑھانے میں ہردم کوشاں ہیں۔جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء سرزمین دہلی میں قائم کر کے علامہ قادری نے جو احسانات پوری دنیائے سنیت پر کیے ہیں ان سے ہر سنی مسلمان کی گردن بوجھل ہے۔ان کا یہ مبارک کارنامہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ جگمگا تا رہے گا اور آنے والی نسل اور تاریخ امت مسلمہ یقیناً آپ پر فخر کرے گی چونکہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء نے سنی طلبہ کے لئے ملکی جامعات میں جانے کی ایسی راہ ہموار کی ہے کہ آج ہر کوئی یہی کہتا ہوا نظر آتا ہے۔

بانی جامعہ ارشد القادری
قائد اہل سنت پہ لاکھوں سلام

☆ایم،اے فائنل جواہر لال نہرو یونیورسیٹی

خوش خبری　　　　خوش خبری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے جسے قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر جدید عربی وانگریزی زبان وادب میں ماہر علماء ومبلغین کی ایک نئی نسل تیار کرنے کے لئے ۱۹۹۴ میں دہلی میں قائم فرمایا تھا۔ یہاں مدارس کے فارغ علماء کو دو سالہ کورس ''تخصص فی الادب والدعوۃ'' کے ذریعہ اصول دعوت اور عربی وانگریزی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔

جامعہ کی ہمہ جہت ترقی اور عصری تقاضوں کے سامنے اس کی چار منزلہ موجودہ عمارت اپنی تنگئ داماں کا شکوہ کر رہی تھی جس کے پیش نظر بانی جامعہ حضرت علامہ علیہ الرحمہ کی خریدی ہوئی زمین پر ایک نئی عمارت کی تعمیر کا عزم مصمم کیا اور بتاریخ ۱۲راگست ۲۰۰۷ء بروز اتوار بحمدہ تعالیٰ نئی عمارت کے سنگ بنیاد کی رسم شرف ملت، عزت مآب حضرت اشرف میاں برکاتی صاحب قبلہ مدظلہ العالی (چشم چراغ خانقاہ مارہرہ مطہرہ) کے مقدس ہاتھوں سے بوقت ۱۰ بجے صبح ادا ہوگئی۔

اس موقعہ پر حضرت شرف ملت مدظلہ نے اپنے دعائیہ کلمات میں بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بانی جامعہ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے حوالے سے فرمایا کہ ''جب جامعہ حضرت نظام الدین والیاء کا نام سنتا ہوں تو ان کی یادوں کی شمع تھرتھرانے لگتی ہے بلاشبہ آپ ہندوستان کی وہ واحد شخصیت تھے جس نے کثیر تعداد میں مدارس مساجد اور تنظیمیں قائم فرما کر ملت پر احسان عظیم کیا''۔ حضرت شرف ملت نے اس نئی عمارت میں تعلیم نسواں کے ارادے کو سراہتے عورتوں کی دینی تعلیم پر زور دیا اور اسے وقت کی اہم ضرورت بتایا۔

اس موقعہ پر شہر کے دیگر معزز ہستیوں میں حضرت علامہ لیس اختر مصباحی مدظلہ بھی تشریف فرما تھے۔آپ نے اپنے تاثراتی کلمات میں جامعہ کی تاریخ میں اس اقدام کو ایک نیا باب قرار دیا۔

میں جامعہ کے ارباب حل وعقد کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے

ناظم نشر واشاعت

محمد ذکی اللہ مصباحی

09868981308

باب دوم

اسلامیات

قرآن اور طلب اذن

مولانا شاہ عالم

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو وہی لوگ جو مکہ میں کمزور اور بے بس تھے یہاں طاقتور اور مضبوط ہو گئے، خوف و ہراس کی زندگی گذارنے والے خود مامون و محفوظ ہو گئے اور دوسروں کے لیے امن و سلامتی کے پیغامبر بن کر ابھرے، چھپ چھپ کر عبادت اور ریاضت کرنے والے علی الاعلان عبادت کرنے لگے، اور مدینہ ایک پرامن وطن ہو گیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کو غزوۂ خندق میں اپنے ہی دروازے پر زبردست شکست دی اور دشمن خائب و خاسر ہو کر لوٹے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابۂ کرام میں اعلان فرمایا کہ مدینہ ایک مستحکم اور مستقل شہر ہو چکا ہے لہذا مسلمان یہاں اپنی جان و مال اور اہل و عیال کے ساتھ مامون ہو کر رہیں، اور شب خون مارنے والے دشمن سے بے خوف ہو کر ان کے لیے اسلامی احکام کا بجالانا اور اس کے فرائض کا ادا کرنا آسان ہو چکا ہے۔ اس وقت حضور نے فرمایا تھا "لن تغزوکم قریش بعد عامکم هذا ولکنکم تغزو هم" (قریش اس سال کے بعد تم سے کبھی نہیں لڑیں گے لیکن تم ان سے لڑو گے) سیرت ابن ہشام ۲۶۶/۳

اس کے بعد مدینہ ایک ایسا پرامن شہر ہو گیا جہاں لوگ چین و سکون کی زندگی گذارنے لگے۔ اس لیے اس ماحول کے مناسب تھا کہ قرآن ایسے احکام لے کر نازل ہو جو مسلمانوں کے لیے ان کی معاشرتی زندگی کو منظم کرے اور عبادت و ریاضت کا سلیقہ سکھائے اس لیے ان ایام میں سورۂ نور کا نزول ہوا جس میں اخلاقی، اجتماعی، سماجی اور معاشرتی قوانین بھرے ہوئے ہیں تا کہ حیات بشری کی اصلاح ہو سکے اور ایک نئے معاشرے کی تعمیر کی جا سکے۔ یہ سورت جن تعلیمات الٰہیہ پر مشتمل ہے وہ دو طرح کے ہیں۔

(ا) ایسے احکامات جو ان برے طور و طریقے اور رسم و رواج کا علاج کرتے ہیں، جو اسلامی معاشرے کی بیخ کنی کر رہے تھے، مثلا آیات حد زنا، آیات حد قذف اور آیات لعان۔

(۲) ایسی تعلیمات جو لوگوں کو بد نظمی اور غلط تہذیب و ثقافت سے دور رکھ سکیں۔ جیسے طلب اذن کی آیات، آیات غض بصر (نگاہیں نیچی رکھنا) حفظ فرج اور نکاح پر ابھارنے والی آیات۔

ان شاء اللہ میری گفتگو طلب اذن کی آیات اور اس کی تفاسیر پر مرکوز ہوگی۔ سورۂ نور میں طلب اذن کی آیات دو مقام پر ہیں۔

مقام اول: یا ایها الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا و تسلموا علی أهلها ذلکم خیر لکم لعلکم تذکرون (۲۷) فإن لم تجدوا فیها أحدا فلا تدخلوها حتی یؤذن لکم و إن قیل لکم ارجعوا فارجعوا هو أزکی لکم والله بما تعملون علیم (۲۸) لیس علیکم جناح أن تدخلوا بیوتا غیر مسکونة فیها متاع لکم والله یعلم ما تبدون وما تکتمون (۲۹)

اے ایمان والو! اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا غیروں کے گھروں میں نہ جاؤ جب تک اجازت نہ طلب کر لو اور ان کے مکینوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم خیال رکھو۔ پھر اگر ان میں تم کسی کو نہ پاؤ جب بھی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ اور اگر تم سے لوٹنے کو کہا جائے تو لوٹ جاؤ اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ اور ان گھروں میں داخل ہونے پر کوئی گناہ نہیں جو خاص کسی کی سکونت نہ ہو اور ان میں تمہاری آسانی ہو۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

پنے گھروں کے سوا غیروں کے گھروں میں نہ جاؤ جب تک اجازت نہ طلب کر لو اور ان کے مکینوں پر سلام نہ کر لو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم خیال رکھو۔ پھر اگر ان میں تم کسی کو نہ پاؤ جب بھی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔ اور اگر تم سے لوٹنے کو کہا جائے تو لوٹ جاؤ اللہ

☆ فاضل مضمون نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے فارغ التحصیل ہیں۔

تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ اور ان گھروں میں داخل ہونے پر کوئی گناہ نہیں جو خاص کسی کی سکونت نہ ہو اور ان میں تمہاری آسانی ہو۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔

مقام ثانی: يا ايها الذين آمنوا ليستاذنكم الذين ملكت ايمانكم والذين لم يبلغوا الحلم منكم ثلاث مرات من قبل صلاة الفجر وحين تضعون ثيابكم من الظهيرة ومن بعد صلاة العشاء ثلاث عورات لكم ليس عليكم ولا عليهم جناح بعد هن طوافون عليكم بعضكم على بعض كذلك يبين الله لكم الآيات والله عليم حكيم (۵۸) وإذا بلغ الأطفال منكم الحلم فليستأذنوا كما استاذن الذين من قبلهم كذلك يبين الله لكم آياته والله عليم حكيم (۵۹)

اے ایمان والو! تمہارے غلام اور نابالغ تین مرتبہ تم سے اجازت لیں (۱) نماز صبح سے پہلے (۲) دوپہر کے وقت (۳) نماز عشا کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لیے حجاب کے ہیں۔ ان تین وقتوں کے علاوہ تم پر اور نہ ہی ان پر کوئی گناہ ہے جو تمہارے یہاں ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ یونہی تمہارے لیے آیتیں بیان کرتا ہے اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔ اور جب لڑکے بالغ ہوجائیں تو وہ بھی اذن طلب کریں، جیسا کہ اس سے پہلے والوں نے اجازت مانگا (جیسا کہ پہلے مقام کی آیتوں میں ذکر کیا گیا کہ آزاد اور بالغ لوگوں پر تمام اوقات میں اجازت طلب کرنا لازم ہے)۔

طلب اذن کی مشروعیت کے اسباب: اسلام نے طلب اذن کو مشروع کیا، اس کے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) چونکہ اسلام ایک صاف ستھرا معاشرہ کی تشکیل دینے آیا تھا جس سے سماج اور معاشرہ میں اخوت و بھائی چارگی کی فضا قائم ہو اور ایک دوسرے کی تعظیم کا دور شروع ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے کچھ حدود متعین کئے جس کے دائرہ میں رہ کر انسان تاج کرامت پہن سکتا ہے ان ہی احکام میں طلب اذن بھی ہیں۔

(۲) دور جاہلیت میں عربوں کی یہ عام عادت تھی کہ جب وہ لوگ کسی کے گھر میں داخل ہوتے تھے تو اہل خانہ سے اجازت لیے بغیر حييتم صباحا حييتم مساء کہتے گھر میں داخل ہوجاتے جبکہ عورتیں ایسی حالت میں ہوتیں کہ انہیں اس حالت میں دیکھنا انسانیت کے خلاف تھا اور ان کی نظر ان پر پڑتی تو عورتوں کو ناگوار گذرتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک انصاریہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ میں اپنے گھر میں ایسی حالت میں ہوتی ہوں کہ میں نہیں چاہتی کہ کوئی شخص مجھے دیکھے حتی کہ میرے والد اور نہ میرے لڑکے، پھر بھی میرے والد گھر میں داخل ہوتے ہیں یہاں تک کہ میرے کمرے میں آجاتے ہیں اور میں اسی حالت میں ہوتی ہوں۔ تو ایسی صورت میں میں کیا کروں؟ تو فوراً حضرت جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مستقل پاکیزہ قانون گھر میں داخل ہونے کے تعلق سے لے کر نازل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے **يا ايها الذين آمنوا لا تدخلوا** ......الخ (تفسیر قرطبی: ج ۱۲، ص ۲۱۳)

(۳) تجارت اللہ رب العزت کی ایک ایسی نعمت ہے جس کی بنیاد پر انسان اپنی معاشی حالات کو صحیح اور جائز طریقے سے کامیاب بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں عرب بھی تجارت کرتے تھے لیکن جب وہ لوگ اپنے ملک کے علاوہ کسی اور ملک میں جاتے تھے تو راستے میں آرام کرنے لیے یا رات گذارنے کے لیے کوئی ایسی مستقل جگہ نہیں ملتی جہاں وہ اپنے آپ کو غیروں کی نظروں سے چھپا سکیں اور ان اسفار میں صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں جس کی وجہ سے انہیں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ رہائشی مکان کے طرح نہیں ہوا کرتے تھے اور نہ ہی لوگ اس میں اپنے گھر کی طرح رہتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیتوں (استئذان لبيوت الخاصة) کے نزول کے بعد عرض کیا کہ جب ہم لوگ شام کی جانب تجارت کی غرض سے جایا کرتے ہیں تو ہمارے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں ہوتی جہاں ہم تنہا رہ سکیں تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی **ليس عليكم جناح أن تدخلوا بيوتا......الخ** (تفسیر قرطبی: ج ۱۲، ص ۲۱۳)

(۴) یہ بات رہی رہائشی اور غیر رہائشی مکانوں میں داخل ہونے کے تعلق سے لیکن اہم مسئلہ ایک ہی گھر کے مکینوں کا ہے کہ ان سے طلب اذن کی کیفیت کیا ہوگی؟ کن وقتوں میں وہ اذن طلب کریں گے؟ اس

تعلق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے ایک غلام کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جس وقت وہ قیلولہ کر رہے تھے تاکہ وہ ان کو بلا کر لائے مگر لڑکا ان کی بارگاہ میں ناگوار حالت میں پہنچا تو آپ نے کہا کہ یا رسول اللہ میں چاہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اجازت طلب کرنے کا حکم دے اور بغیر اذن کے کسی گھر میں داخل ہونے سے منع کرے تو بہتر ہوتا۔ (تفسیر قرطبی: ج ۱۲، ص ۳۰۴)

ایک دوسری روایت میں ذکر کیا گیا کہ اسماء بنت مرثد کے پاس ایک بڑا لڑکا تھا تو وہ ان کے پاس ناپسندیدگی کے حالت میں داخل ہو گیا تو وہ حضور کی بارگاہ میں آئیں اور کہا ہمارے خدام اور ہمارے لڑکے غیر مناسب حالت میں داخل ہوتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ج ۱۲، ص ۳۰۲)

گویا کہ حضرت عمر اور حضرت اسماء بنت مرثد نے اللہ تعالیٰ سے استغاثہ کیا کہ وہ ایک ہی گھر کے مکینوں کے لیے ایسے احکامات اور قوانین نازل فرمائے جس کی وجہ سے گھر کے افراد پر بار نہ پڑے اور اختلاط فاسدہ واقع نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس استدعا کو سن لیا اور یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یاایھا الذین آمنوا لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم...... الخ

طلب اذن کی کیفیت: ۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں پر کرم فرمایا اور ان کے لیے احکامات کو نازل فرما کر آسانیاں کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے اس کی خوب وضاحت فرمائی ،اور اس کے بعد میں ہمارے بزرگوں نے بھی کچھ آداب سکھائے۔ جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہدایات واقوال ہیں۔

(۱) دروازہ پر دستک دینے والے کو چاہئے کہ وہ تین مرتبہ اجازت طلب کرے کیونکہ حضور نے فرمایا إذا استأذن أحدکم ثلاثا فلم یؤذن له فلیرجع ۔ (مسند احمد: مسند ابی موسیٰ اشعری، ج ۴، ص ۴۰۳) جب تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے تو اگر وہ اجازت نہ پائے تو واپس ہو جائے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جب کسی کے یہاں تشریف لے جاتے تو تین مرتبہ اجازت طلب کرتے اور جواب نہ ملنے پر واپس ہو جاتے چنانچہ حضرت قیس بن سعد بن عبادہ نے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے تو فرمایا **السلام علیکم ورحمة الله** تو حضرت سعد نے بہت ہی آہستہ آواز میں جواب دیا تو حضرت قیس فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ کیا آپ رسول پاک کو اجازت نہیں دیں گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ان کو چھوڑ دو تاکہ وہ ہم پر زیادہ سلامتی بھیجیں تو حضور نے پھر کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو حضرت سعد نے پھر آہستگی سے جواب دیا پھر حضور نے فرمایا السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور جواب نہ ملا تو آپ لوٹنے لگے تو حضرت سعد آپ کے پیچھے پیچھے آئے اور کہا یا رسول اللہ میں آپ کے سلام کو سن رہا تھا اور اس کا آہستگی سے جواب بھی دے رہا تھا تاکہ آپ ہم پر زیادہ سلامتی بھیجیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ لوٹ آئے۔ (سنن ابی داود: کتاب الادب، باب کم مرة یسلم الرجل فی الاستئذان، ج ۴، ص ۳۴۷، حدیث: ۵۱۸۵)

تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کی حکمت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ دروازے پر موجود شخص کی خبر ہو جائے۔ دوسری مرتبہ دستک دینے والے کو اجازت دینے یا نہ دینے کے لیے صاحب خانہ تیار ہو جائے۔ تیسری مرتبہ صراحتاً دخول یا عدم دخول کی اجازت دے دے یا دستک دینے والا خود ہی سمجھ جائے کہ ہمیں اجازت نہیں ملی یا گھر میں کوئی نہیں ہے۔

(۲) دستک لگاتار نہ دے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر دے یہاں تک کہ صاحب خانہ اپنے معاملے سے فارغ ہو جائے اور دستک دینے والوں سے ملاقات کے لیے تیار ہو جائے۔

(۳) طلب اذن پر اصرار نہ کرنے یعنی یہ کہ دروازے کو اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک اس کو اجازت نہ مل جائے بلکہ تین مرتبہ اجازت لے اجازت نہ ملنے پر واپس لوٹ جائے۔

(۴) طلب اذن کے وقت دروازے کے سامنے کھڑا نہ ہو بلکہ اس پر ضروری ہے کہ داہنیں یا بائیں جانب کھڑا ہو تاکہ دروازہ کے کھلتے وقت اس کی نظر گھر کے اندر نہ پڑ جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کے گھر پر آتے تو دروازہ کے سامنے نہیں کھڑے ہوتے بلکہ داہنیں جانب یا بائیں جانب رہتے۔

(۵) دستک دینے والے پر لازم ہے کہ جب اس سے پوچھا جائے

کہ کون ہو تو وہ اپنا نام بتائے یہ نہ کہے کہ 'میں' جیسا کہ بہت سارے لوگ کرتے ہیں اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے جواب کو نا پسند فرمایا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو حضور نے فرمایا کون تو میں نے کہا 'میں' تو حضور نے فرمایا "میں میں" گویا کہ آپ نے اس کو ناپسند فرمایا۔

چنانچہ صحابہ کرام کی عادت شریفہ تھی کہ اجازت کے وقت اپنا نام صاف بتاتے جیسا کہ کتب حدیث وسیرت اس پر دال ہیں۔

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا **السلام علیك** یارسول اللہ **السلام علیکم** کیا عمر داخل ہو؟ (کتاب الادب، باب فی الرجل یفارق...... ج ۴/، ص ۳۵۱ حدیث :۵۲۰۱) اسی طریقہ سے حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا السلام علیکم ابوموسیٰ اشعری ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب الاستئذان، ج ۳/ص/ ۱۶۹۶ حدیث: ۲۱۵۴)

رہائشی مکان میں دخول کے آداب:۔ رہائشی مکان تین طرح کے ہوتے ہیں (۱) اجنبی کا مکان (۲) اقارب کا مکان (۳) اور خود اپنا گھر۔ سنت نبویہ نے ان تمام گھروں میں دخول کے آداب کو متعین کر دیا ہے۔ ہم اس کو مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

(۱) اجانب کے مکانات: اللہ تعالیٰ نے طلب اذن کا حکم دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی اور مولیٰ سبحانہ تعالیٰ نے اذن اور منع کا حق صاحب خانہ کو دیا ہے" **وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا**" (اور اگر تم سے کہا جائے لوٹ جاؤ تو تم لوٹ جاؤ)۔

کیونکہ حدیث نے انسان کا حق مقرر کیا کہ وہ اکیلے رہے اور خلوت میں تمام مشروع چیزیں کرے۔ کسی اور کو اس پر اطلاع کا حق نہیں۔ یہاں تک کہ کسی کے خط کے پڑھنے کی بھی اجازت نہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**من نظر فی کتاب أخیه بغیر إذنه فإنما ینظر فی النار**"۔ (سنن ابی داؤد: کتاب الوتر، باب الدعا ج ۲/ ص/ ۸۷ حدیث نمبر: ۱۴۸۵)

اس تعلق سے عدم دخول ہی اصل ہے مگر صاحب خانہ اجازت مرحمت کرے۔

(۲) اقارب کے مکانات: اس میں بھی دخول کے لیے اذن کی ضرورت ہے کیونکہ "**غیر بیوتکم**" میں یہ بھی داخل ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں عطاء بن یسار نے روایت کی ایک شخص نے حضور کہا میں اپنی ماں سے بھی اجازت لوں تو حضور نے فرمایا ہاں، اس شخص نے کہا اگر چہ میں ان کی خدمت بھی کروں پھر بھی اجازت! حضور نے کہا ان سے اجازت لو۔ اس شخص نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا تو حضور نے فرمایا کہا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھو تو اس شخص نے جواب دیا نہیں تو حضور نے فرمایا تم ان سے ہمیشہ اجازت لو۔ (موطا امام مالک، کتاب الاستئذان، باب الاستئذان، ج ۲/ ص/ ۹۶۳ حدیث نمبر ۱۷۲۹)

اسی طرح کی حدیث بہن سے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے (تفسیر طبری، ج ۱۸/ ص/ ۱۱۱) اور عبداللہ ابن مسعود فرمایا کرتے تھے "**علیکم الإذن علی امھاتکم**" ۔تم پر اپنی ماؤں سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ (تفسیر طبری، ج ۱۸/ ص/ ۱۱۲)

(۳) اپنا خاص گھر: اس میں اپنی زوجہ کے علاوہ بہن یا ماں بھی رہتی ہو تو اجازت ضروری ہے جیسا کہ گذرا لیکن اگر صرف بیوی ہی رہتی ہو تو اجازت کی ضرورت نہیں۔

ابن جریج نے عطا سے پوچھا کیا مرد اپنی بیوی سے دخول کی اجازت طلب کرے انہوں نے کہا نہیں مگر یہ چیز عدم وجوب پر محمول ہیں ورنہ مناسب یہ ہے کہ اچانک داخل نہ ہو بلکہ آگاہ کر کے داخل ہو جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کیا کرتے تھے آپ کی زوجہ محترمہ حضرت زینب فرماتی ہیں کہ جب بھی حضرت عبداللہ گھر میں داخل ہوتے تو کھکھارتے ۔کیونکہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ہمیں ایسی حالت میں پائیں جو نہیں اچھا نہ لگے۔ (تفسیر طبری، ج ۱۸/ ص/ ۱۱۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے کہ آپ سفر سے لوٹ کے وقت مدینے سے باہر انتظار کرتے تا کہ عورتوں کو اپنے شوہروں کے آنے کی خبر ہو جائے اور وہ لوگ صاف ستھری ہو کر مزین ہو جائیں۔

غیر رہائشی مکان میں داخل ہونا: غیر رہائشی مکان میں دخول کی اجازت عام ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہاں کوئی ضرورت ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "**لیس علیکم** ......" ہاں اذن عام کے وجہ کسی ناجائز کام کے لیے داخل ہونا ممنوع ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "واللہ یعلم ماتبدون وماتکتمون"۔

یہ اسلامی ادب اور اس کے مقرر کردہ قوانین عام گھروں میں داخل ہونے کے تعلق سے تھے۔لیکن اب حالات کے ساتھ ساتھ لوگ بھی بدل چکے ہیں یعنی یہ مکانات تو ظاہراً نفع عام سمجھے جاتے ہیں لیکن باطن میں فتنہ وفساد کے محور ہوتے ہیں اور یہ اسلامی ممالک میں بھی عام ہو چکا ہے جس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ دن بدن اسلامی تہذیب وتمدن سے دور ہوتا نظر آرہا ہے(العیاذ باللہ)

ایک ہی گھر کے مکینوں کے لیے اذن کی کیفیت:

رہائشی اور غیر رہائشی مکانات میں داخل ہونے کا ذکر ہو چکا ہے مگر ایک ہی گھر کے افراد کے لیے دوسرے کے بیڈروم میں داخل ہوتے وقت اجازت لیں گے یا نہیں خاص کر چھوٹے اور غلام وباندی کیونکہ عام طور پر ان کے لیے اجازت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ آیات کے بعد اس تعلق سے حکم نازل فرمایا۔

اس درمیان تمہید کے طور لوگوں اوامر اور نواہی کے بجالانے کا حکم دیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "إذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینکم ان یقولوا سمعنا واطعنا وأولئك هم المفلحون" (سورہ نور ر۵۱)۔جب تمہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائیں کہ رسول ان میں فیصلہ فرمائے کہ عرض کریں ہم نے سنا اور ہم نے حکم مانا اور یہی لوگ مراد کو پہنچے۔

یہ تمہید اس لیے ہے کہ تا کہ لوگ آنے والے حکم کی پیروی اچھی طرح سے کریں کیونکہ ایک ہی مکیں کے لوگوں کے درمیان اختلاط اور فساد کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔

داخلی امور میں قاعدہ اساسی یہ ہے کہ خدام اور نابالغ بچے بغیر اذن طلب کیے داخل ہوں مگر تین اوقات اور بالغ ہمیشہ اذن طلب کریں۔

بچے اور خدام جو ہمیشہ گھروں میں آتے جاتے رہتے ہیں ان کے لیے خاص حکم ہے مگر تین اوقات میں انہیں بھی اجازت کا حکم دیا گیا۔کیونکہ انسان کے لیے کچھ ایسے اوقات ہونی چاہئے جس میں وہ آزادانہ طور پر زندگی گذار سکے وہ تین وقت یہ ہیں۔

(۱) نماز فجر سے قبل: کیونکہ اس وقت تک آرام کرنے کی عادت عام ہے۔فجر سے کچھ ہی پہلے انسان بیدار ہوتا ہے تو فوراً اپنے چہرہ، ہاتھ اور پیر وغیرہ دھونے کی ضرورت پڑتی ہے پھر اس کے بعد اپنے لباس کو تبدیل کرتا ہے تو اس سے پہلے تک دخول یقیناً مکروہ ہے۔

(۲) نماز عشاء کے بعد: یہ ایسا وقت ہوتا ہے جس میں انسان اپنے ہر کام سے فارغ ہو کر آرام کرنے کی غرض سے اپنے بستر پر جاتا ہے تو عام لباس کو اتار کر رکھ دیتا ہے اور لباس خواب کو پہنتا ہے اور بسا اوقات مجامعت کی جانب بھی راغب ہوتا ہے۔

(۳) قیلولہ کے وقت: یہ انسان کی فطرت ہے کہ دوپہر کا کھانا تناول کرنے کے بعد چند لمحہ آرام کرنے کوشش کرتا ہے جس کو قیلولہ کا نام دیا جاتا ہے اس وقت انسان کس حالت میں اپنے گھر کے اندر آرام کر رہا ہے نہیں معلوم،لیکن اس کے لیے کوئی وقت متعین نہیں بلکہ ظروف کے مطابق وقت میں کمی وزیادتی ہوتی ہے۔

یہ اوقات ثلاثہ ہیں جس میں انسان کو خلوت وتنہائی ہوتی ہے جس میں ممکن ہے کہ اس کے بدن کا کوئی ایسا حصہ کھلا ہوا جس سے اس کو شرم آتی ہے تو ایسے اوقات میں بچے اور غلام کو بھی اجازت طلب کرنی پڑے گی۔

اخیر میں قارئین کو یہ بتلانا چاہوں کہ میرے اس مضمون کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) بالغ اور نابالغ اور غلام کے حکم مختلف ہیں۔بالغ کے لیے ہمہ وقت طلب اذن لازم ہے لیکن نابالغ اور غلام کے لیے مذکورہ اوقات ثلاثہ کے علاوہ اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔

(۲) شوہر کو بیوی کے پاس آنے کے لیے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں جیسا کہ حدیث پاک مذکور ہے باقی تمام اقارب کے لیے اذن لازمی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کے ذریعہ مومن کے گھر کو محفوظ بنا دیا اور فتنہ وفساد سے پاک کرنے کی دوائیں بتائے۔اس وجہ سے غیروں کے لیے ضروری ہے کہ اجازت لے کر ہی داخل ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو سکے اور مومن اپنے گھر میں محفوظ رہ سکیں۔

(جامعۃ الازہر الشریف) عمارہ: ۲۰ الف ۵
مدینۃ البعوث الاسلامیۃ عباسیۃ قاہرہ مصر
Email:shahlalamsiwani@yahoo.com

☆☆☆

حدیث "إنما الأعمال بالنیات" کا سبب ورود...؟

مولانا منظر الاسلام ازہری
اسلاک سینٹر آف ہائی پوائنٹ، نارتھ کیرولینا، امریکہ

بخاری شریف کا درس دینے والے علماء، علم حدیث حاصل کرنے والے طلبہ کے درمیان حدیث "إنما الأعمال بالنيات" کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے بلکہ اس حدیث کی شہرت خواص سے تجاوز کر کے عوام تک پہنچ چکی ہے۔ اسی وجہ سے "أحاديث مشهورة على الألسنة" پر کتاب لکھنے والے محدثین نے اس حدیث کو "مشہور" حدیثوں کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ بخاری شریف کی پہلی حدیث ہونے کی وجہ سے محدثین اور طلبہ بڑی تندہی سے اس حدیث کے گوشوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ عربی، اردو شروحات کا مطالعہ، حاشیہ اور بین السطور میں مرقوم عبارتیں خاص طور پر ان کی دلچسپی کا سبب بنتی ہیں۔ تمام تر مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس حدیث کا "سبب ورود" ایک عورت سے شادی کرنے کی داستان ہے۔ کسی صحابی نے انہیں پیغام نکاح دیا تو عورت نے ہجرت کی شرط پر شادی سے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ جو اللہ ورسول کی رضا کے لئے ہجرت کرے گا تو اس کی ہجرت اللہ ورسول کے لئے ہی ہوگی۔ جس کی ہجرت دنیا کے حصول یا شادی کرنے کے لئے ہوگی اس کی ہجرت کو اسی مقصد کا ہدف قرار دیا جائے گا"۔

کہتے ہیں جس عورت نے یہ شرط رکھی اس کا نام "ام قیس" تھا اسی لئے اس حدیث کا سبب ورود "مہاجر ام قیس" کو قرار دیا گیا۔ ہم اپنی اس تحریر میں حدیث کے دیگر تمام گوشوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اس کے سبب ورود پر ایک تحقیقی نظر ڈالیں گے۔ جس سے یہ واضح ہو سکے گا کہ اس حدیث کا "سبب ورود" "مہاجر ام قیس" کا قصہ نہیں۔

پہلے اس قصہ کو سند کے ساتھ ذکر کر کے یہ جائزہ لیں گے کہ اس میں کس حد تک صداقت ہے:

علامہ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

قصة مهاجر أم قيس رواها سعيد بن منصور قال: أخبرنا أبو معاوية، عن الأعمش، عن شقيق، عن عبد الله هو بن مسعود قال: من هاجر يبتغي شيئا فإنما له ذلك، هاجر رجل ليتزوج امرأة يقال لها أم قيس، فكان يقال له: مهاجر أم قيس (١)

"مہاجر ام قیس" کا قصہ سعید بن منصور نے روایت کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں معاویہ نے بتایا، ان سے اعمش نے بیان کیا، ان سے شقیق نے، انہوں نے عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے بیان کیا کہ جو شخص جس مقصد کے لئے ہجرت کرے گا اس کا ہجرت اسی پر محمول کیا جائے گا، ایک شخص نے "ام قیس" سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کیا تو وہ "مہاجر ام قیس" کے نام سے ہی معروف ہو گیا۔

طبرانی نے بھی اس روایت کو معجم کبیر میں اس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

حدثنا محمد بن علي الصائغ، حدثنا سعيد بن منصور به...(٢)

"ہم سے بیان کیا محمد بن علی صائغ نے، ان سے سعید بن منصور نے"

ابن حجر کہتے ہیں کہ طبرانی نے ایک دوسری سند سے اعمش کے حوالہ سے اس واقعہ کو ذکر کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: كان فينا رجل خطب امرأة يقال لها أم قيس، فابت أن تتزوجه حتى يهاجر فهاجر، فتزوجها، فكنا نسميه "مهاجر أم قيس" (٣)

ہم میں سے ایک شخص نے ایک عورت جس کا نام ام قیس تھا، کو نکاح کا پیغام دیا، عورت نے شادی کے لیے اس شرط پر اپنی رغبت کا اظہار کیا کہ اسے ہجرت کرنا پڑے گا، اس شخص نے ہجرت کیا، پھر شادی کر لی، ہم لوگ اسے "مہاجر ام قیس" کے نام سے پکارنے لگے۔

ابن حجر الإصابة میں رقمطراز ہیں:

٭ فاضل مضمون نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے فارغ التحصیل ہیں

خرج ابن منده، وأبو نعيم من طريق إسماعيل بن عصام بن يزيد قال: وجدت في كتاب جدي يزيد الذي يقال له: حبر، حدثنا سفيان، عن الأعمش، عن أبي وائل، عن بن مسعود قال: كان فينا رجل خطب امرأة يقال لها: أم قيس، فأبت أن تتزوجه حتى يهاجر، فهاجر فتزوجها، فكنا نسميه مهاجر أم قيس، قال بن مسعود: من هاجر لشيء فهو له، قال أبو نعيم: تابعه عبد الملك الذماري عن سفيان. انتهى، وهو يدفع إشارة أبي موسى أنه من أفراد حبر. (۴)

ابن مندہ اور ابونعیم نے اسماعیل بن عصام بن یزید کے طریقہ پر تخریج کی، فرماتے ہیں: میں نے اپنے دادا یزید جس کو ''حبر'' کہا جاتا تھا، کی کتاب میں لکھا دیکھا کہ ہم سے بیان کیا سفیان نے، ان سے بیان کیا اعمش نے، ان سے ابو وائل نے، ان سے ابن مسعود نے، وہ فرماتے ہیں: ہم میں سے ایک شخص نے ایک عورت جس کا نام اُم قیس تھا کو نکاح کا پیغام دیا، اس نے شادی کرنے سے انکار دیا، اس نے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ ہجرت کرلے گا تو وہ شادی کرسکتی ہے، اس شخص نے عورت کی شرط پوری کردی، ہم لوگ اسے ''مہاجر اُم قیس'' کہتے تھے، ابن مسعود کہتے ہیں: جو جس غرض سے ہجرت کرے گا وہی اس کے لئے شمار کیا جائے گا، ابونعیم نے کہا: عبدالملک ذماری نے سفیان کے حوالہ سے اس کی متابعت کی ہے۔

روایت کی اسنادی حیثیت: مہاجر اُم قیس کی مذکورہ تمام روایتیں سند کے اعتبار سے صحیح ہیں، علامہ حافظ مزی نے اس واقعہ کو تہذیب الکمال میں ذکر کرکے فرمایا:

هذا إسناد صحيح (۵)، یہ صحیح سند ہے۔

علامہ ذہبی ''سير أعلام النبلاء'' میں سعید بن منصور کے ترجمہ کے ضمن میں اس قصہ کا ذکر کرکے فرماتے ہیں:

إسناده صحيح (٦)، اس کی اسناد صحیح ہے۔

علامہ ہیثمی ''مجمع'' میں اس روایت کے بعد فرماتے ہیں:

رواه الطبراني في الكبير، ورجاله رجال الصحيح (٧) طبرانی نے اسے معجم کبیر میں بیان کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

علامہ ابن حجر نے فرمایا:

وهذا إسناد على شرط الشيخين (٨) اس روایت کی سند شیخین کی شرط پر ہے۔

جن محدثین نے ''مہاجر اُم قیس'' کے واقعہ کو حدیث ''إنما الأعمال بالنيات'' کا سبب ورود قرار دیا۔ ان میں امام ابن دقیق العید اور امام سیوطی سرفہرست ہیں، علامہ ابن دقیق ہجرت کا نام اور کن چیزوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کا تفصیلی بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: معنى الحديث وحكمه يتناول الجميع غير أن السبب يقتضي أن المراد بالحديث الهجرة من مكة إلى المدينة لأنهم نقلوا أن رجلا هاجر من مكة إلى المدينة لا يريد بذلك فضيلة الهجرة، وإنما هاجر ليتزوج امرأة تسمى أم قيس فسمى مهاجر أم قيس (٩)

حدیث (مذکور) کا معنی اور اس کا حکم ماقبل میں مذکور تمام معنی کو شامل ہے، مگر سبب کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے مراد مکہ سے مدینہ کی ہجرت ہے، کیونکہ علماء سے منقول ہے کہ ایک شخص نے مکہ سے مدینہ کا ہجرت کیا مگر اس نے ہجرت کی فضیلت کا قصد نہیں کیا، وہ ام قیس نامی ایک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اسی لئے اس کا نام ''مہاجر اُم قیس'' پڑ گیا۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

التاسع: شرع بعض المتأخرين من أهل الحديث في تصنيف في أسباب الحديث كما صنف في أسباب النزول للكتاب العزيز فوقفت من ذلك على شيء يسير له، وهذا الحديث على ما ذكرناه من الحكاية عن مهاجر أم قيس واقع على سبب فيدخل في هذا القبيل وتنضم إليه نظائر كثيرة لمن قصد تتبّعه (١٠)

جس طرح قرآن کریم کے اسباب نزول سے متعلق تصنیف کا آغاز ہوا ہے اسی طرح بعض متاخرین اہل حدیث نے اسباب حدیث سے متعلق بھی تصنیف کا سلسلہ شروع کیا ہے، میں ان میں سے کچھ چیزوں پر مطلع بھی ہوا ہوں، یہ حدیث جس کے تحت میں نے مہاجر ام

قیس کا واقعہ نقل کیا ہے وہ حدیث کے سبب کے طور پر ہے، لہذا وہ بھی اسی قبیل میں شمار کیا جائے گا، جو شخص تلاش کرے گا اسے اس کی بہت ساری دوسری مثالیں بھی مل جائیں گی۔

امام سیوطی فرماتے ہیں:

النوع التاسع والثمانون في معرفة أسباب الحديث...ومن أمثلته حديث "إنما الأعمال بالنيات" سببه أن رجلا هاجر من مكة إلى المدينة لا يريد بذلك الهجرة بل ليتزوج امرأة يقال لها : أم قيس، فسمي مهاجر أم قيس(۱۱)

الفیہ میں فرمایا:

مثل حديث إنما الأعمال بسببه فيما رووا وقالوامهاجر لأم قيس كي ينكح من ثم ذكر امرأة فيه صلح(۱۲)

جن علماء نے اس واقعہ کو حدیث "إنما الأعمال بالنيات" کا سبب ماننے سے انکار کیا ہے۔ ان میں علامہ رجب حنبلی، حافظ ابن حجر اور ماضی قریب کے محقق، محدث علامہ احمد محمد شاکر ہیں، علامہ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں:

وقد اشتهر أن قصة مهاجر أم قيس هي كانت سبب قول النبي ﷺ "من كانت هجرته إلى دنيا يصيبها أو امرأة ينكحها" و ذكر ذلك كثير من المتأخرين في كتبهم، ولم نر ذلك أصلا بإسناد يصح..(۱۳)

یہ بات بہت مشہور ہے کہ مہاجر اُم قیس کا واقعہ نبی پاک ﷺ کے اس قول "من كانت هجرته.." کا سبب ہے، بہت سارے متاخرین علماء نے بھی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے، ہمارے نزدیک اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

لكن ليس فيه أن حديث الأعمال سبق بسبب ذلك ، ولم أر في شيء من الطرق ما يقتضي التصريح بذلك(۱۴)

اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے پتہ چلتا ہو کہ حدیث "إنما الأعمال.." کا سبب ورود مہاجر اُم قیس کا ہی واقعہ ہے، کسی طرق میں اس طرح کی کوئی تصریح ہمیں نہیں مل سکی۔

علامہ احمد شاکر نے امام سیوطی کے الفیہ پر تعلیق کے ضمن میں اپنے نظریات کی تصریح حافظ ابن حجر اور علامہ ابن رجب حنبلی کے اقوال کو نقل کر کے کی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے تعليق احمد شاكر علي ألفية(۱۵)

علماء کی ان تصریحات سے سمجھ میں آیا کہ "إنما الأعمال بالنيات.." کے سبب ورود میں اختلاف ہے، بعض دیگر مشہور حدیثوں کی طرح اس کا جو سبب ورود مشہور ہے، در اصل بعض علماء مثلا ابن حجر، ابن رجب وغیرہ اس سے متفق نہیں۔ راقم کے نزدیک بھی یہی تحقیق راجح ہے کہ مذکورہ حدیث کا سبب ورود مہاجر اُم قیس کا واقعہ نہیں کیونکہ مہاجر اُم قیس کا واقعہ جہاں مذکور ہے اس روایت میں کہیں بھی یہ تصریح نہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اسی بنیاد پر اپنا فرمان: إنما الأعمال بالنيات صادر فرمایا تھا۔ مہاجر اُم قیس کا واقعہ درست ہے لیکن وہ اس حدیث کا سبب ورود نہیں، کسی واقعہ کا صحیح ہونا الگ مسئلہ ہے اور اس کا سبب ورود بننا الگ بات ہے۔

مآخذ و مصادر

(۱) فتح الباری، ۱/۱۶، دار المعرفۃ، بیروت
(۲) معجم کبیر، ۹/۱۰۳، مکتبۃ العلوم والحکم، موصل
(۳) فتح الباری ۱/۱۶، دار المعرفۃ، بیروت
(۴) الاصابہ ۱۳/۲۷۰، دار الجیل، بیروت
(۵) تہذیب الکمال ۱۶/۱۲۶، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت
(۶) سیر اعلام النبلاء ۱۰/۵۹۰ مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت
(۷) مجمع الزوائد ۲/۱۰۱، قاہرہ
(۸) فتح الباری ۱/۱۶، دار المعرفۃ، بیروت
(۹) احکام الأحکام شرح عمدۃ الأحکام ۱/۱۱، بیروت
(۱۰) سابق
(۱۱) تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی ۲/۳۲۹، ریاض
(۱۲) الفیۃ الحدیث للسیوطی، قاہرہ
(۱۳) جامع العلوم والحکم ۱/۴۷، دار المعرفۃ، بیروت
(۱۴) فتح الباری ۱/۱۶، دار المعرفۃ، بیروت
(۱۵) شرح الفیہ، ص ۱۸۳، قاہرہ

احادیث متشابہات

ایک تحقیقی مطالعہ

مولانا کوثر امام قادری

تجربات شاہد ہیں کہ استاد جن خوبیوں کا جامع ہوتا ہے لائق فائق، محنتی اور اخاذ طبیعت والے شاگرد پر استاد کی وہ خوبیاں اثرانداز ہوتی ہیں، اور اس کی سیرت وکردار، رفتار وگفتار، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تقریر وخطاب اور کلام وبیان میں استاد کے اثرات واضح طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں نمایاں طور پر ہم اس کو مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ حضور مفتی اعظم کے اندر تحقیق رضا کی تابش، تقوائے رضا کی تابانی، سوز رضا کی جلوہ گری اور تصنیف رضا کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اسی طرح تاج الشریعہ حضور مرشدی اختر رضا خان قادری ازہری کے اندر مفتی اعظم کی سیرت وکردار، طرز تحقیق اور انداز فتویٰ نویسی کا عکس کامل طور پر نظر آتا ہے۔

یہ تو ہوئی عام بشر کی بات اب ہمیں پلٹنا ہے ان استاد وشاگرد کی طرف جن کی کوئی مثال نہیں۔ استاد وہ ہے جو تمام صفات کمالیہ کا جامع اور نور ہی نور ہے اور شاگرد وہ ہے جو اپنے خالق کے نور سے عالم ظہور میں آیا ہے۔ وہ ہے تو بشر مگر نوری بشر۔ استاد ایسا جو اپنے محبوب شاگرد کو سارے عالم سے بے نیاز کر کے خود تعلیم وتربیت بھی دے۔ جمیع ماکان ومایکون کا علم بھی سکھائے اور ساری دنیا کی نگاہوں سے بچا کر کھلائے پلائے بھی۔

شاگرد ایسا کہ اپنی حرکت میں مرضی معلم کا محتاج رہے۔ وہی کرے جو اس کا استاد فرمائے اور وہی بولے جو اس کا معلم چاہے۔ سبحان اللہ!

رسول گرامی وقار ﷺ کا معلم رب ذوالجلال ہے۔ خالق ارض وسما ہے۔ مالک ہفت آسمان ہے۔ اس کے مقدس کلام کا نام ''قرآن کریم'' ہے قرآن ابدی، لافانی اور معجزاتی کلام ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کلمات متشابہات استعمال ہوئے ہیں۔ جب معلم حقیقی نے کلمات متشابہات ارشاد فرمائے تو محبوب شاگرد کے کلام میں بھی کلمات متشابہات کی جلوہ گری ہوئی۔

قرآن مقدس میں پائے جانے والے متشابہات کو آیات متشابہات کا نام دیا جاتا ہے اور حدیث رسول ﷺ میں پائے جانے والے متشابہات کو ''احادیث متشابہات'' کہا جائے گا۔ پیش نظر مضمون میں ہم ان بعض احادیث کا مطالعہ کریں گے جو متشابہات کی ذیل میں آتی ہیں۔ اس سے پہلے متشابہات کی تعریف اور اس کا حکم تفصیل کے ساتھ نذر خدمت ہے۔

قرآن شریف واحادیث کریمہ کے اکثر کلمات ایسے ہیں جن کا معنی مراد ظاہر ومعلوم ہے جنھیں علمی زبان میں ''محکم'' کہا جاتا ہے لیکن کچھ ایسے کلمات بھی ہیں جن کا معنی یا تو لفظ سے ظاہر ہی نہیں جیسے حروف مقطعات یا معنی تو ظاہر ہے مگر اللہ ورسول کی وہ مراد نہیں۔ اگر مفہوم ظاہر کو معنی مراد متعین کیا جائے تو سخت قباحتوں کا سامنا کرنا پڑے اور عقلاً ونقلاً دونوں اعتبار سے باطل قرار پائے۔ اس قسم کے جتنے بھی کلمات قرآن وحدیث میں مذکور ہیں انہیں متشابہات کہا جاتا ہے۔

تعریف: المتشابه فهو اسم لما انقطع رجاء معرفة المراد منه ۱

متشابہ ایسے کلام کا نام ہے جس کی مراد سمجھنے کی امید منقطع ہو چکی ہو اور اس کے ظاہر ہونے کی امید بالکل ہی نہ ہو۔

امید منقطع ہونے کے دو اسباب ہیں: ایک تو یہ کلام مجمل تھا امید تھی کہ سرکار دوعالم ﷺ اس کی وضاحت فرمادیں گے مگر آپ کا وصال ہو گیا اور معنی مراد واضح نہ ہو سکا تو اس عارض کے سبب امید ظہور منقطع ہوئی یا خود سرکار دوعالم ﷺ سے امید ظہور کا منقطع ہونا منقول ہو گیا کیونکہ انسان معنی مراد کے سمجھنے پر قادر نہ تھا بہر حال کلمات کے معنی مراد واضح نہ ہو سکے۔

تعیینِ مراد کی تین شکلیں: اب ایسی صورت میں ان کلمات متشابہ کی تشریح کس طرح کی جائے گی اور اس کے بارے میں کیا نظریہ وخیال رکھا جائے گا تو اس کی تین شکلیں سامنے آتی ہیں۔

اول: لفظ جو باعتبار لغت ظاہر ہو وہی مراد تسلیم کیا جائے۔ یہ اصحاب ظواہر کا مذہب ہے، جو سراسر گمراہی وضلالت کی طرف لے جانے والا ہے۔

دوم: اس میں تاویل کی جائے اور رب تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کے شایان شان جو معنیٰ سمجھ میں آئے وہ مراد متعین کیا جائے۔ یہ علماء متاخرین کا مذہب ہے جو بہتر ومضبوط ہے۔

سوم: ان کلمات کے حق وصدق پر ایمان لایا جائے اور ان کے معنی مراد کو اللہ ورسول کے سپرد کیا جائے یہ سلف صالحین، علماء متقدمین کا مذہب ہے۔ اس میں ایمان کی زیادہ سلامتی ہے اور یہی اسلم واصلح طریقہ ہے۔

حکم متشابہ: حضرت شیخ ملاجیون لکھتے ہیں:

وحكمه اعتقاد أن المراد به حق وإن لم نعلم قبل يوم القيامة وأما بعد القيامة فيصير مكشوفا لكل أحد إن شاء الله وهذا في حق الأمة وأما في حق النبي عليه السلام فكان معلوماً وإلا تبطل فائدة التخاطب ويصير التخاطب بالمهمل كالتكلم بالزنجي مع العربي [۴]

متشابہ کا حکم یہ ہے کہ اس کی مراد حق ہے اگر چہ اس کی مراد ہم کو قیامت سے پہلے معلوم نہیں ہوگی اور قیامت کے بعد اس کی مراد ہر شخص پر منکشف ہو جائے گی لیکن یہ امت کے حق میں ہے۔ نبی ﷺ کو متشابہ کی مراد دنیا میں معلوم ہے ورنہ مخاطب کا فائدہ باطل ہو جائے گا اور مہمل الفاظ کے ساتھ خطاب کرنا ایسے ہوگا جیسے عربی حبشی سے عربی زبان میں بات کرے۔

حضرت ملاجیون کی عبارت سے ایک اور بات معلوم ہوئی کہ متشابہات کا علم رسول اللہ ﷺ کو ہے اور یہی قول علامہ آلوسی کا بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

"جو لوگ اس بات کا قائل نہیں کہ متشابہات کا علم صرف اللہ کو ہے وہ شاید اس کا انکار نہیں کریں گے کہ نبی ﷺ کو وحی کے واسطے سے متشابہات کی تعلیم دی گئی ہے ورنہ اس کا انکار کریں گے کہ وحی کامل کو الہام کے ذریعہ متشابہات کا تفصیلی علم جائز ہے۔ ان کا علم، اللہ کے علم کی طرح محیط نہیں ہوگا اور اگر رسول اللہ ﷺ اور اولیاء کاملین کو تفصیلی علم نہ بھی ہو تو اجمالی علم ضرور ہوگا۔ ان کے لئے اجمالی علم کا انکار وہی کرے گا جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کے اولیاء کاملین کی قدر ومنزلت نہ ہو" [۳]

خموشی میں سلامتی: حضرت امام آلوسی کی نظر میں علماء متقدمین کا مذہب زیادہ سلامتی والا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق جو آیات متشابہات نازل ہوئی ہیں مثلاً استواء، ید، ساق وغیرہ اسی طرح احادیث میں اللہ تعالیٰ کے نزول ضحک اور تعجب کا ذکر ہے۔ ان کے متعلق سلف اور امام اشعری کا مذہب یہ ہے کہ صفات عقل کے ماوراء ثابت ہیں۔ ہم اس کے مکلف ہیں کہ ان کے ثبوت کا اعتقاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جسمیت اور تشبیہ سے پاک ہے تاکہ نقل، عقل کے مخالف نہ ہوا۔ متاخرین نے ان صفات کی تاویل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ استواء سے مراد استیلاء وغلبہ ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اس سے مراد استقرار ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیف غیر معقول ہے اور استواء غیر مجہول ہے۔ اس کا اقرار کرنا ایمان اور اس کا انکار کفر ہے۔" [۴]

امام بیہقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حكينا عن المتقدمين من أصحابنا ترك الكلام في أمثال ذلك هذا مع اعتقادهم نفي الحد والتشبه والتمثيل عن الله سبحانه وتعالىٰ [۵]

ہم اپنے اصحاب متقدمین کا مذہب لکھ چکے کہ ایسے نصوص (کلمات متشابہات) میں اصلاً لب نہ کھولے جائیں اور اس کے ساتھ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ محدود ہونے یا مخلوق سے کسی بات میں مشابہ ومانند ہونے سے پاک ہے۔

امام سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ما وصف الله تعالىٰ من نفسه في كتابه فتفسيره تلاوته والسكوت عليه [۶]

یعنی اس قسم کی جتنی صفتیں اللہ عزوجل نے قرآن عظیم (یا احادیث رسول میں اس کے نبی نے اللہ تعالیٰ کے لئے) میں اپنے لئے بیان فرمائی ہے ان کی تفسیر یہی ہے کہ تلاوت کیجئے اور خاموش رہئے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

ليس لأحد أن يفسره بالعربية ولا الفارسية [7]

کسی کو جائز نہیں کہ عربی میں خواہ فارسی زبان میں اس کے معنیٰ کہے۔

حضرت امام بیہقی فرماتے ہیں:

والآثار عن السلف في مثل هذا كثيرة وعلى هذه الطريقة يدل مذهب الشافعي رضي الله عنه وإليها ذهب أحمد بن حنبل والحسين بن الفضل البلخي ومن المتأخرين أبو سليمان الخطابي [8]

یعنی اس باب میں سلف صالح سے روایات بکثرت ہیں اور اس طریقہ سکوت پر امام شافعی کا مذہب دلالت کرتا ہے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبل، امام حسین بن فضل بلخی اور متاخرین سے امام ابوسلیمان خطابی کا ہے۔

سیدنا امام محمد حنفی تلمیذ امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں:

اتفق الفقهاء كلهم من المشرق إلى المغرب على الإيمان بالقرآن وبالأحاديث التي جاء ت بها الثقات عن رسول الله ﷺ في صفة الرب من غير تشبيه ولا تفسير فمن سر شيئا من ذلك فقد خرج عما كان عليه النبي ﷺ وفارق الجماعة فإنهم لا يصفوا ولم يفسروا ولكن آمنوا بما في الكتاب والسنة ثم سكتوا [9]

مشرق سے غرب تک ائمۂ مجتہدین کا اجتماع ہے کہ آیات قرآن عظیم واحادیث صحیحہ میں جو صفات الٰہیہ آئیں ان پر ایمان لائیں بلا تشبیہ وبلا تفسیر تو جوان میں سے کسی کے معانی بیان کرے تو وہ نبی ﷺ کے طریقے سے خارج ہے اور جماعت علماء سے جدا ہوا اس لئے کہ ائمہ نے ان صفات کا کچھ حال بیان فرمایا نہ ان کے معنیٰ کہے بلکہ قرآن وحدیث پر ایمان لا کر چپ رہے۔

سرکار امام احمد رضا قادری بریلوی فرماتے ہیں:

''صفات متشابہات کے باب میں اہل سنت کا عقیدہ تو معلوم ہو لیا کہ ان میں ہمارا حصہ بس اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو کچھ مراد ہے ہم اس پر ایمان لائے۔ ظاہر لفظ سے جو معنیٰ ہماری سمجھ میں آئے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ یقیناً پاک ہے۔ اور مراد الٰہی پر ہمیں اطلاع نہیں۔ لہٰذا ہم ان کے معنیٰ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ یا بطور تاویل کچھ کہیں بھی تو وہی کہیں گے جو ہمارے رب کی شان قدوسی کے لائق اور آیات محکمات کے مطابق ہے'' [10]

خلاصہ: ☆ جس طرح قرآن کریم میں کلمات متشابہات ہیں اسی طرح حدیث میں بھی کلمات متشابہات ہیں۔

☆ معنیٰ متشابہات کے حق وثابت ہونے پر ایمان لایا جائے اور اس کے مراد کو اللہ ورسول کے سپرد کیا جائے۔

☆ متشابہات کا معنیٰ مراد، رسول اللہ ﷺ کو بطور وحی معلوم ہے اور اولیاء کاملین کے لئے بطور الہام معلوم ہونا جائز ہے۔

☆ تمام مسلمانوں کو بعد قیامت متشابہات کا علم حاصل ہوگا۔

☆ معنیٰ مراد کے بارے میں سکوت کیا جائے۔ اور اگر تاویل کی جائے تو وہی کہا جائے جو شان قدوسی کے لائق اور دیگر آیات محکمات واحادیث صحیحہ کے موافق ہو۔

☆ متشابہات کا ظاہری معنیٰ مراد لینا کفر ہے اور گمراہوں وبدمذہبوں کا شعار ہے۔

وجہ سکوت: کلمات متشابہات کے معنیٰ مراد کے سلسلے میں سکوت کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات کے ظاہر معنیٰ سے باری تعالیٰ جل مجدہ کے لئے جسم، عضو، زمان، مکان، حرکت وغیرہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اور یہ ساری چیزیں مخلوقات کی صفات میں سے ہیں اور حادث ومخلوق ہیں۔ رب ذوالجلال ان تمام صفات سے پاک ومنزہ ہے جو مخلوق کے اندر پائی جاتی ہیں اور ممکن وحادث ہیں۔

قرآن مقدس میں ہے۔

الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا أحد [11]

اللہ بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی۔

قرآن میں ہے۔

ليس كمثله شيء [12] اس جیسا کوئی نہیں۔

قرآن میں ہے۔

هل تعلم له سميا [13] کیا اس کے نام کا دوسرا جانتے ہو؟

قرآن میں ہے۔

ولا يشرك في حكمه أحدا [14] اور وہ اپنے حکم میں کسی کو

شریک نہیں کرتا۔

قرآن میں ہے۔

هل من خالق غير الله يرزقكم من السماء والأرض ۱۵ کیا اللہ کے سوااور بھی کوئی خلق ہے کہ آسمان وزمین سے تمہیں روزی دے۔

قرآن میں ہے۔

ولم يكن له شريك في الملك ۱۶

اوراس کی سلطنت میں کوئی ساجھی نہیں۔

امام ابوعبداللہ حلیمی فرماتے ہیں۔

المتعالي: معناه المرتفع عن أن يجوز عليه مايجوز على المحدثين من الأزواج والأولاد والجوارح والأعضاء، واتخاذالسرير للجلوس عليه ،والاحتجاب بالستور عن أن تنفذ الأبصار إليه ،والانتقال من مكان إلى مكان ونحو ذلك فإن إثبات بعض هذه الأشياء يوجب النهاية وبعضها يوجب الحاجة وبعضها يوجب التغير والاستحالة وشيء من ذلك غير لائق بالقديم ولاجائز عليه ۱۶

یعنی نام الٰہی متعالی کے یہ معنیٰ ہیں کہ اللہ عزوجل اس سے پاک ومنزہ ہے کہ جو باتیں مخلوقات پر روا ہیں جیسے جورو، بیٹا، آلات ،اعضاء، تخت پر بیٹھنا، پردوں میں چھپنا، ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف انتقال کرنا (جس طرح چلنے، چڑھنے ،اترنے ٹھہرنے میں ہوتا ہے) اس پر روا ہوسکیں اس لئے کہ ان میں بعض باتوں سے نہایت لازم آئے گی ،بعض سے احتیاج ،بعض سے بدلنا، متغیر ہونا اوران میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے لائق نہیں نہ اس کے لئے جائز ہے۔

یہی امام دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

إذا قيل لله العزيز فإنمايراد به الاعتراف له بالقِدم الذي لايتهيأ معه تغيره عمالم يزل عليه من القدرة والقوة وذلك عائد إلى تنزيهه تعالىٰ عما يجوز على المصنوعين لأعراضهم بالحدوث في أنفسهم للحوادث أن تصيبهم وتغيرهم ۱۷

جب اللہ تعالیٰ کو عزیز کہا جائے تو اس سے اس کے قدیم ہونے کا اعتراف ہے جس کے بنا پر ازل سے اس کی قدرت وطاقت پر کوئی تغیر نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کی طرف راجع ہے۔ان چیزوں سے جو مخلوق کے لئے ہوسکتی ہیں کیونکہ وہ خود اوران کے حوادث تغیر پاتے ہیں۔

آگاہی: احادیث متشابہات پیش کرنے سے قبل اس کی وضاحت ضروری ہے کہ رب تعالیٰ کے ید، وجہ، عین وغیرہ سے متعلق کتب صحاح میں کثیر احادیث ہیں لیکن بخوف طوالت صرف چند حدیثیں مختصر تشریح کے ساتھ پیش کی جائیں گی اور وہی تشریح وتفصیل بقیہ دوسری احادیث میں بھی جاری ہوں گی۔

صورت کا ذکر: **عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: إذا قاتل أحد كم أخاه فليجتنب الوجه فإن الله تعالىٰ خلق آدم على صورته** ۱۸

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے لڑے تو اس کے چہرے سے اجتناب کرے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔اس حدیث میں ہے کہ حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صورت پر بنایا۔

علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

''بعض علماء اس قسم کی حدیث میں بحث کرنے سے تعرض نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ احادیث حق ہیں۔ان کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں۔یہاں ایسا معنیٰ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔جمہور سلف کا یہی مذہب ہے اوراسی میں زیادہ سلامتی اوراحتیاط ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کے مطابق ان احادیث میں تاویل کرنی چاہئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے مماثل نہیں'' ۱۹

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

''صورت سے یہاں صفت مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو علم، حیات، سمع ، بصر اور دیگر صفات کمالیہ پر پیدا کیا ہے۔اگرچہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے مماثل کوئی چیز نہیں ہے'' ۲۰

آنکھوں کا ذکر: **عن انس رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: مابعث نبي إلا أنذر أمته الأعور الكذاب الا انه أعور وإن ربكم ليس بأعور وإن بين عينيه مكتوب كافر** ۲۱ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر مبعوث ہونے والے نبی نے اپنی امت کو کانا دجال سے ڈرایا۔سن لو! وہ کانا ہے

اور تم لوگوں کا رب کانا نہیں اور دجال کے دونوں آنکھوں کے درمیان ''کافر'' لکھا ہوا ہے۔

اس حدیث میں دجال کے کانا ہونے کا ذکر ہے اور یہ فرمایا گیا کہ تمہارا رب کانا نہیں۔ یعنی انکھیارا ہے اس کی آنکھیں صحیح سالم ہیں گویا اس میں رب تعالیٰ کے لئے آنکھیں ثابت ہیں۔

یہ حدیث بھی احادیث صفات میں سے ہے۔ اس کے حقیقی مراد کو سوائے اللہ ورسول کے کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اس کی تلاوت کریں اور تفسیر بیان کرنے یا معنی مراد کی جستجو سے دور رہیں۔

امام سفیان بن عیینہ نے فرمایا۔

ماوصف اللہ تبارک وتعالیٰ بنفسه في كتابه فقراء ته تفسيره ليس لأحد أن يفسره بالعربية ولا الفارسية [۲۲]

جن وصفوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں خود کو موصوف کیا اس کی تلاوت ہی اس کی تفسیر ہے۔ کسی کے لئے جائز نہیں کہ عربی یا فارسی میں اس کی تفسیر بیان کرے۔

ہاتھوں کا ذکر: **عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ: يطوي الله عزوجل السماوات يوم القيامة ثم يأخذهن بيده اليمنىٰ ثم يقول: أنا الملك أين الجبارون؟ أين المتكبرون ؟ثم يطوي الأرضين بشماله ثم يقول: أنا الملك أين الجبارون؟ أين المتكبرون؟** [۲۳]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آسمانوں کو لپیٹ لے گا پھر ان کو دائیں ہاتھ سے پکڑ کر فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں، جبر کرنے والے کہاں ہیں؟ تکبر کرنے والے کہاں ہیں؟ پھر بائیں ہاتھ سے زمین کو لپیٹ لے گا پھر فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں۔ جبر کرنے والے کہاں ہیں؟ تکبر کرنے والے کہاں ہیں؟ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس کی تشریح میں علامہ نووی فرماتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا جو ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تاویل قدرت کے ساتھ کی گئی ہے۔ قدرت کو ہاتھوں سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ ہمارے افعال ہمارے ہاتھوں سے صادر ہوتے ہیں تاکہ ہم اس کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ اور دائیں و بائیں ہاتھوں کا ذکر کرنا مثال کو مکمل کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ جو چیز مکرم ہو ہم اس کو دائیں ہاتھ سے اٹھاتے ہیں۔ اور جو کم درجہ کی ہو اسے بائیں ہاتھ سے اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے دائیں ہاتھ میں بائیں ہاتھ سے زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ آسمان زمین سے زیادہ بڑے ہیں۔ اس لئے آسمان اٹھانے کی نسبت دائیں ہاتھ کی طرف کی اور زمین اٹھانے کی نسبت بائیں ہاتھ کی طرف کی تاکہ استعارہ مجمل ہو جائے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اس چیز کے ساتھ متصف نہیں ہوتا کہ فلاں چیز اس کے نزدیک ہلکی ہے اور فلاں چیز بھاری ہے۔

اس حدیث کی تشریح میں علامہ ماذری کا یہ مختصر کلام ہے۔

قاضی عیاض نے فرمایا۔

اس حدیث میں تین لفظ ہیں، یطوی (لپیٹنا) یقبض (مٹھی میں لینا) اور یاخذ (پکڑنا) ان تینوں کا معنیٰ جمع کرنا ہے۔ کیونکہ آسمان پھیلائے ہوئے ہیں اور زمین بچھائی ہوئی ہے۔ پھر اس کا مطلب اس زمین کو دوسری زمین کے ساتھ تبدیل کرنا ہے۔ اور نبی ﷺ کا مٹھی کھولنا اور بند کرنا مخلوقات کو مٹھی میں لینے کی تمثیل کے لئے ہے اور اس سے مراد ان کو جمع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ قابض (پکڑنے والا) اور باسط (کھولنے والا) ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ید ہاتھ سے تعبیر کیا ہے اور انسانی عضو اس کی مثال نہیں ہے'' [۲۴]

کلائی کا ذکر: **عن أبي الأحوص عن أبيه رضي الله عنه قال :أتيت رسول الله ﷺ وأنا قشف الهيئة فقال: هل لك من مال؟ قلت نعم، قال من أي المال؟ قلت :من كل من الإبل والخيل والرقيق والغنم قال: فإذا آتاك الله مالا فلير عليك قال وقال رسول الله ﷺ: هل تنتج إبل قومك صحاحا آذانها فتعمد إلى الموسىٰ فتقطع آذانها وتقول هي بحر وتشقها أوتشق جلودها وتقول هي حرم فتحرمها عليك وعلى أهلك ؟ قال: قلت: نعم، فكل ما آتاك الله لك حل وساعد الله أشد من ساعدك وموسىٰ الله أحد من موساك** [۲۵]

حضرت ابوالاحوص رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

انھوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بدحال وتنگدست صورت میں حاضر ہوا، سرکار نے فرمایا: کیا تیرے پاس مال نہیں ہے؟ عرض کیا: ہاں مال ہے، فرمایا: کس قسم کے مال ہیں؟ عرض کیا: ہر طرح کے مال ہیں: اونٹ، گھوڑے، غلام، بکریاں سب ہیں۔ فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے تجھے مال عطا فرمایا ہے تو تیرے بدن پر اس کا اثر ظاہر ہونا چاہئے اور فرمایا: کیا تیری قوم کی اونٹنیاں صحیح ودرست کانوں والے بچے جنتی ہیں پھر تم لوگ استرہ سے ان کے کانوں کو کاٹ دیتے ہو اور کہتے ہو: یہ بحر(کان چھیدا) ہے اور تم لوگ اسے یا اس کے چمڑے کو چیر دیتے ہو اور کہتے ہو: یہ حرام ہے تو تم لوگوں نے اسے اپنے اور اپنے اہل وعیال پر حرام کر لیا ہے؟ عرض کیا ہاں! فرمایا وہ تمام جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا ہے تیرے لئے حلال ہے اور اللہ کی کلائی تیری کلائی سے زیادہ مضبوط ہے اور اللہ کا استرہ تیرے استرہ میں سے ایک ہے۔

یہ حدیث متشابہات میں سے ہے۔ اس میں رب تعالیٰ کے لئے ساعد (کلائی) کا ذکر ہے جس کا حقیقی معنیٰ ومطلب اللہ ورسول ہی جانتے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں نے ساعد کی تاویل کی ہے اور کہا کہ اس کا معنیٰ قدرت وتدبیر ہے۔ چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں۔

قال بعض أهل النظر في قوله :"ساعد اشد من ساعدک"معناه أمره أنفذ من أمرک وقدرته أتم من قدرتک كقولهم: جمعت هذا المال بقوة ساعدي يعنى به رأيه وتدبيره وقدرته فإنما عبر عنه بالساعد للتمثيل لأنه محل القوة [۲۶]

بعض اہل نظر نے اس قول "ساعد اللہ اشد من ساعدک" کے بارے میں کہا کہ اس کا معنیٰ یہ ہے "اس کا حکم تمہارے حکم سے زیادہ نافذ ہونے والا ہے اور اس کی قدرت تمہاری قدرت سے زیادہ مکمل ہے" جیسا کہ ان لوگوں کا قول ہے کہ میں نے اس مال کو اپنی کلائی کی طاقت سے جمع کیا ہے یعنی اسے اپنی رائے، تدبیر اور قدرت سے اکٹھا کیا ہے تو اسے کلائی سے تعبیر کیا تمثیل کے طور پر کیونکہ وہی محل قوت ہے۔

انگلیوں کا ذکر: **عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنه يقول :إنه سمع رسول الله ﷺ يقول :إن قلوب بني آدم كلها بين إصبعين من أصابع الرحمٰن كقلب واحد يصرفه حيث شاء** [۲۷]

حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تمام بنو آدم کے قلوب رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک قلب کی منزل میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے دلوں کو پھیر دیتا ہے۔

اس حدیث میں رب تعالیٰ سبحانہ کی انگلیوں کا ذکر ہے۔ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ نووی فرماتے ہیں۔

''اس کی تشریح میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ بغیر کسی تاویل کے اس بات پر ایمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی انگلیاں ہیں اور اس کی معرفت کے درپے نہ ہوا جائے اور کہا جائے کہ یہ حق ہے اور اس کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لیس کمثله شيءٌ کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں تاویل ہے اور انگلیوں سے مراد قبضہ ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز میری مٹھی میں ہے اور میرے قبضہ میں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا مطلب ہے کہ تمام بنو آدم کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہیں۔ [۲۸]

قدموں کا ذکر: **عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال :تحاجّت النار والجنة فقالت النار: أوثرت بالمتكبرين والمتجبرين وقالت الجنة: فمالي لايدخلني إلا ضعفاء الناس وسقطهم وعجزهم فقال الله للجنة: أنت رحمتي أرحم بک من أشاء من عبادي وقال للنار: أنت عذابي أعذب بک من أشاء من عبادي ولكل واحدة منكم ملؤها فأما النار فلاتمتلئ فيضع قدمه عليها فتقول قط قط فهنا لک تمتلئ ويزوي بعضها إلى بعض** [۲۹]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دوزخ اور جنت میں مباحثہ ہوا۔ دوزخ نے کہا مجھے جباروں اور متکبروں کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے، جنت نے کہا مجھے کیا ہوا ہے کہ مجھ میں صرف ضعیف، لاچار اور عاجز لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے

جنت سے فرمایا: تم میری رحمت ہو۔ میں اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا تمہارے ذریعہ رحمت کروں گا اور دوزخ سے فرمایا: تم میرا عذاب ہو۔ میں اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا تمہارے ذریعہ سے عذاب دوں گا اور تم میں سے ہر ایک کے لئے پُر ہونا ہے۔ لیکن دوزخ نہیں پُر ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر اپنا قدم رکھ دے گا وہ کہے گی ''بس، بس'' اس وقت وہ پُر ہو جائے گی اور اس کا بعض حصہ بعض سے مل جائے گا۔ اس حدیث میں ہے کہ ''دوزخ پُر نہیں ہوگی پھر اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا''

علامہ سعیدی نے اس کی تشریح میں متعدد علما کے اقوال نقل کئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

علامہ نووی نے کہا:

یہ حدیث احادیث صفات میں سے ہے۔ اس میں علما کا اختلاف ہے۔ اس میں دو مذہب ہیں۔

(الف) جمہور سلف صالحین اور متکلمین کی۔ ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ ان الفاظ میں تاویل نہیں کی جائے گی اور یہ الفاظ حق ہیں لیکن ان کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں ہے۔ ان الفاظ کا وہ معنیٰ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ اور قدم، پنڈلی، ہاتھ اور چہرے کے اطلاق سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے ہمارا اس پر ایمان ہے۔

(ب) جمہور متکلمین کا یہ نظریہ ہے کہ ان الفاظ میں مناسب تاویل کی جائے گی وہ کہتے ہیں کہ قدم سے مراد متقدم ہے۔

علامہ ابی مالکی لکھتے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد بعض مخلوق ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس مخلوق کا قدم رکھے گا۔

ایک قول یہ ہے کہ قدم سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قہر کی شدت ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ جہنم کی ذلت سے کنایہ ہے۔ جیسے کہتے ہیں میں نے فلاں کی پشت پر اپنا قدم رکھ دیا۔ اور زیادہ ظاہر قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ قوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔

علامہ خطابی نے کہا۔

اس میں دو تاویلیں ہیں: ایک تاویل یہ ہے کہ جہنم میں قدم رکھنا اس کو ذلیل کرنے سے کنایہ ہے کیونکہ جہنم کافروں اور گنہگاروں کے خلاف سخت غیض وغضب اور جوش میں ہوگی قرآن مجید میں ہے۔

يوم نقول لجهنم هل من مزيد ۳۰

جس دن ہم جہنم سے فرمائیں گے کیا تو بھر گئی اور وہ کہے گی کیا کچھ اور زیادہ ہیں؟

وهي تفور تكاد تميز من الغيظ ۳۱

اور وہ ایسا جوش مار رہی ہوگی کہ (گویا) ابھی شدت غضب سے پھٹ جائے گی۔

گویا کہ وہ غیظ وغضب اور جوش میں حد سے بڑھ رہی ہوگی۔ بعض احادیث میں ہے کہ قریب تھا کہ وہ تمام اہل محشر کو نگل لے۔ تب اللہ تعالیٰ اس کی تیزی اور تندی کو توڑ دے گا جیسے کسی متکبر کو قدموں سے روند کر اس کی تیزی کو توڑا جاتا ہے۔ اس کے ذلیل کرنے کو قدم رکھنے سے تعبیر کیا گیا۔

دوسری تاویل یہ ہے کہ قدم اور پیر ان لوگوں سے کنایہ ہے جن کا دخول جہنم میں متاخر ہوگا کیونکہ جہنمی فوج درفوج جہنم میں داخل ہوں گے اور جہنم کے پہرے داران کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ ان کو جہنمیوں کے ناموں اور ان کے صفات کا علم ہوگا۔ ہر پہرہ دار اپنے متعلقہ گروہ کا منتظر ہوگا اور جب ہر پہرہ دار کے پاس پہنچنے والے آدمی پورے ہو جائیں گے اور ان میں سے کوئی نہیں بچے گا تو پھر کہیں گے ''بس، بس'' یعنی ہمارے اعداد وشمار پورے ہو گئے پھر جہنم جہنمیوں پر سمٹ کر تنگ ہو جائے گی۔ بعد میں داخل ہونے والی جماعت کو قدم سے تعبیر کیا گیا'' ۳۲

پنڈلی کا ذکر: عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه: أن ناساً في زمن رسول الله ﷺ قالوا: يا رسول الله ﷺ: هل نرى ربنا يوم القيامة؟ قال رسول الله ﷺ: نعم، أتاهم رب العالمين في أدنى صورة من التي رأوه فيها قال: فماذا تنتظرون، تتبع كل أمة ما كانت تعبد؟ قالوا: يا ربنا! فارقنا الناس في الدنيا أفقر ما كنا إليهم ولم نصاحبهم فيقول: أنا ربكم فيقولون بالله منك: لا نشرك بالله شيئا مرتين

أو ثلاثا حتی أن بعضهم لیکاد أن ینقلب فیقول: هل بینکم وبینه آیة فتعرفونه بها ؟ فیقولون: نعم، فیکشف عن ساق فلا یبقی من کان یسجد لله من تلقاء نفسه إلا أذن له بالسجود ۳۳؎

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کچھ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہاں" (یہاں پوری تفصیل بیان ہوئی پھر بیان ہوا کہ تمام غیر مسلم جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے اور صرف اللہ کی عبادت کرنے والے اچھے برے بچ رہیں گے) تو اللہ تعالیٰ ان کے پاس ایک ایسی صورت بھیجے گا جس صورت کو دنیا میں وہ کسی نہ کسی وجہ سے جانتے ہوں گے (کہ ان کا یہ رب نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے) پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب تمہیں کس بات کا انتظار ہے؟ ہر گروہ اپنے معبود کے ساتھ جا چکا۔ مسلمان عرض کریں گے اے بار الٰہ! ہم دنیا میں ان لوگوں سے الگ رہے حالانکہ ہم سب سے زیادہ ان کے محتاج تھے اور ہم نے ان لوگوں کا کبھی ساتھ نہ دیا۔ اس صورت سے آواز آئے گی میں تمہارا رب ہوں۔ مسلمان کہیں گے: ہم تم سے اللہ کی پناہ میں آئے ہیں۔ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ مسلمان یہ کلمات دو یا تین بار دہرائیں گے۔ یہ ایسا وقت ہوگا کہ بعض مسلمان کے دل ڈگمگانے لگیں گے پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تمہارے علم میں کوئی نشانی ہے جس سے تم اللہ کو پہچان سکتے ہو؟ مسلمان کہیں گے "ہاں" پھر اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی منکشف فرمائے گا۔ اس منظر کو دیکھ کر جو شخص بھی دنیا میں محض اللہ کے خوف اور اس کی رضا کے لئے سجدہ کرتا ہے اس کو سجدہ کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ سعیدی فرماتے ہیں۔

"اس حدیث کی تشریح کے بارے میں سلف صالحین کا مسلک یہ ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے۔ ہم اس حدیث پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے منشا و مطلب کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف مفوّض کرتے ہیں" ۳۴؎

بعض مشائخ نے کشف ساق یعنی ظہور پنڈلی کی تاویل شدت وکرب سے کی ہے۔ چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں۔

وقد تأوله بعضهم علی معنیٰ قوله "یوم یکشف عن ساق" فروي عن ابن عباس أنه قال: عن شدة و کرب قال أبو سلیمان: فیحتمل أن یکون معنیٰ قوله یوم یکشف ربنا عن ساقه أي عن قدرته التي تنکشف عن الشدة والمعرة ۳۵؎

"حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ علامہ ابن جوزی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: پہلی بار جو صورت نظر آئے گی اس میں قیامت کی ایسی ہولناکیاں نظر آئیں گی جیسی دہشت ناک ہولناکیاں۔ انھوں نے کبھی دنیا میں بھی نہ دیکھی ہوں گی اس لئے وہ کہیں گے کہ ہم اس سے خدا کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس کے بعد جو صورت نظر آئے گی اس میں اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کی تجلیات ہوں گی جن کو دیکھ کر ان کا خوف ودہشت دور ہو جائے گی اور یہی وہ صورت ہے جس کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور مسلمان جب اللہ تعالیٰ کی بے مثال لطف وکرم کی تجلیات دیکھیں گے تو بے اختیار کہہ اٹھیں گے یہی ہمارا رب ہے" ۳۶؎

آسمان پر ہونے کا ذکر: عن معاویة بن حکم رضي الله عنه قال: وکانت لي جاریة ترعی غنما لي قبل أحد والجوانیة فاطلعت ذات یوم فإذا الذئب قد ذهب بشاة من غنمها وانا رجل من بني آدم آسف کما یأسفون لکن أصکها فأتیت رسول الله ﷺ فعظم ذلک عليّ قلت: یا رسول الله ﷺ! أفلا أعتقها ؟ قال: ائتني بها أتیت بها فقال لها: أین الله ؟ قالت: في السماء ، قال: من أنا؟ قالت: أنت رسول الله قال: أعتقها فإنها مؤمنة ۳۷؎

حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ نے کہا: میری ایک لونڈی تھی جو احد اور جوانیہ میں میری بکری چرایا کرتی تھی۔ ایک دن میں وہاں گیا تو دیکھا کہ بھیڑیا ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ میں بھی آخر انسانوں میں سے ایک انسان ہوں اور سب کی طرح مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ میں نے اسے ایک تھپڑ مار دیا پھر مجھے افسوس ہوا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں اس لونڈی

کو آزاد نہ کردوں؟ آپ نے فرمایا: اسے میرے پاس لے کر آؤ۔ میں اسے آپ کے پاس لایا۔ آپ نے اس سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان پر۔ آپ نے فرمایا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا: اللہ کے رسول۔ آپ نے فرمایا: اسے آزاد کردو۔ یہ مومنہ ہے۔

اس حدیث کے ظاہر سے یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ آسمان پر ہے اور آسمان اس کا مکان ہے لیکن یہ مراد لینا سراسر باطل ہے۔

امام بیہقی نے فرمایا۔

إن الله تعالیٰ لا مكان له ولا مركب وإن الحركة والسكون والانتقال والاستقرار من صفات الأجسام والله تعالیٰ أحد صمد ليس كمثله شيء ۳۸

بیشک اللہ تعالیٰ کے لئے نہ مکان ہے نہ کوئی چیز ایسی جس پر سوار ہو اور بیشک حرکت وسکون، ہٹنا اور ٹھہرنا یہ جسم کی صفتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ احد وصمد ہے کوئی چیز اس سے متشابہت نہیں رکھتی۔

امام ترمذی نے فرمایا: استدل بعض أصحابنا في نفي المكان عنه تعالیٰ بقول النبي ﷺ: أنت الظاهر فليس فوقك شيءٌ وأنت الباطن فليس دونك شيءٌ وإذا لم يكن فوقه شيءٌ ولا دونه شيءٌ لم يكن في مكان ۳۹

بعض ائمہ اہل سنت نے اللہ عزوجل سے نفی مکان پر نبی کریم ﷺ کے اس قول سے استدلال کیا کہ اپنے رب عزوجل سے عرض کرتے ہیں تو یہ ظاہر ہے کوئی تجھ سے اوپر نہیں تو ہی باطن ہے کوئی تیرے نیچے نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ سے نہ کوئی اوپر ہوا نہ کوئی نیچے تو اللہ تعالیٰ کسی مکان میں نہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مکان نہیں تو یہ حدیث احادیث صفات میں سے ہوئی۔ اس کے حقیقی مراد کو اللہ تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کے سپرد کیا جائے اور اس کے حق ہونے پر ایمان لایا جائے۔

نزول کا ذکر: عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: إذا مضیٰ شطر الليل أو ثلثه ينزل الله تبارك وتعالیٰ إلی السماء الدنيا فيقول: هل من سائل يعطی؟ هل من داعٍ يستجاب له؟ هل من مستغفر له؟ حتیٰ ينفجر الصبح ۴۰

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب رات کا کچھ یا تہائی حصہ گذرتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے پھر ارشاد ہوتا ہے: ہے کوئی مانگنے والا جسے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی دعا کرنے والا جس کی دعا قبول کی جائے؟ ہے کوئی مغفرت کا طالب جسے بخش دیا جائے؟ یہاں تک صبح ظاہر ہوجاتی ہے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی فرماتے ہیں۔

یہ حدیث احادیث صفات میں سے ہے اس میں دو مذہب مشہور ہیں۔ اول جمہور سلف اور بعض متکلمین کا ہے کہ اس کے حق ہونے پر ایمان لایا جائے۔ اس کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں، وہ معنی مراد ہے جو رب کی شان کے لائق ہے اور اس کی تاویل نہ کی جائے۔

دوم: جو علماء متاخرین کا مذہب ہے کہ اس سے مراد نزول رحمت وملائکہ ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: "فعل السلطان كذا" بادشاہ نے ایسا کیا۔ جب اس کے کارندے اس کے حکم سے کوئی کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

بعض نے یہ تاویل کی کہ اس سے مراد رب تعالیٰ کا لطف وکرم کے ساتھ دعا کرنے والوں کی طرف متوجہ ہونا ہے اور ان کی دعا قبول کرنا ہے۔ ملخصا ۴۱

قریب ہونے کا ذکر: عن أبي هريرة رضي الله عنه قال رسول الله ﷺ: إن الله قال إذا تلقّاني عبدي بشبر تلقّيته بذراع وإذا تلقّاني بذراع تلقّيته بباع وإذا تلقّاني بباع أتيته بأسرع ۴۲

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب بندہ بقدر ایک بالشت میری طرف بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف بقدر ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف بقدر ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں بقدر چار ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف بقدر چار ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوں۔

اس حدیث میں ہے کہ اگر بندہ بقدر ایک بالشت کے قریب ہو تو میں بقدر ایک ہاتھ کے نزدیک ہوتا ہوں اور اگر بندہ چلتا ہوا آئے تو

میں دوڑتا ہوا آتا ہوں۔

یہ حدیث احادیث صفات میں سے ہے اور اس کا ظاہری معنی محال ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ جو شخص عبادت کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے تو میں اپنی توفیق، رحمت اور اعانت کو اس کے قریب کر دیتا ہوں۔ اور وہ جس قدر زیادہ عبادت کرتا ہے اسی قدر زیادہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اس پر اپنی رحمت بہاتا ہوں اور وہ جس قدر قرب حاصل کرتا ہے تو میں اس کی مناسبت سے اس سے زیادہ اجر عطا کرتا ہوں۔ ۴۳

آخری جملہ: آیات متشابہات کے عنوان پر متعدد کتابوں میں مستقل بحثیں نظروں سے گذریں تو مناسب سمجھا کہ احادیث متشابہات پر بھی کچھ ہونا چاہئے۔ یوں تو شارحین حدیث نے کافی تحقیقی بحث کی ہے مگر ان کی کتابوں تک رسائی کم لوگوں کے لئے ممکن ہے۔ اس لئے ان ہی شارحین و محدثین کے منتشر تحقیقات کو یکجا کر کے ایک مستقل اور مختصر بحث پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نورالانوار ۹۷
۲۔ نورالانوار ۹۸
۳۔ روح المعانی ۸۷
۴۔ روح المعانی جلد سوم ۸۷/۸۸
۵۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۹۷
۶۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۱۲
۷۔ کتاب الاسماء والصفات ۲۹۸
۸۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۸۰
۹۔ فتاوی رضویہ جدید جلد ۲۹/ ۱۳۴
۱۰۔ فتاوی رضویہ جدید جلد ۲۹/ ۱۳۷
۱۱۔ قرآن الاخلاص آیت ۲ تا ۴
۱۲۔ قرآن الشوریٰ آیت ۱۱
۱۳۔ قرآن مریم آیت ۶۵
۱۴۔ قرآن کہف آیت ۲۶
۱۵۔ قرآن فاطر آیت ۳
۱۶۔ قرآن فرقان آیت ۲/ کتاب الاسماء ۴۱
۱۷۔ کتاب الاسماء والصفات ۴۱
۱۸۔ مسلم شریف جلد دوم باب نھی عن ضرب الوجہ
۱۹۔ شرح مسلم نووی جلد دوم ۲۴۷
۲۰۔ فتح الباری جلد ۱۱/ ۳
۲۱۔ بخاری جلد دوم باب ذکر الدجال
۲۲۔ کتاب الاسماو الصفات ۲۹۸
۲۳۔ مسلم جلد دوم باب صفۃ القیٰمۃ والجنۃ والنار
۲۴۔ شرح مسلم نووی جلد دوم ۳۷۱
۲۵۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۲۲
۲۶۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۲۲
۲۷۔ مسلم جلد دوم باب تصریف اللہ القلوب کیف شاء
۲۸۔ شرح مسلم نووی جلد دوم ۳۳۵/۳۳۶
۲۹۔ مسلم جلد دوم باب جہنم اعاذنا اللہ عنھا
۳۰۔ قرآن ق آیت ۳۰
۳۱۔ قرآن ملک آیت ۷، ۸
۳۲۔ شرح مسلم سعیدی جلد ۷/ ۶۸۰
۳۳۔ مسلم جلد دوم باب اثبات رویۃ المومنین فی الآخرۃ لربھم
۳۴۔ شرح مسلم سعیدی جلد اول ۷۹۴
۳۵۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۲۵
۳۶۔ شرح مسلم سعیدی جلد اول ۷۹۵
۳۷۔ مسلم جلد اول کتاب المساجد
۳۸۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۱۴
۳۹۔ کتاب الاسماء والصفات ۳۲۳
۴۰۔ مسلم جلد اول ۲۵۸
۴۱۔ شرح مسلم نووی جلد اول ۲۵۸
۴۲۔ مسلم جلد دوم باب الحث علی ذکر اللہ
۴۳۔ شرح مسلم نووی جلد دوم ۳۴۱

☆☆☆

عصرِ حاضر میں مطالعۂ سیرت کی معنویت، اہمیت اور جہت

مولانا اسید الحق عاصم القادری ازہری

سرورِ کائنات ﷺ کی حیات طیبہ ایک نمونۂ عمل ہے۔ قرآن کریم نے اس کو مسلمانوں کے لئے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ یہ لفظ اپنے معنی کی وسعتوں کے اعتبار سے انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اسے زندگی کے کسی ایک شعبے کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح لفظ ''سیرت'' بھی اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ بعض حلقوں میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سیرت یا مطالعۂ سیرت کا صرف یہ مطلب ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کو تاریخی تسلسل اور جغرافیائی پس منظر میں سمجھ لیا جائے۔ آپ کی ولادت کب ہوئی؟ کس طرح آپ کی پرورش ہوئی؟ پہلی وحی کب آئی؟ ابتداء میں کون کون لوگ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے؟ ہجرت کب ہوئی؟ اور اس کے اسباب کیا تھے؟ کون سا غزوہ کس سن میں ہوا؟ اور اس کا نتیجہ کیا رہا؟ آپ کے بعض حسی معجزات، آپ کی بعثت اور دعوت کے نتیجے میں دنیا میں کیا سیاسی، جغرافیائی اور معاشی انقلابات آئے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے امور بھی ''سیرت'' کا حصہ ہیں مگر ''سیرت'' کے معنی اور مفہوم کی حدیں صرف یہیں آ کر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ سیرت کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ سیرت قرآنی تعلیمات کی عملی تصویر کا نام ہے۔ اسلامی عقائد، اسلامی اعمال، اسلامی اخلاق، فرد کا نظام حیات، معاشرے کے مسائل، بین الاقوامی تعلقات و روابط، امن کے تقاضے اور جنگی قوانین وغیرہ یہ سب کے سب سیرت کے موضوعات میں شامل ہیں اور سیرت طیبہ کو اسی وسیع مفہوم میں ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا گیا ہے۔ اگر سیرت پاک صرف واقعات کو تاریخی تسلسل سے بیان کرنے کا نام ہو اور اس میں انسانی ہدایت کے گوشوں پر گفتگو نہ ہو تو پھر وہ ''اسوۂ حسنہ'' یا ''بہترین نمونہ'' کیسے ہوگی؟ تاریخ میں اپنے اپنے میدانوں میں عظیم اور عبقری شخصیات کی سوانح عمری اور سرورِ کائنات ﷺ کی سوانح حیات کو یہی بنیادی نقطہ جدا کر دیتا ہے۔ تاریخ انسانی کی دیگر عظیم شخصیات کی سوانح عمری انسان کی تاریخی معلومات میں اضافے کا سبب بنتی ہے لیکن سرورِ کائنات ﷺ کی مقدس زندگی کا مطالعہ انسان کو آفاقی سعادتوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔ سیرت کے اس وسیع مفہوم کے تناظر میں اگر مطالعۂ سیرت کی معنویت اور اہمیت پر غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں۔

سیرت طیبہ قرآن فہمی کا ایک بنیادی اور ناگزیر ماخذ ہے۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات ایسی ہیں جن کے حقیقی معانی تک رسائی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان آیات سے متعلق سیرت طیبہ کے بعض گوشوں سے پردہ نہ اٹھایا جائے۔ قرآن کریم اور صاحب قرآن میں باہم ایسا رشتہ اور تعلق ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صاحب قرآن کے اخلاق ہی کو قرآن فرمایا ہے۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں مطالعۂ سیرت کی اہمیت اس بات سے بھی اجاگر ہوتی ہے کہ قرآن کی سورتوں کی تقسیم صاحب قرآن کی حیات مبارکہ کے دو مختلف ادوار کے حوالوں سے کی گئی ہے یعنی جو سورتیں زمانۂ قیام مکہ میں نازل ہوئی ہیں ان کو مکی کہا جاتا ہے اور جو سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں ان کو ہم مدنی کہتے ہیں۔

مطالعۂ سیرت کے نتیجے میں انسان اپنے سامنے انسانیت کاملہ کی ایک ایسی اعلیٰ مثال دیکھتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں مکمل نظر آتی ہے۔ آپ انسانی زندگی کے جس پہلو اور جس گوشے کو بھی سامنے رکھ کر

سیرت مبارکہ کا مطالعہ کریں تو ہر پہلو سے انسانی زندگی کا کمال آپ کو سرور کائنات ﷺ کی زندگی میں نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے مشہور اسکالر مائکل ہارٹ نے جب دنیا کے سو عظیم انسانوں پر کتاب لکھی تو عیسائی ہونے کے باوجود اس نے اعلیٰ انسانی اقدار کے حوالے سے سب سے پہلے سرور کائنات ﷺ کا ذکر کیا۔

مطالعۂ سیرت کے نتیجے میں اسلام کے بنیادی عقائد، احکام، اخلاق اور ہر اس چیز کی معرفت ہوتی ہے جس کی ایک مسلمان کو اپنی زندگی میں ضرورت ہے۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی زندگی کو ہمارے لئے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔

انسان کی ہدایت ورہنمائی اور ملتوں اور قوموں کی اصلاح احوال اور تربیت کے لئے ایک داعی، مبلغ، مصلح اور رہنما کو دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کے میدان میں جس جس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے اس کا ایک پورا نصاب سیرت میں موجود ہے۔ دعوت وتبلیغ چونکہ یہ منصب نبوت ورسالت کا حصہ ہے اس لئے اس میدان میں اس وقت تک کامیابی نہیں مل سکتی جب تک دعوت وتبلیغ منہاج نبوی کے مطابق نہ ہو۔ لہٰذا کامیاب تبلیغ ودعوت کے لئے سیرت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مطالعۂ سیرت کی معنویت اور اہمیت کے بعد اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ عصر حاضر میں مطالعۂ سیرت کی جہت کیا ہونا چاہیے۔

آج اسلام کو دہشت گرد مذہب کے طور پر دیکھا جا رہا ہے اور (معاذ اللہ) رسول اسلام ﷺ پر دہشت گردی کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ اسامہ کو اس کے حالات نے دہشت گرد نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو اس کے مذہب اور اس کے رسول کی تعلیمات نے آتنک وادی بنایا ہے۔ ان حالات میں مطالعۂ سیرت کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے لیکن آج مطالعۂ سیرت کی جہت ذرا مختلف ہونا چاہیے۔ جہاں تک سرور کائنات ﷺ پر (معاذ اللہ) دہشت گردی کے الزام کا سوال ہے تو یہ ان مستشرقین کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے جن کے دلوں میں اسلام اور رسول اسلام ﷺ کی طرف سے بغض وعناد بھرا ہوا تھا۔ مگر اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خود ہم نے عملی طور پر دنیا کے سامنے اپنے مذہب اور اپنے رسول کو کس طرح پیش کیا ہے؟ شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو کہ سیرت طیبہ پر جو سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے اس کا نام ''مغازیٔ رسول'' ہے یعنی حضور کے جنگی کارنامے۔ ہمارے یہاں بارہ ربیع الاول کے جلوس میں دو داڑھی والے حضرات عربی لباس میں ملبوس ہاتھ میں (لکڑی کی) تلواریں لئے ہوئے جلوس کے آگے آگے چلتے ہیں۔ ممکن ہے یہ منظر اور جگہ بھی دیکھنے کو ملتا ہو۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر پیغمبر امن وسلامتی کے جشن ولادت کے موقع پر ہم ہاتھ میں تلوار لے کر کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ حالانکہ اگر اعلان نبوت سے لے کر آپ کے وصال تک کی ۲۳ سالہ زندگی کو مختلف کاموں پر تقسیم کر کے دیکھا جائے تو بڑے حیرت انگیز انکشافات ہوں گے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ نے جتنے غزوات میں شرکت فرمائی اگر ان سب کو جمع کر کے ان کے گھنٹے اور دن بنا لئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان ۲۳ برسوں میں صرف چھ ماہ ایسے ہیں جن میں آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ گویا ساڑھے بائیس سال میں آپ یا تو لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف فرمارہے ہیں یا پھر غریبوں اور مسکینوں کو مال تقسیم فرمارہے ہیں یا لوگوں کے درمیان مساوات قائم فرمارہے ہیں۔ کبھی غلاموں، مزدوروں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک فرمارہے ہیں اور اپنے صحابہ کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم فرمارہے ہیں، کبھی آپ عورتوں اور بیواؤں کے حقوق کے سلسلہ میں لوگوں کو متنبہ فرمارہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر آپ ان ٦ ماہ (جن میں حضور ﷺ کے ہاتھ میں تلوار ہے) سے ان ساڑھے بائیس سال کا موازنہ کریں تو ایک نئی دنیا کی سیر ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ان چھ مہینوں میں بھی آپ نے لوگوں کو ظلم وزیادتی سے بچانے کے لئے اور فتنہ وفساد رفع کر کے امن کے قیام کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔ آج کے بدلتے ہوئے حالات میں ضرورت ہے کہ سیرت طیبہ کے ان ساڑھے بائیس برسوں کو زیادہ سے

زیادہ اجاگر کیا جائے۔ سیرت طیبہ سے متعلق ہمارے خطابات ہوں یا مضامین ومقالات ان میں عموماً حضور اکرم ﷺ کے معجزات یا آخرت میں آپ کی شفاعت اور اللہ کے نزدیک آپ کے مقام رفیع کا بیان ہماری توجہ کا مرکز ہوا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان امور کے بیان سے ہمارے ایمان بالرسول میں تازگی اور پختگی کا سامان ہوتا مگر ساتھ ہی ہمیں آج کے بدلتے حالات میں زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے سیرت طیبہ کے ان گوشوں پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے جن میں فرد کی اصلاح اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کی سمت سفر کا آغاز کیا جاسکے۔ آج مطالعۂ سیرت کی جہت کے تعین میں حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے ان گوشوں کو تحریراً، تقریراً اور عملاً سامنے لانے کی ضرورت ہے جن کا براہ راست تعلق انسان کی ہدایت ورہنمائی سے ہے۔ آپ کا اخلاق، صبر ورضا، قناعت وتوکل، دشمنوں سے آپکا حسن سلوک، مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ انسانوں پر آپ کی شفقت ونوازش، غیر مسلموں کے ساتھ آپ کا حسن معاملہ وغیرہ تاکہ ایک طرف تو ہم اپنی قوم کے افراد کے لئے آپ کی زندگی کو ''اسوۂ حسنہ'' یا ''بہترین نمونے'' کے طور پر پیش کرسکیں جس پر عمل کرکے ہم اعلیٰ انسانی اقدار سے متصف ہوکر ابدی سعادتوں سے بہرہ مند ہوں اور دوسری طرف ہم دوسری اقوام کے سامنے اپنے رسول کا صحیح تعارف کرواسکیں جس سے اسلام کی دعوت اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کے راستے ہموار ہوں۔ آج اسلام دشمن میڈیا کی طرف سے یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو صرف دو چیزیں دی ہیں: ایک تلوار اور دوسری چار شادیوں کی اجازت۔ اس مکروہ پروپگنڈے کے جواب میں ہمیں مثبت طریقوں سے غیر مسلموں تک سیرت طیبہ کے اخلاقی، روحانی، اور آفاقی پہلوؤں کو پہنچانے کی ضرورت ہے۔

جب ہم مطالعۂ سیرت کا آغاز کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم غار حرا میں اللہ کے اولین پیغام کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد کے واقعات کو ہم سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر اسی واقعاتی تسلسل میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ جب آپ غار حرا سے اپنے کاشانۂ اقدس میں واپس تشریف لائے اور آپ نے اپنی شریک حیات سیدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پورا واقعہ بیان کرکے فرمایا کہ خدیجہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟ اس کے جواب میں آپ کی زوجہ محترمہ نے جن الفاظ میں آپ کو تسلی دی وہ خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ آپ نے فرمایا ''نہیں، آپ کو ڈر کس بات کا؟ میں دیکھتی ہوں کہ آپ اقرباء پر شفقت فرماتے ہیں، سچ بولتے ہیں، یتیموں اور بے کسوں کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں اور مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتے ہیں خدا آپ کو کبھی رنجیدہ نہ فرمائے گا''۔

حضرت خدیجہ کے ان کلمات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ کی بیوی کو آپ کی شخصیت میں جو سب سے اہم بات نظر آئی وہ یہ نہیں تھی کہ آپ بہت طاقتور، بہادر اور جنگجو ہیں لہٰذا آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو گزشتہ ۱۵ سالہ رفاقت کے دوران حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں سب سے نمایاں انسانی ہمدردی، دردمندی اور مخلوق خدا کی دستگیری کے پہلو نظر آئے اور ایسا کیوں نہ ہو؟ کیونکہ آپ کی ۶۳ سالہ ظاہری حیات مبارکہ کا یہی غالب پہلو ہے جس کی جلوہ نمائی ان ۶۳ برسوں میں صبح وشام نظر آتی ہے۔ ہم جب خوارق عادات کی بات کرتے ہیں تو سیرت کے اس پہلو کو فراموش کردیتے ہیں کہ جود وسخا کے سلسلہ میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ دن بھر میں جو کچھ بھی دنیاوی مال ومتاع آپ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا اس سب کو آپ اس دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ یہ بات چاہے معجزے کی اصطلاحی تعریف کے تحت نہ آتی ہو مگر کیا یہ کسی معجزے سے کم ہے؟

عصر حاضر میں مطالعۂ سیرت کی اسی جہت کو مدنظر رکھنا نہ صرف یہ کہ آج وقت کی ضرورت ہے بلکہ ہماری اور پوری انسانیت کی ضرورت ہے کیونکہ ہماری اور پوری انسانیت کی کامیابی اور فلاح کی ضمانت اسی سرچشمۂ ہدایت میں مضمر ہے۔ ☆☆☆

کلام مصطفی ﷺ کا اعجاز
فصاحت وبلاغت

مولانا انوار احمد خان بغدادی

فصاحت وبلاغت کی تعریف

وتوضیح: فلسفہ ومنطق سے متاثر بلاغت کی کتابوں نے فصاحت وبلاغت کی تعریف وتطبیق میں تکلف سے کام لیا ہے جو خود فصاحت کی روح کے خلاف ہے اس لئے ہم یہاں پیچیدہ اور لایعنی مباحث کو نظر انداز کرتے ہوئے مختصراً اتنا عرض کرتے ہیں کہ فصاحت ظہور وبیان کا نام ہے، مخارج واصوات کے اعتبار سے حروف کے درمیان حسن انسجام کا نام ہے، فصاحت سلاست وروانی کو کہتے ہیں، مضمون کی بلندی، خیال کی برتری، اسلوب وبیان کی دلکشی ہی فصاحت کی روح ہوتی ہے، کلام فصیح کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ سادہ سلیس آسان اور سریع الفہم ہوتا ہے، سننے والوں کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہے اس کے الفاظ نہ تو مشکل ہوتے ہیں اور نہ ثقیل، نہ تو غیر مانوس ہوتے ہیں اور نہ ہی بازاری، بولنے والے کو اس کے ادا کرنے میں نہ تو دشواری محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی سننے والے کو الجھن، گویا دریا کا بہتا پانی ہے جس میں صوتی وسماعی الائش کے وجود کا تصور ہی نہیں اور جس کی شفافیت ہی اغلاق وتعقید کے منافی ہے۔ جبکہ کلام بلیغ فصاحت کی خوبیوں کو متضمن ہونے کے علاوہ اپنے مقصود ومدعا کے لحاظ سے بالکل عیاں اور مقتضائے حال کے مطابق ہوتا ہے اس میں کہیں سے نہ کوئی جھول ہوتی ہے اور نہ کوئی گوشہ مخفی ومستور ہوتا ہے، تخیلات بعیدہ حشو وزوائد اور غیر ضروری محذوفات سے پاک اور تاثیری خوبیوں کا جامع کلام ہی بلیغ ہوتا ہے۔

رحمۃ للعالمین أفصح العرب تھے:

ایک نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ فصیح اللسان اور بلیغ الکلام ہوتا کہ اللہ تعالی کے پیغام کو لوگوں تک کما حقہ پہونچا سکے اور لوگ اس کی فصاحت بیانی سے متاثر ہوکر پیغام الٰہی کو قبول کریں۔ اللہ تعالی فرماتا ہے: (وعظهم وقل لهم في أنفسهم قولا بليغا) (سورہ النساء ۴/۶۳) "انہیں ایسا وعظ ونصیحت فرمائیے جو ان کے دلوں میں اتر جائے"

بقول علامہ راغب اصفہانی قول بلیغ کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ کلام بذاتہ فصیح وبلیغ ہو جس کے اندر تین اوصاف جمع ہوتے ہیں (۱) لغوی لحاظ سے کلام درست ہو (۲) معنی مقصود سے مطابقت رکھتا ہو (۳) کلام بذاتہ صحیح وصادق ہو۔ قول بلیغ کی دوسری قسم یہ ہے کہ بات کہنے والا بھی بلیغ ہو اور مخاطب پر اس کا اثر بھی ہو تو کلام بلیغ کہلائے گا۔

رسول اکرم ﷺ کو جس قول بلیغ کا حکم ہے اس میں یہ دونوں قسمیں شامل ہیں (البیان والتبیین ۲/۲۸)

بتقاضائے نبوت آپ ﷺ کے اندر فصاحت وبلاغت کا عنصر موجود تھا اور خاتم النبیین وافضل الرسل کی حیثیت سے آپ ﷺ کے اندر یہ عنصر بدرجہ اتم اور اکمل تھا اور جیسے کہ آپ ﷺ کا نہ کوئی سایہ تھا اور نہ ہی کوئی آپ کا ہم مثل، اسی طرح آپ ﷺ کی فصاحت وبلاغت بھی بے مثال تھی۔ آپ کے جیسا فصیح وبلیغ کلام کوئی عربی بھی کبھی پیش نہ کرسکا۔ آپ علی الاطلاق افصح العرب تھے۔ تحدیث نعمت کے طور پر آپ ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں: (انا افصح العرب بيد اني من قريش) "میں عربوں میں سب سے فصیح ہوں مگر (اس پر مستزاد یہ کہ) میں قریش سے ہوں"

صحابہ کرام آپ کی فصاحت کی گواہی دیتے ہوئے کہتے ہیں: (ما رأينا الذي هو منك افصح) "ہم نے کبھی آپ سے بڑھ کر فصیح وبلیغ نہیں دیکھا"

آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: (وما منعني من ذلك فانما انزل القرآن بلسان عربي مبين) (دیکھیے

الشفاء ۱/۷۷ اور قالی کی امالی ۱/۸) ''میری فصاحت میں کیا چیز مانع آسکتی ہے، قرآن مجید تو میری زبان میں نازل ہوا ہے جو لسان عربی مبین ہے''۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار رسول اکرم ﷺ سے پوچھا: (لقد طفتُ في العرب وسمعت فصحائهم فما سمعت أفصح منک فمن أدّبک؟) ''یارسول اللہ! میں نے پورے عرب کا دورہ کیا اور ان کے فصحاء کو سنا مگر آپ سا فصیح کسی کو نہ پایا۔ آپ کو یہ ادب کسی نے سکھایا ہے؟) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (أدبني ربي فأحسن تاديبي) (الجامع الصغیر للسیوطی: ۱/۴۲) ''مجھے تو میرے رب نے ادب سکھایا ہے اور کیا خوب ادب سکھایا ہے''

اسی لئے اعلی حضرت ارشاد فرماتے ہیں:

ترے آگے یوں ہیں دبے لچے فصحاء عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منھ میں زبان نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

فصاحت نبوی کے عناصر ترکیبی: مذکورہ بالا تصریحات واعترافات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ افصح العرب تھے۔ لیکن وہ فصاحت جس نے عرب جیسی فصیح و بلیغ قوم کو ما ندکر دیا ہو اس کے عناصر ترکیبی کیا ہو سکتے ہیں؟

تو اس کا جواب سماجی، نفسیاتی اور ظاہری عوامل واسباب پر نظر ڈالنے کے بعد مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں ملتا ہے:

۱۔ قرآن کریم کا آپ پر اترنا
۲۔ بنو زہرہ میں آپ کی ننہیال
۳۔ سعد بن بکر میں آپ کی رضاعت
۴۔ قریش میں آپ کی نشونما
۵۔ بنو اسد میں آپ کی پہلی شادی
۶۔ بنو عمرو (اوس وخزرج) کی طرف آپ کی ہجرت

عرب کے یہ وہ قبائل ہیں جن کی فصاحت وبیان پر تمام راویوں کا اتفاق ہے۔ اس لئے ان قبائل میں آپ ﷺ کی نشو ونما ایسا بنیادی نقطہ ہے جہاں سماجی احتکاک سے پیدا ہونے والے اثرات کو نظر انداز کرنا علمی حقیقت کے خلاف ہوگا ساتھ ساتھ انہیں عوامل واسباب کو فصاحت نبوی کا اہم اور بنیادی عنصر گردانا بھی واقعیت کی خلاف ورزی ہوگی کیونکہ یہ اسباب رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اوروں کو بھی فراہم تھے اس کے باوجود آپ جیسا فصیح و بلیغ نہ تو کوئی قریش میں پیدا ہوا اور نہ ہی عرب کے دوسرے قبائل میں، اس لئے یہ ماننا ہوگا کہ فصاحت نبوی کا بنیادی عنصر سماجی احتکاک نہیں ہے بلکہ الہام وتوقیف ہے، عطیۂ ربانی اور مقتضائے نبوت ہے جس کے متعدد شواہد قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (وما ينطق عن الهوى إن هو إلا وحي يوحى) (سورۃ نجم ۳/۴) ''وہ (محبوب) اپنی خواہش سے تو بات ہی نہیں کرتے۔ ان کی ہر بات وحی خدا ہوتی ہے''

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (وعلّمک ما لم تکن تعلم وکان فضل الله عليک عظيما) (سورۃ نساء ۴/۱۱۳) ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو آپ نہیں جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر بڑا فضل ہے''۔

جس کی شان یہ ہو کہ اپنی خواہش سے بات نہ کرے بلکہ اس کی ہر بات وحی خدا ہو۔ جس کا معلم ومربی خود خدائے وحدہ لاشریک ہو۔ جس کا طریقۂ تعلیم وحی والہام ہو۔ بھلا اس ذات والا پر علم وادب کا کوئی گوشہ مخفی رہ سکتا ہے؟ اس کے کلام کی فصاحت وبلاغت کا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟! ہر گز نہیں! بلا شک وشبہ وہ منفرد بے مثال کلام مصطفی جو بذات خود معیار فصاحت وبلاغت ہے، اس میں کسی نقص کا تصور ہی نہیں۔ وہ فی نفسہ کامل بلکہ اکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت کا عکاس ہے۔ وہ روانی وبرجستگی، سلاست وشگفتگی، پرکاری وسادگی، ادب وانشاء کی لطافت ورعنائی اور حسن تعبیر واداء کی جمالیاتی خوبیوں کا مظہر ہے۔ ایک ایسا کلام جس کی کہیں نظیر نہیں ملتی، جس کی فصاحت کو کبھی گرھن نہیں لگتا جس کا لسانی بانکپن کبھی مضمحل نہیں ہوتا اور جس کی چاشنی زمانے کے تغیرات سے کبھی متاثر نہیں ہوتی، زمانہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا مگر زبان ایسی، گویا عصر حاضر ہی کا ادبی نمونہ ہو۔ یہ شان الہام وتوقیف ہے یہ معجزۂ رسالت ہے کیونکہ کلام متکلم کی صفت ہے اور متکلم وہ صاحب ستودہ صفات عظیم المرتبت ذات ہے جس کے بارے میں امام احمد رضا خان یوں نغمہ سنجی فرماتے ہیں۔

اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ

قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

کلام نبوی کے خصائص: قرآن کریم کے بعد سب سے ارفع واعلیٰ کلام کلام مصطفیٰ ﷺ ہے جس کے خصائص وکمالات بیشار ہیں۔ برائے تمثیل وتوضیح چند خصائص درج ذیل ہیں:

آپ ﷺ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی وضاحت وبیان ہے جو بالکل عیاں ہے یوں تو فصاحت کا مطلب ہی وضاحت وبیان ہوتا ہے اور چونکہ آپ ﷺ کا کلام فصاحت کا اعلیٰ نمونہ تھا اس لئے وضاحت آپ کے کلام کالازمی عنصر تھا اسی لئے آپ ﷺ ایک ہی بات کو تین بار دہراتے تا کہ ہر شخص کے لئے مدعائے نبوت واضح ہو جائے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کے واضح اور صاف وشفاف نطق گویائی کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتی ہیں: (ما کان رسول اللہ ﷺ یسرد کسردکم ھذا ولکن کان یتکلم بین فصل یحفظہ من جلس إلیہ) (دیکھیے: علامہ غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین: ۲/۲۷۴) ''رسول اللہ ﷺ یونہی باتوں میں نہیں لگے رہتے جس طرح تم لوگ باتیں کرتے چلے جاتے ہو بلکہ آپ ایسے واضح انداز میں گفتگو فرماتے کہ آپ کے پاس بیٹھنے والا حفظ کر لیتا تھا''۔

قاضی عیاض علیہ الرحمۃ نے شفاء شریف میں حضرت ام معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول نقل کیا ہے جس سے آپ ﷺ کے انداز بیان کی شیرینی اور فصاحت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ فرماتی ہیں: (کان حلو المنطق، فصل لا نزر، ولا ھزر، کان منطقہ خرزات نظمن، و کان جھیر الصوت، حسن النغمۃ)

''آپ ﷺ کی زبان میں شیرینی تھی۔ آپ ہر بات واضح طور پر بیان فرماتے، نہ قلیل الکلام تھے اور نہ کثیر الکلام، آپ کی بات لڑی میں پروئی ہوئی موتیوں کے مانند ہوتی، آپ کی آواز میں بلندی اور نغمگی پائی جاتی تھی''

حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے حلیہ شریف کے متعلق ہند بن ابی ہالہ سے پوچھا تو انہوں نے بیان کیا کہ: (کان رسول اللہ ﷺ فخما مفخما یتلألأ وجھہ تلألأ القمر في لیلۃ البدر... ولا یتکلم في غیر حاجۃ، طویل السکوت یفتتح الکلام ویختمہ باشداقہ ویتکلم بجوامع الکلم فضلا، لا فضول فیہ ولا تقصیر) (رواہ الشیخان۔ دیکھیے رافعی کی کتاب اعجاز القرآن والبلاغۃ النبیۃ، ص: ۲۰۳) ''رسول اللہ ﷺ صاحب ہیبت وجلال تھے، آپ کا چہرۂ مبارک چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکدار تھا... آپ بلاضرورت گفتگو نہیں فرماتے تھے، خاموش طبیعت تھے۔ جب گفتگو فرماتے تو افراط وتفریط سے پاک، واضح صاف اور جامع گفتگو فرماتے'' عربی زبان وادب کے نامور ادیب ونقاد جاحظ نے فصاحت نبوی ﷺ کے خصائص وکمالات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، چانچہ وہ کہتے ہیں: ''کلام نبوی ایک ایسا کلام ہے جس کے حروف کی تعداد کم اور معانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، یہ تصنع سے بلند تر اور تکلف سے پاک ہے، یہ کلام تو بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اے محمد ﷺ کہہ دیجئے کہ میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں'' بھلا کیوں نہ ایسا ہوتا جبکہ آپ نے باچھیں پھاڑ کر بات کرنے کو معیوب قرار دیا ہے۔ اور گلے کی گہرائی سے آواز نکالنے والوں سے کنارہ کشی کی ہے۔ جہاں بسط وتفصیل کا موقع ہوتا وہاں آپ شرح وبسط سے کام لیتے اور جہاں اختصار کا مقام ہوتا وہاں مختصر بات ہی کرتے۔ اجنبی، نامانوس، ردی اور بازاری الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے آپ کا کلام کیا تھا سراپا حکمت ودانش کی میراث تھی آپ کے کلام کو حفاظت خداوندی اپنے جلو میں لیے ہوئے تھی۔ اس کلام کو تائید اور توفیق ربانی حاصل تھی یہ کلام ایک ایسا کلام ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی رنگت نکھار دی ہے اور اسے شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ اس میں ہیبت ووقار کے ساتھ حلاوت وشیرینی اور حسن افہام کے ساتھ قلت کلمات ایک ساتھ نظر آئے گی۔ یہ کلام دہرانے یا اعادہ کرنے سے مستغنی ہے، اسے سننے والا بار بار دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کلام میں سے نہ تو کوئی لفظ ساقط نظر آتا ہے اور نہ اس میں کوئی لغزش پا نظر آتی ہے۔ نہ تو اس کی حجت باطل ہوئی نہ اس کے مقابلے میں کوئی دشمن ٹھہرا اور نہ اسے کوئی خطیب لاجواب کر سکا۔ بلکہ طویل خطبات مختصر جملوں سے برتری حاصل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ کلام دشمن کی جانی ہوئی چیز ہی سے لاجواب کرتا ہے (اس کلا

میں دشمن کو کسی ایسی بات سے لاجواب نہیں کرتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اس کی دلیل سراپا صدق ہے۔ اس کی کامیابی کا راز صرف حق ہے۔ اس میں نہ تو لطافت کلام سے دھوکہ دینے کی کوشش نظر آتی ہے اور نہ تو ست روی ہے اور نہ ہی جلد بازی۔ اس میں نہ تو اسہاب ہے اور نہ ہی حصر۔ پھر یہ بھی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کے علاوہ کوئی ایسا کلام کبھی نہیں سنا جو اس قدر زیادہ نفع بخش ہو، لفظی لحاظ سے اس قدر معتدل، توازن میں اس قدر کامل اور نظم کے اعتبار سے اس قدر حسین وجمیل، مقاصد کے لحاظ سے اتنا محترم، اثر میں اتنا خوبصورت، ادائیگی میں اس قدر آسان کہ معنی کو کھول کر بیان کرتا ہو اور جس میں مدعا اس قدر واضح کیا گیا ہو"

(البیان والتبیین ۲/۱۶/۱۸)

رسول اکرم ﷺ کے کلام کی یہ خوبیاں ایک ایسے نامور ادیب ونقاد وصاحب طرز انشاء پرداز، زبان وبیان کے اسرار ورموز سے واقف اس کے نشیب وفراز کے عالم، قادر الاسلوب فنکار کے قلم سے منصۂ شہود پر بطور اعتراف حقیقت نمودار ہوئی ہیں جن میں مبالغہ کا تصور ہی نہیں، جاحظ خود لکھتے ہیں:

"ہوسکتا ہے کہ کچھ ایسے لوگ جنہیں وسعت علم حاصل نہ ہو اور نہ ہی انہیں کلام کے نشیب وفراز کا اندازہ ہو، وہ گمان کریں کہ ہم نے کلام رسول ﷺ کے تعلق سے تعریف وتوصیف میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور ان کے کلام کو بنا سنوار کے پیش کیا ہے تو ایسا ہرگز نہیں ہے! قسم اس ذات اقدس کی جس نے علماء پر مبالغۂ بے جا کو حرام قرار دیا ہے اور حکماء کے لیے تکلف کو قبیح بتایا ہے اور فقہاء کے لیے جھوٹ کی برائی واضح کی ہے، ایسا گمان کوئی انسان نہیں کرسکتا ہے"

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے جن خصائص وکمالات کا تذکرہ جاحظ نے کیا ہے کلام مصطفیٰ ﷺ اس سے کہیں برتر واعلیٰ ہے یہی وہ کلام ہے جو تمام قسم کی پیدائشی اور لاحقی عیوب سے منزہ ہے نظم بیان اور جودت معنی میں یکتائے روزگار ہے مظہر نبوت اور اعجاز مصطفیٰ ہے، اس کی خوبیاں لامحدود اور اس کا وصف بیان ناممکن ہے۔ حضرت شمس بریلوی فرماتے ہیں:

کہاں ہے مری زباں کو یارا کروں جو وصف حدیث والا
کوئی "وما ینطق" سے پوچھے ہے کتنا پیارا کلام ان کا

کلام رسول میں مختلف عربی لہجات: رسول اکرم ﷺ عربی زبان کی وسعت وہمہ گیریت کے باوجود اس کے مختلف لہجات پر قادر تھے اور اس کے متنوع اسالیب بیان سے واقف تھے۔ قاضی عیاض شفاء شریف میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ ﷺ کو عرب کے لہجات سکھادئے گئے تھے چنانچہ آپ ہر قوم سے اس کی زبان میں مخاطب ہوتے اور اسی کے لب ولہجہ میں گفتگو فرماتے تھے اور ان کی فصاحت وبلاغت کے مطابق معنی پیدا کر کے برتری ثابت کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کے بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ سے آپ کے کلام واقوال کی تشریح وتفسیر دریافت کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی حدیث وسیرت کو دیکھنے والا اس بات کو معلوم کرسکتا ہے اور اس کی حقیقت کو جان سکتا ہے، چنانچہ قریش، انصار، اہل حجاز اور اہل نجد کے ساتھ آپ کا انداز کلام اس سے مختلف ہوتا تھا جو آپ ذی المعشار الہمدانی، طبقہ النہدی، قطن بن حارثہ العلیمی، اشعث بن قیس، وائل بن حجر الکندی اور دیگر امراء حضر موت اور شاہان یمن کے ساتھ اختیار کرتے تھے" (دیکھئے شفاء شریف بحوالہ "نقوش" رسول ﷺ نمبر، ص: ۳۶۴ ڈاکٹر ظہور احمد کا مقالہ "فصاحت نبوی")

مصر کے ممتاز عالم استاذ محمد عطیہ الابراشی اپنی کتاب "عظمة الرسول" میں رقمطراز ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کی زبان فصیح تھی کلام بلیغ تھا الفاظ پر رونق اور عبارت عمدہ تھی اور تکلف نہیں تھا۔ آپ کو جوامع الکلم عطا کیے گئے تھے۔ انوکھی حکمت بھری باتیں آپ کی خصوصیات تھیں۔ عرب کے لب ولہجہ سکھا دیے گئے تھے۔ ہر قبیلہ سے آپ اسی کی زبان میں مخاطب ہوتے اور اسی کی زبان میں اس سے گفتگو فرماتے تھے چنانچہ قریش، انصار، اہل حجاز اور اہل نجد کے ساتھ گفتگو میں جو انداز بیان اختیار فرماتے وہ اس اسلوب کلام سے مختلف ہوتا تھا جو آپ قحطانی عرب کے ساتھ فرماتے تھے" (عظمة الرسول، ص: 572)

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "المبین" میں لکھتے ہیں:

"یہ زبان ایسی وسیع ہے کہ اسلاف نے آخر میں فیصلہ کردیا کہ بجز نبی ﷺ کے اور کوئی دوسرا لغات عرب پر کامل بصیرت و احاطہ نہیں رکھتا" (المبین، ص: ۱۶۰)۔

یقیناً لغات عرب پر آپ ﷺ کی کامل اور مکمل قادر الکلامی آپ کی شان معجزانہ تھی جو الہامی اور توفیقی طریقے سے ہی آپ کو عطا کی گئی کیونکہ آپ کی سیرت نگاروں میں سے کسی نے اس بات کی نشاندہی نہیں کی کہ آپ ﷺ روایت کی کشکول گدائی لیے ہوئے قبائل عرب میں پھرے ہوں اور عرب کے مختلف لب ولہجہ کے نمونے اکٹھا کئے ہوں یا انہیں باضابطہ آپ نے سیکھا ہو، جب کہ دوسری طرف جن لوگوں نے پروفیشنل طور پر کاسۂ روایت اٹھا رکھا تھا ان کے تعلق سے بھی یہ نہ کہا جاسکا کہ انہیں لغات عرب اور لہجات قبائل پر کامل بصیرت تھی خواہ وہ اصمعی ہوں یا مفضل الضبی ہوں یا اور کوئی۔۔۔

اس لیے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ لغات عرب پر آپ کی کامل بصیرت عطیہ ربانی اور توفیق الہی ہی تھی۔

رسول اللہ ﷺ شاعر نہ تھے: جس ماحول میں آپ ﷺ کی نشوونما ہوئی اور جس قوم میں آپ کو بھیجا گیا تھا اس قوم کی فصاحت وبلاغت کا اعلی معیار شعر ہی تھا اس کی اعلی قدریں شعر ہی سے مراد تھیں اس لئے ماحولیاتی، سماجی اور نفسیاتی تاثیر وتاثر کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ ایک بہت بڑے شاعر ہوتے اور اپنی عظمت فصاحت کا لوہا اپنے اعلی شعری نمونے سے منواتے مگر ایسا کچھ نہ ہوا، قرآن کریم نے تو آپ ﷺ کو شعر وشاعریت سے منزہ کیا ہے۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

(وما علمناه الشعر وما ينبغي له إن هو إلا ذكر وقرآن مبين۔ سورہ یٰس ۳۶.) "اور ہم نے انہیں شعر نہیں سکھایا اور ان کے لئے مناسب نہ تھا وہ تو ذکر ہے اور قرآن مبین"۔

(والشعراء يتبعهم الغاوون ألم تر أنهم في كل واد يهيمون وأنهم يقولون ما لا يفعلون) (سورہ الشعراء ۹۶-۹۷) "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ شعراء ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جسے وہ کرتے نہیں"

بلکہ کمال کی بات تو یہ ہے کہ رسول اقدس ﷺ کی زبان مبارک پر کبھی کوئی شعر جاری ہی نہ ہوا اور اگر کبھی آپ نے کوئی شعر پڑھا بھی تو اس کا وزن سلامت نہ رہا۔ مصطفی صادق رافعی اپنی کتاب "اعجاز القرآن والبلاغة النبوية" میں لکھتے ہیں کہ: "**انه ﷺ على كونه أفصح العرب إجماعا لم يكن ينشد بيتا تاما على وزنه إلا ما كان ينشد الصدر أو العجز فحسب فان القي البيت كاملا لم يصحح وزنه بحال من الأحوال**) (اعجاز القرآن والبلاغة النبوية۔ للرافعی، ۲۰۸)

"اس بات پر اجماع ہونے کے باوجود کہ آپ ﷺ افصح العرب تھے آپ کبھی بھی کوئی کامل شعر وزن کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ آپ صدر بیت یا عجز بیت پر ہی اکتفا فرماتے اور اگر کبھی کوئی کامل بیت شعری آپ کی زبان پر جاری بھی ہوا تو کسی بھی حال میں اس کا وزن شعری سلامت نہ رہ سکا"

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا شعر کے تعلق سے معاندانہ موقف تھا بلکہ یہ تو حکمت ربانی کا تقاضا تھا کہ کہیں لوگ قرآن وحدیث کو جو پیغام توحید اور احکام الہی ہے شعری بازگشت نہ تصور کرلیں ورنہ آپ ہی ﷺ حق وصداقت پر مبنی اسلام کی دفاع میں کہے جانے والے اشعار کی حمایت فرماتے تھے اور مسلم شعراء کی ہمت افزائی بھی فرماتے تھے جیسا کہ آپ ﷺ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ سے فرماتے: **(أهجهم وجبريل معك)** "کفار کی ہجو کا جواب دو (شعر میں) جبریل آپ کے ساتھ ہیں" علاوہ ازیں بہت سے شواہد ہیں جن سے اخلاقیات پر مبنی اسلامی روح سے منسجم اشعار کے تعلق سے آپ کے مثبت موقف کی نشاندہی ہوتی ہے مگر طوالت کے خوف سے ان کا ذکر ترک کیا جارہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح شان نبوت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ﷺ ہر اس چیز سے منزہ ہوں جس میں عیب کا شائبہ پایا جاتا ہو اسی طرح شان نبوت شعرگوئی کے منافی تھی کیونکہ شعر میں تکلف وتصنع کو دخل ہوتا ہے، فخر ومباہات شعر کے عناصر ترکیبی ہوتے ہیں، شعر طاعت وعبادت سے دوری کا باعث ہوتا ہے، قول میں تضاد کا عکاس ہوتا ہے، فحش گوئی اور بد زبانی عام طور پر شعراء کی عادت ہوتی ہے جبکہ نبوت تو صداقت کا آئینہ دار ہوتی ہے اور نبی اللہ کا پیغامبر ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم وتربیت اللہ تعالی خود اپنے ذمہ کرم پر لیتا ہے۔ وحی والہام کے ذریعہ اللہ تعالی ان کو ان

تمام خوبیوں اور کمالات سے نوازتا ہے جس کی ضرورت راہ دعوت و تبلیغ میں پڑ سکتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رحمۃ للعالمین النبی الامی ﷺ کو جامع کمالات بنا کر بھیجا۔ عربوں کی پر تکلف شاعری اور مسجع نثر نگاری کے مقابلے میں جہاں ایک طرف آپ پر قرآن مقدس اتارا وہیں بذریعہ وحی والہام آپ کو جوامع الکلم عطا فرمایا جن پر نہ تو یہود و نصاریٰ کی تہذیب و ثقافت کا کوئی اثر تھا اور نہ ہی عربوں کی پر تکلف شاعری اور مسجع و مقفی نثر کا شائبہ۔ اہل زبان و ادب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن و حدیث دونوں ہی عربوں کی شعری اور نثری روایت سے پاک ہے۔ وہ صرف اور صرف کلام مرسل معجزہ مصطفیٰ ﷺ ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے جبکہ حدیث وحی غیر متلو، دونوں کا تقدس اہل علم کے نزدیک مسلم ہے۔

فصاحت نبوی ﷺ کے چند نمونے: آقائے رحمت سرور کائنات ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات طیبہ مختلف حالات و مواقف کے تناظر میں کافی متنوع ہیں۔ ان میں کہیں پیغام توحید ہے تو کہیں دعوت فکر و عمل کہیں تو جیہ و ارشاد تو کہیں پند و نصائح، کبھی اہل و عیال سے گفتگو ہوتی ہے تو کبھی مجمع عام میں خطابت کے گوہر بکھرتے ہیں۔ کبھی وفود سے ہم کلامی ہوتی ہے تو کبھی شاہان وقت کو خطوط بھیج کر اسلام کی دعوت دی جاتی ہے۔ غرضیکہ برسوں کے دوش پر بکھرے ہوئے کلمات مصطفیٰ ﷺ کا مکمل احاطہ امکان سے باہر ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کلام نبوی کا بیشتر حصہ نہایت امانت داری کے ساتھ محدثین کرام نے صحابہ عظام کے حوالے سے ہم تک پہونچایا ہے جو کتب احادیث و آثار، تاریخ و سیر اور تفسیر و ادب میں بکھرے موتیوں کی طرح قلب و جگر کو مسحور کر رہے ہیں۔

بطور مثال چند نمونے پیش خدمت ہیں:

حکیمانہ ادب پارے: آپ ﷺ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے چھوٹے حکیمانہ ادب پارے سمندر سموئے ضرب المثل کی صورت میں فصحاء عالم کے لیے چیلنج ہیں جن کی نظیر پیش کرنے سے پوری دنیا کی فصاحت و بلاغت عاجز ہے۔ جاحظ اسی قسم کے ادب پاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: (سنذكر من كلام رسول ﷺ مما لم يسبقه إليه عربي ولا شاركه اعجمي ولم يدع لأحد ولا ادعاه أحد، مما صار مستعملا ومثلا سائرا) (البیان والتبیین ۱۵/۲) ''عنقریب ہم کلام رسول ﷺ کا ایک ایسا گلدستہ پیش کریں گے کہ جس کا استعمال آپ سے پہلے نہ کسی عربی نے کیا ہے اور نہ ہی کسی عجمی نے۔ اور نہ ہی کسی کے لیے اس قسم کا دعوی کیا گیا اور نہ ہی کسی نے اس طرح کا دعوی کیا ہے، وہ کلام مستعمل ہے اور ضرب المثل ہے''۔

یہ لیجئے اس قسم کے ضرب المثل کی چند مثالیں۔ اللہ کے پیارے حبیب ﷺ فرماتے ہیں:

(۱) (إن المؤمن لا يلسع من حجر مرتين) ''مومن ایک ہی سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا ہے''، یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ حوادث سے عبرت حاصل کرے اور مصائب سے سبق لے اپنی کی ہوئی غلطیوں کو نہ دہرائے اور ہمیشہ محتاط رہے۔

(۲) (هدنة على دخن وجماعة على أقذاء) ''نیچے لڑائی کا دھواں سلگ رہا ہے اور اوپر صلح کی اوس''، یعنی دلوں میں دشمنی کی کسک ہے اور بظاہر اتحاد و اتحاد کی رٹ بلفظ دیگر یوں کہیے کہ ''بغل میں چھری اور منہ میں رام رام''۔

(۳) (كل الصيد في جوف الفراء) ''سب شکار جنگلی گدھے کے پیٹ میں''، یعنی ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔

(۴) (إياكم وخضراء الدمن) ''تم کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر اگے ہوئے سبزے سے بچو''، یعنی انسانی زندگی کی ظاہری خوشنمائی اور چکا چوند کرنے والی ظاہری چمک دمک سے بچو جس کی تہہ میں فکر و نظر اور اخلاق و کردار کی گندگی اور عفونت ہو۔

(۵) (إياكم والشبعة فانه مسقمة واجتنبو الجوع انه مقرمة) ''تم پیٹ بھر کھانے سے بچو کیونکہ خوب پیٹ بھر کے کھانا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ اور تم بھوک سے بھی بچو کیونکہ بھوک بڑھاپا لاتی ہے''

ہم انہیں چند مثالوں پر اکتفا کر رہے ہیں گرچہ اس طرح بیشمار اقوال مبارکہ ہیں جن میں جہاں ایک طرف بیشمار حکمت و دانائی کے اسرار و رموز پنہاں ہیں وہیں ادبی بانکپن کے شاہکار بھی ہیں۔ جو ضرب المثل اور بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ پر ہیبت اور پر وقار بھی ہیں۔ تجربات و شواہدات پر مبنی ہونے کے ساتھ موثر اور سحر انگیز بھی ہیں۔

تصویر فنی کے بعض نمونے: قرآن کریم کی طرح کلام رسول

ﷺ میں بھی فنی تصویروں کی کثرت ہے، نظم بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تخیل، معنوی انسجام اور تشبیہات وتمثیلات کے انوکھے انداز سے پیدا ہونے والی زندہ تصویریں محسوس کو ملموس اور مفہوم کو مجسم بنا کر پیش کرتی ہیں۔ برائے نمونہ ملاحظہ ہوں چند تصویریں:۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب مصطفیٰ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: (أرأيتم لو أن نهرا بباب أحدكم يغتسل فيه كل يوم خمسا ما تقول في ذلك يبقى من درنه ؟ قالوا: لا يبقى من درنه شيئا ، قال فذلك مثل الصلوات الخمس يمحو الله به الخطايا) (صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ۔ مطبع کرزن دہلی۔۱۳۲۲ھ ۱/۷۶) ''غور کرو! اگر تم میں سے کسی کے دروازے ہی پر دریا بہہ رہا ہو جس میں وہ ہر دن پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل کچیل باقی رہے گا؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ اسکا میل باقی نہیں رہے گا۔ تو آپ نے فرمایا ٹھیک یہی حال پنج وقتہ نمازوں کا ہے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹا دیتا ہے''

دیکھا آپ نے! کتنے لطیف پیرائے میں نماز کے فوائد پیش کیے گئے جو معنوی تھے مگر دروازے کے سامنے دریا کا بہنا پھر اس قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرنا یہ ایسی زندہ تصویریں ہیں جو نگاہوں کے سامنے مجسم طور پر پیش ہوتی ہیں اور انسان یہ سب کچھ حرکتوں میں تصور کرتا ہے۔

(۲) رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں: (مثل المؤمن الذي يقرأ القرآن مثل الاترنجة ، ريحها طيب وطعمها طيب ومثل المومن الذي لا يقرأ القرآن مثل التمرة لا ريح لها وطعمها حلو، ومثل المنافق الذي لا يقرأ القرآن كمثل الحنظلة ليس لها ريح وطعمها مرّ، ومثل المنافق الذي يقرأ القرآن مثل الريحانة ، ريحها طيب وطعمها مرّ) (صحیح بخاری، کتاب الأطعمۃ، باب ذکر الطعام ۲/۸۱۶)

''جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال (اترنجہ) پھل کی ہے جس کی بو پاکیزہ ہے اور مزہ اچھا ہے۔ اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا ہے اس کی مثال کھجور کی ہے جس میں کوئی خوشبو نہیں مگر اس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے اور قرآن پڑھنے والے منافق کی مثال (حنظل) جیسی ہے جس میں خوشبو نہیں ہوتی ہے اور جس کا مزہ کڑوا ہوتا ہے اور قرآن پڑھنے والا منافق اس خوشبودار پودے جیسا ہے جس کی بو پاکیزہ ہے مگر مزہ تلخ ہے''

(۳) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: (مثل الجليس الصالح والجليس السوء كمثل صاحب المسک و كير الحداد لا يعدمک صاحب المسک إما تشتريه وإما تجد ريحه و كير الحداد يحرق بدنک أو ثوبک أو تجد منه ريحا خبيثة) (صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب فی العطار وبیع المسک، ۱/۲۷۲) ''نیک اور برے ہم نشیں کی مثال مشک والے اور بھٹی والے لوہار کی ہے۔ مشک خرید لوگے یا تمہیں اس کی خوشبو ملے گی اور لوہار کی بھٹی تمہارا جسم یا کپڑا جلادے گی یا تمہیں اس کی بدبو سونگھنے کو ملے گی''

ان مثالوں میں تشبیہ وتمثیلات نے کتنے حسین پیرائے اور انوکھے انداز میں محسوس کو ملموس اور مفہوم کو زندہ چلتی پھرتی تصویروں میں تبدیل کر دیا ہے یہ اصحاب ذوق علم وادب پر مخفی نہیں ہے۔

پانچ وقت نماز کی پابندی سے گناہوں کا جھڑنا ایک امر محسوس ہے جسے بظاہر دیکھا نہیں جاسکتا ہے مگر دروازہ پر دریا کا بہنا اور اس میں کسی کا دن میں پانچ مرتبہ غسل کرنے کی تشبیہ سے یہ امر محسوس ملموس ومبصر میں تبدیل ہو کر ہر ذہن میں اس طرح اتر جاتا ہے جیسے کہ شراب انگوری بدن میں اور انسان مسلم وجدانی کیفیت سے سرشار نماز کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کے فوائد نہ یہ کہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ آنکھوں سے اس کا نظارہ بھی کرتا ہے۔

یہ چند نمونے بطور مثال پیش کیے گئے، کلام مصطفیٰ ﷺ میں ایسی زندہ تصویروں کی کثرت پائی جاتی ہے جو انسانی جذبات کو قید کر لیتی ہیں اور اپنی سحر انگیزی سے زمانے کی رفتار کو موڑ دیتی ہیں۔ اسی کلام بے مثال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مجدد اعظم امام اہل سنت شاہ احمد رضا خان علیہ الرحمۃ والرضوان ارشاد فرماتے ہیں:

اس کی پیاری فصاحت پہ بے حد درود
اس کی دلکش بلاغت پہ لاکھوں سلام
اس کی باتوں کی لذت پہ لاکھوں سلام
اس کے خطبے کی ہیبت پہ لاکھوں سلام

علم کی اہمیت
قرآن وحدیث کی روشنی میں

مولانا نظم الدین [illegible]

کوئی قوم تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔قوم کی ترقی کا راز محض اعلیٰ تعلیم ہے۔جس قوم میں تعلیم نہیں اس قوم کا نام ونشان کالعدم،اس کی ہستی نیستی سے عبارت اور اس کا وجود صفحہ ہستی پر صرف بوجھ ہے۔مسلمان اگر چاہتا ہے کہ وہ زندہ قوم بن کر رہے تو اسے تعلیمی میدان میں آگے بڑھنا ضروری ہے۔

فی زمانۂ دانشور حضرات تعلیم کی دو تقسیم کرتے ہیں (۱) دینی (۲) عصری۔تعلیم خواہ دینی ہو یا عصری دونوں کی تحصیل ضروری ہے۔ ہاں! پہلے اسلامی تعلیمات سے خود کو روشناس کرائیں پھر عصری تعلیم سے خود کو لیس کریں۔تاکہ دینی تعلیم سے مذہب وعقیدہ کو پہچانیں اور عصری تعلیم سے مستقبل روشن کریں۔گویا اسلامی تعلیم مقصد اور عصری تعلیم ضرورت ہے۔ان دونوں کے بغیر قوم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

تعلیم ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے دنیا میں انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے۔اسی لئے علم کو نور فرمایا گیا ہے اور جہل کو تاریکی۔تاریکی میں رہ کر انسان کچھ کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

آج ضرورت ہے کہ اسلامی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے صالح نیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انگریزی اور تکنیکی تعلیم بھی حاصل کریں۔کیوں کہ آج اسلام ومسلم معاشرے کی حفاظت اور غیروں کا جواب دینے کے لئے جو بجائے خود ایک مستحسن فعل ہے،اس تعلیم کا فروغ نہایت ضروری ہے۔

قرآن میں بار بار علم کی عظمت واہمیت کو نہایت دلکش پیرایوں میں پیش کیا گیا ہے اور تحصیل علم پر انسانوں کو راغب کیا گیا ہے۔دوسری تعلیم سے کہیں منع بھی نہیں فرمایا اور کوئی علم بحیثیت علم حاصل کرنا جائز ہے اور پھر یہ خیال رکھنا چاہئے کہ جب بندہ تبلیغ اسلام وغیرہ جیسی صالح نیت کے ساتھ انگریزی وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتا ہے تو درحقیقت اس علم کا تعلق دین سے ہو جاتا ہے کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا: انما الأعمال بالنيات (۱)

ذرا اسلام کا نظریہ تو دیکھیں کہ علم وحکمت کے حصول کے لئے کس انداز میں پیغام دیا جارہا ہے۔

"الحكمة ضالة المؤمن فحيث وجدها فهو احق بها" یعنی مسلمان علم وحکمت کو اپنا متاع گم شدہ سمجھے جہاں ملے حاصل کرلے۔ سرور اقدس ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس وحی کا تعلق بھی تعلیم سے تھا۔"اقرا باسم ربك الذي خلق "(۲) پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کو) پیدا کیا۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو قرآن وحدیث میں جگہ جگہ علم وعلما کی فضیلت واہمیت بتا کر شوق دلایا ہے۔اس لئے کہ اسلام مکمل نظام حیات ہے،اسلام تو مسلمانوں کو ہر جہت سے آگے لانا چاہتا ہے۔

قرآن کریم کی چند آیتیں ملاحظہ فرمائیں کہ اسلام میں حصول علم کی کیسی ترغیب ہے۔

فضیلت علم وعلما قرآن کی روشنی میں: (۱) هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون(۳) تم فرماؤ کیا برابر ہیں جاننے والے اور انجان۔پیر کرم شاہ الازہری اس آیت کے تحت فرماتے ہیں،"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی شان کبریائی کو جانتے ہیں ان کی امید وبیم کا یہ حال ہے (کہ رات بھر دردانگیز نالے اور سجدے کرتے رہتے ہیں) اور جو شان الٰہی سے بالکل ناواقف ہیں ان کی سرکشی کی حد نہیں۔کیا یہ دونوں گروہ یکساں ہو سکتے ہیں؟ (۴)

(۲) والذين أوتوا العلم درجت(۵) اور ان کے جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا۔پیر کرم شاہ الازہری فرماتے ہیں"اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلندیٔ مراتب اور رفع درجات کا ذریعہ ایمان اور علم ہے"(۶)

پھر آگے ایک حدیث نقل فرماتے ہیں:

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان

علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اختیار دیا کہ علم، حکومت اور مال میں سے ایک چیز پسند کرلو۔ آپ نے علم پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے آپ کو بادشاہی اور مال بھی عطا فرمائے۔(٦)

سرور کائنات ﷺ کو اللہ نے ما کان وما یکون کا علم عطا فرمایا پھر بھی حکم ہوا۔

(٥)قل رب زدني علما(٧) اورعرض کروائے میرے رب مجھے علم زیادہ دے۔

(٧)ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنةً وقِنا عذاب النار(٨) اے رب ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔

حضرت حسن نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ربنا اٰتنا میں الحسنة في الدنيا سے مراد علم اور عبادت ہے اور في الآخرة سے مراد جنت ہے۔(٩)

(٨) وما كان المؤمنون لينفروا كافة فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم (١٠) اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہوں ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں۔

مفسرین کرام فرماتے کہ لینذروا سے مراد تعلیم وارشاد ہے۔

قرآن کریم کے بعد احادیث کریمہ کو دیکھیں کہ تعلیم وتعلم کے متعلق سرکار اقدس ﷺ کے لب اقدس سے کیسے کیسے پھول جھڑے ہیں۔ کس کس انداز سے آقائے کریم ﷺ نے تعلیم کے لئے شوق دلایا۔

ضرورت علم دین: (١)عن أنس بن مالك رضي الله تعالىٰ عنه قال قال رسول الله ﷺ: طلب العلم فريضة على كل مسلم(١١) حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

(٢) عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله تعالىٰ عنهما قال قال رسول الله ﷺ: العلم ثلثة اية محكمة أو سنة قائمة أو فريضة عادلة وما كان سوى ذلك وهو فضل(١٢) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علم تین ہیں: قرآن اور حدیث یا وہ چیز جو عمل میں ان کی ہمسر ہے اور ان کے سوا جو کچھ ہے سب زائد اور اضافہ ہے۔

سرکار اعلیٰ حضرت اس حدیث کے تعلق سے فرماتے ہیں "اس حدیث کا صریح مفاد ہر مسلمان مرد وعورت پر طلب علم کی فرضیت ہے۔ تو یہ صادق نہ آئے گا مگر اس علم پر جس کا تعلم فرض عین ہو۔ اور فرض عین نہیں مگر ان علوم کا سیکھنا جن کی طرف انسان بالفعل اپنے دین میں محتاج ہو(١٣)

اسی حدیث کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں "ہر اس شخص پر اس کی حاجت موجودہ کے مسئلے سیکھنا فرض عین ہے"(١٤)

امام بیہقی کی روایت ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں:

"عوام کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ پانچ نمازیں فرض ہیں اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر ماہ رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے اور ان کے اموال میں زکوٰۃ فرض کی ہے اور زنا، قتل، چوری اور شراب نوشی کو ان پر حرام کردیا ہے۔ اسی طرح وہ احکام جن کا اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف کیا ہے جن کا کرنا یا جن سے اجتناب اس پر ضروری ہے ان سب کا جاننا اس پر ضروری ہے۔(١٥)

(٣) عن أبي هريرة قال قال رسول الله ﷺ: العلم خير من العبادة.(١٦)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم عبادت سے بہتر ہے۔

(٤) عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله ﷺ: العلم خير من العمل.(١٧)

حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم عمل سے بہتر ہے۔

ان آیات واحادیث کو دیکھنے کے بعد نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس قوم میں تعلیم کو اتنی اہمیت دی گئی وہی قوم تعلیم کے میدان میں کوسوں دور ہے۔ جب تک مسلمان تعلیم یافتہ تھا حکومت واقتدار اس

کے ہاتھ میں تھی، مگر جب اس نے تعلیم سے اپنا رشتہ توڑ لیا تو ذلت ورسوائی اس کا مقدر بن گئی۔ ابھی بھی وقت ہے کہ خود کو بدلیں آخر کب تک سسک سسک کر زندگی گذارنے کے متمنی ہوں گے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کیا ارشاد فرما رہا ہے: إن الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم (۱۸)

اس آیت کی ترجمانی شاعر ڈاکٹر اقبال نے یوں کی ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو احساس جس کو اپنی حالت کے بدلنے کا

بچی ہوئی فکر وعمل کی قوت کو کام میں لائیں ورنہ مزید ذلت وپسپائی کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

دیکھئے ڈاکٹر اقبال کیا کہتے ہیں۔

جب کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے
قوت فکر وعمل پہلے فنا ہوتی ہے

دنیا کے اندر بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو باپ کے انتقال ،ماں کے انتقال پر یا کسی رشتہ دار کے انتقال پر دعاے جنازہ بھی نہیں پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ دعا یاد نہیں ہوتی وہ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ باپ نے پالا پوسا اور اس کی موت کے بعد دعاے مغفرت بھی نہیں کر سکے۔ آخر ان کے احسان کا بدلہ آپ کیسے دے سکیں گے؟ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمان کا بچہ بچہ تعلیم حاصل کرے کیونکہ علم نہ ہو تو دین کا کوئی معاملہ کما حقہ استوار ہو سکتا ہے نہ دنیا کا۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: یا رسول اللہ سب سے افضل عمل کون ہے؟ فرمایا: معرفت الٰہی ،اس نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون ہے؟ فرمایا: معرفت الٰہی ،اس نے سہ بارہ عرض کیا: یا رسول اللہ! میں عمل کے بارے میں سوال کرتا ہوں اور حضور علم کے بارے میں جواب دیتے ہیں۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا: علم کے ساتھ تھوڑا عمل بھی نفع پہنچاتا ہے لیکن جہل کے ساتھ بہت عمل بھی نفع نہیں پہنچاتا۔ (۱۹)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ لڑکوں کو پڑھتے دیکھتے تو فرماتے: شاباش! تم حکمت کے سرچشمے ہو، تاریکی میں روشنی ہو، تمہارے کپڑے پھٹے پرانے ہیں مگر دل تروتازہ ہیں۔ تم علم کے لئے گھروں میں قید ہوئے ہو مگر تم ہی قوم کے مہکنے والے پھول ہو۔ (۲۰)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے سمجھ میں آتا ہے کہ علم دین حاصل کرنے والے کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر درحقیقت تحصیل علم کے بعد ایک انمول جوہر بن جاتا ہے اور پوری عمر ملت اسلامیہ کو اپنے علم سے فیض یاب کرتا ہے۔ اور باوقار زندگی گزارتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) بخاری شریف ج ۱ اول
(۲) العلق ۱
(۳) الزمر ۹
(۴) تفسیر ضیاء القرآن ج ۴ ص ۲۶۳
(۵) المجادلۃ ۱۱
(۶) تفسیر ضیاء القرآن ج ۵ ص ۱۴۶
(۷) طٰہٰ ۱۱۴
(۸) البقرۃ ۲۰۱
(۹) احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۱۴
(۱۰) التوبۃ ۱۲۲
(۱۱) جامع الاحادیث ج ۱ ص ۱۶۵
(۱۲) جامع الاحادیث ج ۱ ص ۱۶۵
(۱۳) جامع الاحادیث ج ۱ ص ۱۶۶
(۱۴) جامع الاحادیث ج ۱ ص ۱۶۶
(۱۵) شرح صحیح مسلم ج ۷ ص ۳۶۴
(۱۶) جامع الاحادیث ج ۱ ص ۱۶۹
(۱۷) جامع الاحادیث ج ۱ ص ۱۷۲
(۱۸) الرعد ۱۱
(۱۹) العلم والعلماء ص ۴۵۷
(۲۰) العلم والعلماء ص ۴۹

اسلام اور سیاست

مولانا ممتاز عالم مصباحی☆

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے۔اس نے انسانی زندگی میں ہدایت و رہنمائی کی ہے۔چونکہ سیاست و تدبر کو انسانی زندگی میں اہم اور نمایاں مقام و مرتبہ حاصل رہا ہے۔خاص طور پر موجودہ دور میں تو انسانی زندگی سیاست سے کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آرہی ہے۔اس لیے اس شعبہ میں بھی اسلام کے واضح اور روشن ہدایات موجود ہیں۔

اسلام کے سیاسی تدبر کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ہمیں اسلام کے ابتدائی دور کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رہائش اختیار کرنے کے بعد مسلمانوں کو پہلی بار آزادانہ طور پر زندگی بسر کرنے اور اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات وہدایات کو عملی صورت میں پیش کرنے کا موقع ملا تھا۔اس لیے ہم اسی دور کے حالات پر نظر کرتے ہیں۔یہ دور اسلامی تاریخ کا نازک ترین دور تھا۔مسلمان ہر طرفہ پریشانیوں میں گھرے تھے۔کفار و مشرکینِ مکہ کے مظالم کی وجہ سے ایک طرف انہیں مکہ سے مدینہ طیبہ جانا پڑا تو دوسری جانب ان کے تو وہ دشمن اب بھی ان کے خلاف سازشوں اور فوج کشی کی تیاریوں میں سرگرم عمل تھے۔تیسری جانب خود مدینہ طیبہ بھی انؐ کے لیے سکون کی جگہ ثابت نہیں ہو رہا تھا۔کیوں کہ وہاں بھی ان کے مخالف عناصر موجود تھے۔چوتھی پریشانی ان کی معاشی تنگ دستی و کمزوری تھی کیونکہ ان کی زندگی مادی نقطۂ نظر سے کافی کمزوری اور ضعف کے مرحلوں سے گزری تھی۔اس سنگین اور نازک صورت حال میں مسلمانوں نے فوری طور پر دشمنوں کے مقابلے میں آنے کی بجائے اسلامی تعلیمات و ہدایات کے مطابق تدبر سے کام لیا۔رسول اکرم ﷺ نے ایسے موقع پر دوستوں کی تعداد میں اضافہ کرنے اور دشمنوں کی تعداد کو کم کرنے یا کم از کم ایک ایسے گروہ کو تیار کرنے کی کوشش جو بالکل غیر جانبدار رہے، سب یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ باضابطہ معاہدہ کیا جسے تاریخ میں ''میثاق مدینہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس معاہدہ کے تحت ایک مشترک المذاہب معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی جس میں عیسائیوں، یہودیوں اور دوسرے عقیدہ کے لوگوں کو بھی مساوی سماجی اور سیاسی حقوق حاصل تھے۔رسول اکرم ﷺ نے عقیدت کو چھوڑ کر باقی تمام انسانی معاملات کے اعتبار سے مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور دوسرے عقیدے کے افراد کو ایک امت تسلیم کیا اور باہمی اشتراک و تعاون کے جذبے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تاکید فرمائی اور ایک دوسرے کے دشمنوں کو مدد نہ دینے کا معاہدہ کیا۔علاوہ تریں خود مدینہ منورہ کے باشندوں کے داخلی تنازعات کو حل کرنے میں ان کی مدد کر کے اپنی غیر جانبداری اور انصاف پروری کا ثبوت دے کر ان کا مکمل اعتماد حاصل کر لیا اور اس طرح اپنے سیاسی تدبّر کی بناء پر مستقبل میں پیش آنے والے بہت سے تاریخی واقعات کا رخ بدل دیا۔

آج سیاست نے ترقی کے منازل طے کر کے ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل کر لیا ہے جس پر ریسرچ کر کے لوگ PhD تک کی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔اس حیرت ناک ترقی و تبدیلی کے باوجود مدینہ طیبہ میں مسلمان جس قسم کے حالات سے دوچار تھے اپنے نازک ترین حالات میں آج کا ترقی یافتہ سیاست داں اور دانشور بھی اسی اصول کے مطابق اپنی پالیسی بنانے کا مشورہ دے گا جس طرح مسلمانوں نے اپنا رخ اختیار کیا تھا۔یہ مسلمانوں خاص طور پر بانی اسلام سیدالانس والجان رسول اکرم ﷺ کا سیاسی تدبّر ہی تھا کہ انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں سے معاہدہ کر کے نہ صرف یہ کہ اپنے دشمنوں کی تعداد کو گھٹایا بلکہ حالات کے رخ کو بالکل بدل دیا۔

صلح حدیبیہ کو بھی اسلامی سیاست و تدبر کے بہترین نمونہ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ماہ ذی قعدہ ٦ھ کی بات ہے۔رسول اکرم

☆ ... جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء ... فارغ التحصیل ہیں۔

ﷺ عمرہ اور حج ادا کرنے کی غرض سے مدینہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کا ایک مقدس گروہ بھی تھا جس کی تعداد تیرہ سو پندرہ سو کے درمیان تھی۔ رسول اکرم ﷺ کا یہ سفر مبارک خالص عمرہ اور ادائے حج کے لیے تھا اس لیے آپ نے اس کے اظہار کے لیے اپنی روانگی سے قبل قربانی کے جانوروں کو بھیج دیا تھا۔ علاوہ بریں مدینہ منورہ سے ہی احرام باندھ لیا تھا لیکن اہل قریش اس کے باوجود اطلاع ملتے ہی آپ سے جنگ کرنے اور خانۂ کعبہ کی زیارت سے روکنے کے لیے بضد ہو گئے اور خالد بن ولید کو ایک دستہ سواروں کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف بڑھایا۔ اہل قریش کی اس سر گرمی کی اطلاع رسول اکرم ﷺ کو اس وقت پہنچی جب آپ عسفان پہنچ چکے تھے۔ آپ نے اسی مقام سے عام راستہ چھوڑ کر ثنیۃ المرار کا راستہ اختیار کیا اور رفتہ رفتہ مقام حدیبیہ میں پہنچے۔ خالد بن ولید اس خبر کے سنتے ہی اطلاع کے غرض سے مکہ واپس ہو گئے۔ رسول اکرم ﷺ نے جب اس مقام سے مکہ کی طرف اپنے ناقہ کو موڑنے کا ارادہ فرمایا تو وہ بیٹھ گیا رسول اکرم ﷺ اسے مرضی الٰہی سمجھ کر اتر گئے اور لوگوں کو قیام کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس کے بعد رسول اکرم ﷺ اور کفار قریش کے درمیان نامہ و پیام کا عمل شروع ہوا۔ بالآخر طے پایا کہ آپ اس سال صرف قربانی کر کے واپس چلے جائیں اور سال آئندہ آپ اور آپ کے صحابہ سوائے تلوار کے بلا ہتھیار آئیں اور مکہ میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھیریں۔ یہ صلح دس برس تک برابر قائم رہے۔ ایک دوسرے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائیں۔ یہ بھی طے پایا کہ جو شخص کفار میں سے مسلمانوں سے جا ملے وہ اپنی قوم کو واپس کر دیا جائے گا اور جو شخص مسلمانوں میں سے ان میں مل جائے تو وہ مسلمانوں کو واپس نہ کیا جائے گا۔ یہ شرط مسلمانوں کو شاق گذری۔ کچھ صحابۂ کرام نے اس میں بحث بھی کی لیکن رسول اکرم ﷺ بالہام الٰہی سمجھتے تھے کہ یہ صلح لوگوں کے امن اور ظہور اسلام کا سبب بنے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس میں مسلمانوں کے لیے بہبودی اور بہتری کی صورت پیدا کرے گا۔ (تاریخ ابن خلدون حصہ اول ص:۱۳۴)

اس مدبرانہ صلح کے واضح اور مثبت اثرات یہ مرتب ہوئے کہ لوگوں کو چین وسکون اور امن وامان مل گیا اور آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ نہ کوئی مسلمان ان کے مذہب پر معترض ہوتا تھا اور نہ کوئی اسلام کی ہجو اور برائی کرتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کو اپنا قدم جمانے اور اپنے اخلاق و کردار کے ذریعے خاموش طور پر لوگوں کے دلوں میں اسلام کی شمعیں روشن کرنے کا پر بہار موقع ملا۔

ہزاروں سال تک حکومت کے دور سے گذرتے رہنے کے بعد آج دنیا کے بیشتر حصوں میں مساوی نظریۂ حیات کی بنیاد پر جمہوری حکومتیں قائم رہیں اور باقی حصوں میں بھی اس کی کوشش جاری ہیں لیکن اسلام کی سیاست دیکھیے آج گذشتہ نصف صدی یا اس سے کچھ زائد عرصہ سے جو جمہوری نظام حکومت دنیا کے بیشتر ممالک میں قائم ہے اس کی بنیاد اس نے ڈیڑھ ہزار سال قبل ہی رکھ کر موجودہ دور کی ایک اہم سیاسی ضرورت کو پورا کر دیا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام کے اسی جمہوری نظریۂ حکمرانی کا اجمالی خاکہ قیصر کے دربار میں جب رومیوں نے انہیں قیصر روم کے شاہانہ جلال سے مرعوب کرنا چاہا تھا تو ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

وامیر رجل منا إن عمل فینا بکتاب و سنة نبینا فزرناہ علینا و إن عمل بغیر ذلک عزلناہ عنا وإن ھو سرق قطعناہ و إن زنا جلدناہ و إن شتم رجلا شتمه بما شتمه وإن جزحه أقادہ من نفسه ولا یحتجب منا ولا یتکبر علینا ولا یستأثر علینا في فینا الذي أنا و اللہ علینا وھو کرجل منا (فتوح الشام ص ۱۰۵)

''ہمارا امیر ایک فرد ہے اگر وہ ہماری کتاب اور نبی کی سنت پر عمل کرے تو ہم اس کو اپنا خلیفہ باقی رکھیں اور اگر اس کے خلاف عمل کرے تو ہم اسے معزول کر دیں اگر وہ چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیں اگر زنا کرے تو اس کو سنگسار کریں اور اگر ہم میں سے کسی کو گالی دے تو وہ بھی برابری کی گالی دے اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ دینا پڑے۔ وہ ہم سے چھپ کر محلوں میں نہیں بیٹھتا وہ ہم سے غرور و تکبر نہیں کرتا وہ مال

غنیمت کی تقسیم میں اپنے کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے خوب اچھی طرح اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں ایک امیر کی کیا حیثیت تھی۔ اسلام سے قبل ہر طرف شہنشاہیت کا دور دورہ تھا۔ جس میں حکمراں کے فیصلے اور حکم کے خلاف چوں چرا کرنا تو دور کی بات تھی سوچنا تک جرم عظیم تھا۔ حکمراں کی زبان سے جو بات نکلتی تھی وہ سب کے اوپر نافذ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس اسلام کی فیاضانہ اور مصلحانہ سیاست دیکھئے کہ اس کے عہدہ میں تمام تر ملکی نظم و نسق کا انحصار مجلس شوریٰ کے فیصلوں پر ہوتا تھا اور یہ فیصلے اتفاق رائے یا کثرت رائے سے کئے جاتے تھے۔ خلیفۂ اسلام اپنی بات کسی کے اوپر زبردستی نہیں تھوپتا تھا اور نہ اپنے کو کسی سے بڑا تصور کرتا تھا۔ تمام خلفاء اپنے خطبوں میں اس بات پر زور دیتے تھے کہ لوگوں میں کوئی نئی بات رواج دینے والا نہیں ہوں اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں کج رو ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرو۔ خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ دیا تھا اس کے دو تین اقتباسات ملاحظہ کرتے چلیں۔

أيها الناس قد وليت أمركم ولست بخيركم أيها الناس أنا متبع ولست بمبتدع فإن أحسنت فاعيوني وإن زغت فقوموني (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۹)

لوگوں میں تمہارا خلیفہ مقرر ہوا ہوں گو میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ لوگو! میں پیروی کرنے والا ہوں کوئی نئی بات رواج دینے والا نہیں ہوں اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر کج رو ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرو۔

إن قوتكم عند الضعيف حتى اخذله وإن أضعفكم عندي القوي حتى اخذ منه الحق (ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۹)

تم میں جو قوت والا ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اور جو کمزور ہے وہ طاقتور ہے یہاں تک میں اس کو اس کا حق نہ دلا دوں۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ مجھ کو تمہارے مال میں اسی طرح کا حق ہے جس طرح یتیم کے مال میں اس کے مربی کا ہوتا ہے اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر صاحب حاجت ہوں گا تو اندازہ سے صرف اتنا لوں گا جو کھانے کے لیے کافی ہو سکے گا۔ لیکن میرے اوپر تمہارے کئی حقوق ہیں تمہیں مجھ سے ان حقوق کو مواخذہ کرنا چاہئے۔ تمہارا ایک حق یہ کہ ملک کے خراج اور مال غنیمت کو بے جا طور سے جمع نہ کیا جائے۔ دوسرا حق یہ ہے کہ وہ میرے ہاتھ سے بے جا طریقہ پر صرف نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ میں تمہارے روزینے بڑھاؤں اور تمہاری سرحدوں کو محفوظ رکھوں اور چوتھا یہ کہ تمہیں خطروں میں نہ ڈالوں"

اس اقتباس سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے جمہوری نظام حکومت میں خلیفہ کی کیا حیثیت تھی اور حکومت پر عوام سے متعلق کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ اسی پر بس نہیں اسلام نے لوگوں کی سیاسی بے داری کو فروغ دینے کے لیے ملکی نظم و نسق اور حکام پر نکتہ چینی کرنے کی بھی عام اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ اسلام کی اسی تعلیم کی بناء پر کسی معمولی سے معمولی آدمی کو بھی خلیفۂ وقت پر نکتہ چینی کرنے میں تأمل نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کی یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب کبھی کوئی شخص عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف کوئی اعتراض کرتا تھا اور کوئی شخص انہیں منع کرنا چاہتا تھا تو آپ منع کرنے والے کو خاموش کر دیا کرتے تھے اور ایسے موقعوں پر یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ معترض شخص کو اپنی بات رکھنے دو۔

اسلام سے قبل حکمراں ہونا بربریت اور درندگی کا دوسرا نام تھا۔ جس کے ہاتھ میں طاقت اور حکومت ہوتی تھی وہ پوری انسانیت کے لیے قہر و عذاب ثابت ہوتا تھا۔ جب کوئی طاقت ور حکمراں کسی کمزور پر چڑھائی کرتا تھا تو اس ملک کے مردوں کو چن چن کر ہلاک کر ڈالتی تھی

اور ہوس کی آگ بجھانے کی خاطر اس ملک کی عورتوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ چنانچہ اسلام سے قبل جب رومیوں نے ایرانی سلطنت کے کچھ حصوں پر قبضہ کیا تو وہاں کے گھروں کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا۔ زمینوں کو تباہ و برباد کر کے ناقابل کاشت بنادیا۔ رومی سپاہیوں نے عورتوں کو پکڑ پکڑ خوب آبروریزی کی جس کی وجہ سے ہزاروں عورتیں ہلاکت کی نذر ہوگئیں۔ یہی بعد میں بھی ہوتا رہا۔ اسلام کے جلوہ فگن ہونے کے بعد تک فرانس اور جرمنی میں جتنے بھی معرکہ ہوئے ان میں حیوانیت اور درندگی کا ننگا ناچ ناچا گیا۔ لیکن اس کے برخلاف مذہب مہذب اسلام کی فیاضانہ اور روادارانہ سیاست دیکھیے کہ جب مسلمانوں نے مکہ کو فتح کرلیا تو کسی کو انگلی تک نہیں لگایا حالانکہ ان مسلمانوں کو اس سے قبل قریش کے کفاروں نے زیادتیاں کر کے وطن سے نکال دیا تھا لیکن مسلمانوں نے ان کی زیادتیوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ”تم سب کی جانیں اور مال محفوظ ہے“ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اسلامی فوجیں عراق، شام، ایران اور فلسطین جہاں بھی فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئیں تو مفتوح قوموں کو وہی سارے حقوق مراعات دیے گئے جو خود فاتح قوم کو حاصل تھے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جن مفتوح قوموں کے ساتھ معاہدہ کیے ان کو ان معاہدوں کے علاوہ تحریری طور پر مزید مندرجہ ذیل باتوں کی ضمانت بھی دی۔

☆ ان کو ان کے مذہب سے برگستہ نہیں کیا جائے گا۔

☆ اگر ان کا کوئی دشمن ان پر حملہ آور ہوگا تو مسلمان ان کی حفاظت اور مدافعت کریں گے۔

☆ ان سے جو ٹیکس لیا جائے گا انہیں اسے ادا کرنے کے لیے محصّل کے پاس جانا نہیں پڑے گا۔

☆ ان کی جان کی حفاظت کی جائے گی۔

☆ ان کا مال محفوظ رہے گا۔

☆ ان کے قافلوں اور تجارت کا تحفظ مسلمانوں کے ذمہ ہوگا۔

☆ ان کی زمینیں انہیں کے قبضہ میں رہیں گی۔

☆ شکست سے قبل جو چیزیں ان کے قبضہ میں تھیں وہ انہیں واپس کردی جائیں گی۔

☆ پادریوں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کو ان کے عہدوں سے برطرف نہیں کیا جائے گا۔

☆ صلیبوں، تصویروں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

☆ ان کے غلّہ کے پیداوار پر ٹیکس (عشر) وصول نہیں کیا جائے گا۔

☆ اگر وہ معاہدہ پر کاربند رہیں گے تو ان کے ملک پر فوج کشی نہیں کی جائے گی۔

☆ انہیں اپنے مذہب اور عقیدوں پر قائم رہنے کی آزادی حاصل رہے گی اور ان کے مذہب کو تبدیل نہیں کرایا جائے گا۔

☆ انہیں جو حقوق حاصل تھے وہ بدستور باقی رہے گا۔

☆ جو لوگ اس وقت موجود نہیں یہ احکام ان پر بھی حاوی ہوں گے۔

(ماہنامہ دین دنیا شمارہ فروری ۱۹۵۶ء)

رسول اکرم ﷺ کی مذکورہ باتیں صرف زبانی جمع خرچ نہیں تھیں بلکہ مسلمانوں نے ان کے عملی نمونے بھی پیش کیے۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید جو اسلام کے ایک ممتاز سپہ سالار تھے۔ انہوں نے جب خیبر پر [illegible] حاصل کرلی تو وہاں کے عیسائیوں کو اس بات کی بھی تحریری ضمانت دی کہ ”ان کے گرجا گھر برباد نہیں کیے جائیں گے۔ انہیں ناقوس بجانے کی آزادی حاصل رہے گی اور انہیں صلیب کا جلوس نکالنے سے منع نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح مصر پر مسلمانوں کے قبضہ کے بعد خلیفہ ہادی باللہ کے دور میں مسلمانوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی گرجا اور کچھ دوسرے کلیساؤں کو گرادیا تھا لیکن جب مصر کے گورنر موسیٰ ابن اشعری نے علماء سے اس سلسلہ میں دریافت کیا تو اس وقت کے سب سے جید عالم حضرت لیث بن سعد نے یہ فتویٰ دیا کہ پھر سے ان گرجا گھروں کو تعمیر کرایا جائے۔ چنانچہ یہ تمام گرجا گھر سرکاری خرچ سے تعمیر کرائے گئے۔

اسلامی سیاست کے جملہ پہلوؤں پر اگر روشنی ڈالی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی۔ قارئین کرام نے اگر مختصر مضمون کو پسند فرمایا تو ان شاء اللہ اس پر تفصیلی کام کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اسلام کے سیاسی و جمہوری قدروں سے اقوام عالم کو روشناس کرایا جاسکے۔

☆☆☆

☆ استاذ: ادب عربی جامعہ امجدیہ رضویہ گھوسی مئو یوپی

آزادی نسواں کے نام پر فیملی سسٹم کی تباہی

مولانا رفعت رضا نوری

مغربی تہذیب کا عجیب فلسفہ ہے کہ اگر ایک عورت اپنے گھر میں اپنے، اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے لئے کھانا تیار کرتی ہے تو یہ رجعت پسندی اور دقیانوسیت ہے اور اگر وہی عورت ہوائی جہاز میں ایر ہوسٹس بن کر سینکڑوں انسانوں کی ہوسناک نگاہوں کا نشانہ بن کر ان کی خدمت کرتی ہے تو اس کا نام آزادی اور جدت پسندی ہے۔ اگر عورت گھر میں رہ کر اپنے والدین، بہن بھائیوں کے لئے امور خانہ داری سرانجام دے تو یہ قید اور ذلت ہے لیکن دوکانوں میں سیلس گرل بن کر اپنی غضب کی مسکراہٹوں سے گاہکوں کو متوجہ کرے یا دفاتر میں اپنے افسروں کی نازبرداری کرے تو یہ آزادی اور باعث اعجاز ہے۔

مغربی تہذیب کا ایک پروپگنڈہ یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو پردے کا حکم دے کر انہیں ذلت وقید کی زندگی جینے پر مجبور کردیا ہے۔ انہیں نقاب پہنا کر کارٹون بنا دیا ہے۔ اور ذلت ورسوائی کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو پردے کا حکم دے کر انہیں ذلیل وخوار نہیں کیا ہے بلکہ ان کی عزت وآبرو کو چار چاند لگا دیا ہے۔ جس کے متعلق خود رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ (وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ) ترجمہ۔ اور عورتیں اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں اور پہلی جاہلیت کی طرح نہ گھومیں۔ اس میں صرف اتنی بات نہیں کہ عورتوں کو بلا ضرورت گھر سے باہر نہیں جانا چاہئے بلکہ اس آیت میں ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ ہم نے عورت کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ گھر میں رہ کر گھر کے انتظامات کو سنبھالیں اور ساتھ ہی ساتھ پردے کا خوب اہتمام کریں۔ بلاشبہ رب تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق جب عورت پردے کا اہتمام کرے گی تو برائیاں جنم نہیں لے سکتیں اور بدفعلیاں نہیں ہوسکتیں اور اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ گھر کے اندر کے سب کاموں کو عورت سنبھالیں گی اور باہر کے کام مرد لیکن جس ماحول میں معاشرے کی پاکیزگی کی کوئی قیمت ہی نہیں رکھتی ہو اور جہاں عفت کے بجائے اخلاق باختگی اور حیا سوزی کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہو ظاہر ہے کہ وہاں اس تقسیم کو نہ صرف ضروری بلکہ راستے کی رکاوٹ سمجھا جائے گا۔ مغرب میں تمام اخلاقی اقدار سے آزادی کی ہوا چلی تو مرد نے عورت کے گھر میں رہنے کو اپنے لئے دوسری مصیبت سمجھا ایک طرف تو اس کی ہوس ناک طبیعت عورت کی ذمہ داری قبول کئے بغیر قدم قدم پہ اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اور دوسری طرف وہ اپنی قانونی بیوی کا معاشی کفالت کو بھی بوجھ تصور کرتا تھا چنانچہ اس نے دونوں مشکلات کا جو عیارانہ حل نکالا اس کا خوبصورت اور معصوم نام تحریک آزادی نسواں ہے۔ عورت کو یہ پڑھایا گیا کہ تم اب تک گھر کی چہار دیواری میں قید رہی ہو۔ اب آزادی کا دور ہے اور تمہیں اس قید سے باہر آکر مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر کام میں حصہ لینا ہے۔ اب تک تمہیں حکومت وسیاست کے ایوانوں سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ اب تم باہر آکر زندگی کی جدجہد میں برابر کا حصہ لو دنیا کے اعزازات اور اونچے اونچے منصب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

عورت بے چاری ان دلفریب نعروں سے متاثر ہو کر گھر سے باہر آگئی اور پروپیگنڈہ کے تمام وسائل کے ذریعہ شور مچا مچا کر اسے یہ باور کرا دیا گیا کہ اسے صدیوں کی غلامی کے بعد آج آزادی ملی ہے، اب اس کے رنج ومحن کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ان کی آڑ میں عورت کو گھسیٹ

کر سڑکوں پر لایا گیا، اسے دفتروں میں کلرکی عطا کی گئی اسے اجنبی مردوں کی پرائیویٹ سکریٹری کا منصب بخشا گیا اسے ''اسٹنو ٹائپسٹ'' بننے کا اعزاز دیا گیا۔ اسے تجارت چمکانے کے لئے ''سیلز گرل'' اور ''ماڈل گرل'' بننے کا شرف بخشا گیا اور اس کے ایک ایک عضو کو سر بازار رسوا کر کے گاہکوں کو دعوت دی گئی کہ آؤ اور ہم سے مال خریدو یہاں تک کہ وہ عورت جس کے سر پر دین فطرت نے عزت وآبرو کا تاج رکھا تھا اور جس کے گلے میں عفت وعصمت کے ہار ڈالے تھے تجارتی اداروں کے لئے ایک شوپیس اور مرد کی تھکن دور کرنے کے لئے ایک تفریح کا سامان بن کر رہ گئی۔

نام یہ لیا گیا تھا کہ عورت کو آزادی دے کر سیاست وحکومت کے ایوان اس کے لئے کھولے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر اعداد وشمار کا حساب لگا یا جائے آج تک عورتوں کو وہ نہیں عطا کیے جن کی بار بار کی دہائی دی جاتی ہے۔ کیا کسی ذی شعور سے یہ پوشیدہ ہے کہ اس عرصہ (تحریک آزادی نسواں کی ابتدا سے لے کر آج تک) میں کتنی عورتیں صدر یا وزیر اعظم بن گئیں؟ کتنی خواتین کو جج بنا دیا گیا؟ کتنی عورتوں کو دوسرے منصب کا اعزاز نصیب ہوا؟ اعداد وشمار جمع کیے جائیں تو ایسی عورتوں کا تناسب بمشکل چند فی لاکھ ہوگا۔ ان گنی چنی خواتین کو کچھ مناصب دینے کے نام پر باقی لاکھوں عورتوں کو جس بے دردی کے ساتھ سڑکوں اور بازاروں میں گھسیٹ کر لایا گیا ہے وہ آزادی نسواں کے فراڈ کا المناک پہلو ہے۔

آج یورپ اور امریکہ کے علاوہ مشرقی ممالک میں بھی تو دنیا بھر کے تمام درجے کے کام عورت کے سپرد ہیں۔ ریستورانوں میں کوئی مرد ویٹر شاذ ونادر ہی کہیں نظر آئے گا ورنہ یہ خدمات تمام عورتیں ہی انجام دے رہی ہیں، ہوٹلوں میں مسافروں کے کمرے صاف کرنے، ان کے بستر کی چادریں بدلنے اور ''روم اٹنڈنٹ'' کی خدمات تمام تر عورتوں کے سپرد ہیں۔ دوکانوں پر مال بیچنے کے لئے مرد خال خال نظر آئیں گے، یہ کام بھی عورتوں ہی سے لیا جا رہا ہے، دفاتر کے استقبالیوں پر عام طور پر عورتیں ہی متعینات ہیں، اور میرے سے لے کر کلرک تک کے تمام مناصب زیادہ تر اسی صنف نازک کے حصے میں ہیں جسے ''گھر کی قید سے آزادی'' عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو گھر کا ذمہ دار بنایا تا کہ وہ فیملی سسٹم استوار رکھ سکے، لیکن جب وہ گھر سے باہر آگئی تو یہ ہوا کہ باپ بھی باہر، اور ماں بھی باہر اور بچے اسکول میں یا نرسری میں اور گھر میں تالا پڑ گیا اب وہ فیملی سسٹم تباہ وبرباد ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج شہری زندگی کے مغربی معاشرے میں فیملی سسٹم تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ بچوں کو ماں اور باپ کی شفقت میسر نہیں ہے۔ بچوں کی صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ابتدا ہی میں ان کے اخلاق وکردار بگڑتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنی کم سنی میں شباب وکباب کی بہاریں لوٹ رہے ہیں۔

آزادانہ ماحول میں کام کرنے کا خطرناک اثر ازدواجی رشتے پر پڑتا ہے کیوں کہ جب عورت دوسری جگہ کام کر رہی ہے مرد دوسری جگہ کام کر رہا ہے اور دونوں کے درمیان دن بھر میں کوئی رابطہ نہیں ہے، اور دونوں جگہ پر آزاد سوسائٹی ہے تو ان دونوں میں آپس کا رشتہ کمزور پڑنا یقینی ہے اور اس کی جگہ ناجائز رشتے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے طلاق تک نوبت پہنچتی ہے اور گھر برباد ہو جاتا ہے۔ سوویت یونین کے آخری صدر ''منخائل گورباچوف'' نے اپنی کتاب ''پروسٹرائیکا'' میں کھلے الفاظ میں کہا تھا کہ ''ہماری مغربی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے نکال کر باہر لایا گیا، اور اس کے گھر سے باہر نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کیے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا، اس لئے کہ مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عوتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن پیداوار کے زیادہ ہونے کے باوجود اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجے میں ہمیں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں وہ نقصانات اور فوائد سے زیادہ ہیں جو پروڈکشن کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے۔ کیا صدر چوف کا یہ بیان کی آنکھ کھولنے کے لئے کافی نہیں؟

☆☆☆

باب سوم

تاریخ و تحقیق

بہار میں تصانیف

اعلیٰ حضرت کی اشاعت

مولانا ڈاکٹر امجد رضا امجد☆
ادارۂ شرعیہ پٹنہ، بہار
القلم فاؤنڈیشن پٹنہ، بہار

امام احمد رضا بریلوی اور عظیم آباد پٹنہ کے مابین ایک ایسا گہرا، مضبوط، مستحکم اور پائیدار تاریخی رشتہ ہے جسے کوئی مورخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔ یہ رشتہ علمی وروحانی بھی ہے، سوانحی وتاریخی اور تہذیبی وتحریکی بھی۔ امام احمد رضا کے عظیم آبادی خلیفہ حضرت مولانا قاضی عبدالوحید فردوسی علیہ الرحمہ نے مدرسہ اہل سنت پٹنہ (مدرسہ حنفیہ پٹنہ) (قیام ۱۳۱۸ھ) ماہنامہ مخزن تحقیق (تحفہ حنفیہ پٹنہ) (اجرا ۱۳۱۵ھ) مطبع اعوان اہل سنت وجماعت (مطبع حنفیہ پٹنہ) (قیام ۱۳۱۸ھ) کے پلیٹ فارم سے امام احمد رضا کی تعلیمات وتحریکات کو استحکام، شہرت اور مقبول عام بنانے کے لئے جو ایثار پسندانہ خدمات انجام دی ہیں نہ اسے بھلایا جاسکتا ہے اور نہ اس پر حرف گیری کی جاسکتی ہے۔

قاضی صاحب کے قائم کردہ یہ تینوں مراکز ایسے ہیں جسے دنیا سنیت میں نظریات امام احمد رضا کی تبلیغ وتعبیر اور تشہیر واشاعت کے معاملہ میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

مدرسہ حنفیہ پٹنہ: مدرسہ حنفیہ پٹنہ یکم ربیع الاول ۱۳۱۸ھ میں مجلس اہل سنت پٹنہ کے ماتحت قائم ہوا (۱) اور مجلس اہل سنت پٹنہ مرکزی مجلس اہل سنت بریلی کے ماتحت تھی جس کے سرپرست حضرت مخدوم جہاں کی خانقاہ معظم بہار شریف کے صاحب سجادہ جنا بحضور حضرت سید شاہ امین احمد ثبات فردوسی علیہ الرحمہ والرضوان تھے اور دیگر خانقاہوں کے صاحب سجادہ حضرات مثلاً خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے حضرت سیدشاہ بدرالدین علیہ الرحمہ، خانقاہ منعمیہ قمریہ پٹنہ سیٹی کے حضرت سیدشاہ عزیزالدین قمری علیہ الرحمہ خانقاہ، دیوان محلہ کے حضرت سیدشاہ شاہ نصیرالحق علیہ الرحمہ مدرسہ کے امین ومعین تھے۔

اگر مدرسہ حنفیہ پٹنہ کو امام احمد رضا کی شخصیت سے جوڑ کر دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) مدرسہ حنفیہ پٹنہ کے بانی امام احمد رضا کے خلیفہ ومجاز حضرت قاضی عبدالوحید فردوسی تھے۔

(۲) اس مدرسہ میں امام احمد رضا کی کتابیں داخل نصاب تھیں جس کی تفصیل یہ ہے۔

(ا) صرف۔ میں علم الصیغہ محشیٰ بحواشی امام احمد رضا
(ب) منطق۔ بدیع المیز ان کی جگہ رسالہ امام احمد رضا (کتاب کا نام درج نہیں)
(ج) اصول فقہ۔ مسلم الثبوت محشیٰ بحواشی امام احمد رضا
(د) کلام۔ رسالہ امام احمد رضا (کتاب کا نام درج نہیں)
(ہ) اصول حدیث۔ شرح نخبۃ الفکر
(و) فارسی میں۔ فتوح العقائد کی جگہ ''رسالہ عقائد'' (کتاب کا نام درج نہیں)

(۳) اسی مدرسہ کے پہلے عظیم الشان اجلاس رجب ۱۳۱۸ھ میں آپ کا پٹنہ آنا ہوا اور اسی اجلاس سینکڑوں علماء ومشائخ کی موجودگی میں حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی علیہ الرحمہ نے آپ کے مجدد ہونے کا اعلان فرمایا۔ واضح رہے کہ اعلان سے قبل بھی اسی عظیم آباد سے آپ کو ''مجدد'' لکھا جاتا رہا ہے۔ اس کی تفصیل میری زیر ترتیب کتاب ''امام احمد رضا اور عظیم آباد'' میں آرہی ہے۔

(۴) ۱۳۱۹ھ میں جلسۂ اہل سنت کلکتہ سے واپسی پر قاضی صاحب کے ہم راہ آپ کا دوسری بار پٹنہ آنا ہوا، آپ کی آمد کی خبر سے پٹنہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور علماء ومشائخ کے ساتھ آپ کی کئی نشستیں

ہوئیں۔ اسی سفر کی نشست میں مشہور شاعر ثاقب عظیم آبادی کے والد جناب منشی علی حسن صاحب نے امام احمد رضا کی شان میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کے چند اشعار دیکھیں:

یہ سماں بے شک رہے گا مدتوں تک یادگار
اب کے پٹنہ میں نئی صورت سے آئی ہے بہار
اس چمن کی ہر روش میں کچھ نیا انداز ہے
کچھ نرالا پاتا ہوں میں شاہد گل کا نکھار
تاب کیا میری زباں کو جو کرے کچھ ان کا وصف
فرد ہیں، یکتا ہیں ہندوستاں میں یہ والا تبار
نکتہ رس، نکتہ شناس و نکتہ دان و نکتہ فہم
ناز کرتا ہے زمانہ ہیں یہ فخر روزگار
آپ کی تعریف میں قاصر نہ ہو کیوں کر قلم
میں لکھوں تو کیا لکھوں جب خوبیاں ہیں بے شمار
اے حسن تجھ کو ملا ہے جب زیارت کا شرف
شکر نعمت بھی ہے واجب کر دا س کو اختیار
اے خدائے ذوالمنن اے خلق ارض وسما
اے کریم وکارساز وحافظ وپروردگار
لطف تیرا شامل حال آپ کے ہر دم رہے
ہم غریبوں کے ہیں محسن اے مرے پروردگار
آپ کو عمر خضر دے اور رکھ آفت سے دور
نقد فیض عام حضرت سے رہیں سب مالدار

تحفہ حنفیہ پٹنہ: تحفہ حنفیہ پٹنہ ۱۳۱۵ھ میں جاری ہوا۔ اس کا تاریخی نام ''مخزن تحقیق'' ہے اس کے مالک ومدیر مشہور محقق قاضی عبدالودود کے والد گرامی حضرت مولانا حافظ قاضی عبدالوحید فردوسی تھے جو خانقاہ معظم بہار شریف کے صاحب سجادہ جناب حضور سید شاہ امین احمد فردوسی علیہ الرحمہ سے مرید تھے اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ سے خلافت حاصل تھی۔ بڑے متدین، پارسا اور مسلک اہل سنت کے جانباز مجاہد تھے جب ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ وہ جادۂ حق سے منحرف ہونے لگا تو قاضی صاحب نے علماء اہل سنت کی خدمات کو دیکھ کر ان کی حمایت کے لئے پٹنہ میں بھی اہل سنت کا ایک محاذ قائم کرنا چاہا اور اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی بارگاہ میں ۱۹ رذیقعدہ ۱۳۱۳ھ میں یہ خط روانہ کیا:

ناصر ملت مصطفویہ حامی مذہب حنفیہ جناب مولانا الاجل مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی مدظلہ العالی! تسلیم

محض غائبانہ اخوت اسلامی وحمایت مذہب حنفیہ کی جہت سے یہ خط لکھ رہا ہوں اور مولانا عبدالقادر بدایونی کو بھی لکھ رہا ہوں، جلسۂ ندوہ سے سخت بیزار ہوں اور شاید حضور بھی اس کا مخالف ہیں لہذا موافقت فی المخالفت وحمایت مذہب حنفیہ کی جہت سے ایک اخبار تردید مذہب باطلہ ومخالفت ندوہ میں نکالنے والا ہوں آپ سرپرستی کریں، مذہب حنفیہ کو حق سمجھتا ہوں اور اس ندوہ کو باطل۔ اگر آپ لوگ آمادہ ہوں تو ندوہ حنفیہ پٹنہ میں بفضلہ تعالیٰ قائم کروں (مکتوبات علماء وکلام اہل صفا)

قاضی صاحب نے ان دونوں بزرگوں کی حوصلہ افزائی وسرپرستی میں جمادی الاولیٰ ۱۳۱۵ھ میں پٹنہ سے ماہنامہ تحفہ حنفیہ جاری فرمایا تین سال آٹھ ماہ یعنی جمادی الاولیٰ ۱۳۱۵ھ سے ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ تک غالباً قاضی صاحب نے خود ہی اس کی ادارت فرمائی۔ محرم ۱۳۱۹ھ سے مولانا ضیاء الدین پیلی بھیتی اس کے مدیر مقرر ہوئے اور تحفۂ حنفیہ کی آخری عمر ۱۳۲۷ھ تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔

تحفہ حنفیہ کے شماروں کو دیکھتے ہوئے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ تحفہ امام احمد رضا کے مشن کا ترجمان تھا جس میں امام احمد رضا کے فتاویٰ، کتابیں، نعتیہ کلام اور علمی ومذہبی اور تحریکی سرگرمیوں کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ تقریباً گیارہ سال تک تسلسل کے ساتھ نکلتا رہا اور ملک وبیرون ملک تک اس کے ذریعے امام احمد رضا کی تعلیمات ونظریات کی مؤثر تبلیغ وتعبیر اور تشریح وتشہیر ہوتی رہی۔ ۱۳۲۶ھ میں جب حضرت قاضی صاحب کا انتقال ہوا تو فکر رضا کی یہ بے باک ترجمان اپنے معاونین کی نظر کرم سے محرومی کے سبب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ تحفہ حنفیہ کے بند ہونے کے تقریباً گیارہ سال بعد استاذ زمن حضرت مولانا حسن رضا کے صاحب زادے حضرت مولانا حسنین رضا خاں نے امام احمد رضا کے سرپرستی میں محرم ۱۳۳۸ھ میں بریلی شریف

ے ماہنامہ الرضا جاری کیا ۔دس شمارہ نکالنے کے بعد پریس کی
دشواریوں اور طباعت کی الجھنوں کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ۱۳۳۸ھ
میں حنفی پریس کے نام سے اپنا پریس قائم کیا۔۱۳۳۹ھ ۔۱۹۲۰ء میں
تنظیم جماعت رضائے مصطفیٰ کی بنیاد پڑی جس کے تحت ماہنامہ الرضا
بند ہونے کے بعد ۱۳۴۵ھ میں یادگار امام احمد رضا کے نام سے بریلی
شریف سے حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں کی سرپرستی میں شائع کیا
گیا۔اگر ترتیب وار دیکھیں تو ماہنامہ تحفہ حنفیہ عظیم آباد ۱۳۱۵ھ میں
ماہنامہ الرضا بریلی شریف ۱۳۳۸ھ میں ماہنامہ یادگار رضا بریلی
شریف ۱۳۴۵ھ میں جاری ہوا اس سے صاف ظاہر ہے کہ تحفہ حنفیہ
کو ماہنامہ الرضا پر ۱۳ رسال کا ماہنامہ یادگار رضا پر ۲۰ رسال کا تقدم
حاصل ہے پھر مولانا شہاب الدین رضوی کا یہ لکھنا کہ ''ماہنامہ الرضا اہل
سنت کا پہلا اخبار ہے'' تاریخی اعتبار سے کیسے صحیح قرار دیا جاسکتا ہے؟

مطبع حنفیہ پٹنہ:- قاضی صاحب نے ۱۳۱۵ھ ہی میں ''مطبع اعوان اہل سنت وجماعت'' کے تاریخی نام سے ایک مطبع بھی قائم فرمایا جس کا عرفی نام ''مطبع حنفیہ پٹنہ'' تھا۔دنیائے سنیت کا یہ پہلا اشاعتی مرکز تھا جہاں سے علماء اہل سنت کی سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں بالخصوص تصانیف رضا کی اشاعت میں اس مطبع نے مثالی کارنامہ انجام دیا۔

مطبع حنفیہ کی اشاعتی خدمات پر اب تک کوئی قابل ذکر تحریر تلاش کے باوجود میری نگاہ سے نہیں گذری اس لئے اشاعت کی حتمی تعداد بیان کرنی میرے لئے مشکل ہے تاہم مختلف اہل وفن نے اپنی اپنی تحریر دں میں اس تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اس حوالہ سے تیقن کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے مطبع حنفیہ کی اشاعتیں سینکڑوں میں ہیں جن میں سے سو یا اس سے زائد کتابیں صرف امام احمد رضا کی ہیں۔

چنانچہ حیات اعلیٰ حضرت کے مقدمہ میں فقیہ النفس حضرت مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی فرماتے ہیں:

''آپ کی جملہ تصانیف جو اس وقت دوسو کے قریب تھیں ان کا نصف حصہ یعنی تقریباً ایک سو کتابوں کا پہلا اڈیشن یہیں مطبع تحفہ حنفیہ سے شائع ہوا''

اگر چہ سو کتابوں کی اشاعت کی مکمل فہرست ہمارے پاس نہیں ہے مگر تلاش وتحقیق کے ذریعہ ان کی جامع فہرست یقیناً تیار ہوسکتی ہے۔

حضرت ملک العلماء نے ''**المجمل المعدد لتالیفات المجدد**'' کے نام سے امام احمد رضا کی تصانیف کی فہرست مرتب کی جو مطبع حنفیہ پٹنہ سے شائع ہوئی اور جو انہیں کے اضافے کے ساتھ حیات اعلیٰ حضرت جلد دوم میں بھی شائع ہے۔اس میں مطبع حنفیہ سے شائع ہونے والی امام احمد رضا کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۲۹ ہے مگر تحفہ حنفیہ کے بعض شماروں کے مطالعہ سے یقینی طور پر حضرت ملک العلماء کے ذکر کردہ تعداد کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔خدا بخش لائبریری میں چونکہ تحفہ کی مکمل فائلیں نہیں ہیں اس لئے حتمی تعداد بیان کرنا میرے لئے بھی مشکل ہے تاہم جو فہرست بن سکی ہے اسے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔شاید محققین رضا کو تصانیف رضا کی اولین اشاعت کے تعلق کچھ سے کام آسکے۔

(۱) الاحلیٰ من السکر لطلبۃ سکر اوسر (فقہ) مطبع حنفیہ پٹنہ
(۲) سبحان السبوح عن عیب کذب مقبوح (عقائد، رد وہابیہ)
(۳) الزہر الباسم فی حرمۃ الزکاۃ علیٰ بنی ھاشم
(۴) تجلی المشکوٰۃ لانارۃ اسئلۃ الزکاۃ
(۵) حقۃ المرجان لمہم حکم الدخان
(۶) سل السیوف الہندیہ علیٰ کفریات بابا النجدیہ
(۷) وشاح الجید فی تحلیل معانقۃ العید
(۸) النھی الحاجز عن تکرار صلوٰۃ والجنائز
(۹) نطق الہلال بارخ ولادۃ الحبیب والوصال
(۱۰) الجام الصاد عن سنن الضاد
(۱۱) افصح البیان فی حکم مزرع ہندوستان
(۲) حلیۃ الاسماء لحکم بعض الاسماء
(۱۳) رامیان راغبان معروف بہ دفع دیغ زاغ
(۱۴) اوفی اللمعۃ فی اذان الجمعہ
(۱۵) حدائق بخشش
(۱۶) ثلج الصدر لایمان القدر
(۱۷) تیسر الماعون لسکن فی الطاعون
(۱۸) فقہ شہنشاہ وان القلوب بید المحبوب بعطاء اللہ

(۱۹) مقال عرفا باعزاز شرع وعلماء
(۲۰) ذریعہ قادریہ
(۲۱) اخباریہ کی خبر گیری
(۲۲) اجتناب العمال فی فتاویٰ الجہال
(۲۳) ھدم النصرانی والتقسیم الایمانی
(۲۴) آمال الابرار وآلام الاشرار
(۲۵) مبین الھدیٰ فی نفی امکان مثل المصطفیٰ
(۲۶) چابک لیث براہل حدیث
(۲۷) حضور جان نور
(۲۸) السوء والعقاب
(۲۹) ازالۃ العار
(۳۰) المعتقد المنتقد
(۳۱) فتوی عالم ربانی
(۳۲) شفاء الوالہ فی ضوء الحبیب ومزارہ ونعالہ
(۳۳) سکین ونورہ بر کاکل پریشان ندوہ

یہ فہرست یقیناً ادھوری ہے جس کی مکمل ماہنامہ تحفہ حنفیہ کے تمام شماروں کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکے گی کوشش جاری ہے۔ ان شاءاللہ''

امام احمد رضا اور عظیم آباد'' کے عنوان سے زیر ترتیب کتاب میں اس عنوان پر قارئین تفصیلی حالات ملاحظہ کریں گے۔

ان کے علاوہ تاج الفحول حضرت مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا شاہ عبد الصمد شہسوانی، مولانا وصی احمد محدث سورتی، مفتی عمر الدین ہزاروی، مولانا عبد الواحد رامپوری، مولانا یونس علوی وغیرہ کی کتابیں یا مضامین شامل ہوتے تھے جب کہ بہار کے قلم کاروں میں حضرت شاہ بدر الدین پھلواروی، شاہ اکبر دانا پوری، شاہ محسن دانا پوری، مولانا عبد الرحمن محیؔ، مولانا قاضی عبد الوحید فردوسی وغیرہ کی کتابیں اور مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے جس رسالہ کو ان جید علماء ومشائخ کا قلمی تعاون مل جائے اس کے معیار کی بلندی کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ تحفہ کی مقبولیت اور بیرون ملک اس کی شہرت کی وجہ یہ تھی کہ علمی اعتبار سے تحفہ بہت ہی معیاری رسالہ تھا۔ اس کے موضوعات میں تنوع اور اس کی زبان سہل اور شستہ تھی۔ اسے ملک کے اکابر علماء ومشائخ کی سرپرستی اور ان کا قلمی تعاون حاصل تھا بالخصوص مجدد عصر امام احمد رضا کی کتابیں، فتاویٰ اور نعتیں مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

کیا انقلاب ۱۸۵۷ء کے پیچھے قومی جذبہ کارفرما تھا؟

مولانا نازیشان احمد مصباحی، مدیر جام نور

معروف صحافی راج کشور نے بڑی سنسنی خیز بات لکھی ہے کہ:

"دیرسا ور کر کو چھوڑ کر ظاہری طور پر کسی دوسرے ہندوستانی لیڈر نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو سنجیدگی سے نہیں لیا- حالاں کہ جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تاتیہ ٹوپے، کنور سنگھ وغیرہ کے چہرے عوام کے سامنے آتے رہے، یہاں تک کہ گاندھی، نہرو، سبھاش، پٹیل، لوہیا وغیرہ نے بھی ۱۸۵۷ء کو بہت اہمیت نہیں دی ہے-صرف ۸۰-۷۰ (سال) بعد ہی اتنے بڑے واقعہ کو اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی فراموش کر دیا گیا ہے، یہ بات کچھ پراسرار لگتی ہے-" (روز نامہ راشٹریہ سہارا (لکھنؤ) اشاعت ۱۳ر مئی ۲۰۰۷ء)

لگتی ہے نہیں، یہ بات ہے ہی بڑی پر اسرار اور ان اسرار کو کریدنے میں مزید تاخیر کرنا ٹھیک بھی نہیں- تاریخ کے یہ سربستہ راز اگر کھل گئے تو مسلم فکر کو نئی روشنی ملے گی، ایسی روشنی جس میں اسے اپنے تاریخی فریب کا حال معلوم ہو سکے گا اور شاید اس کی برکت سے مسلم رگوں میں عمل کی نئی چنگاریاں بھی پھوٹ پڑیں۔

اپنی تاریخی تنگ دامانی کا برملا اعتراف کرتے ہوئے بڑے افسوس کے ساتھ ہمیں یہ اظہار بھی کرنا پڑتا ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کرنے کے لیے نہ میرے پاس قابل لحاظ کتابیں ہیں اور نہ مناسب وقت، تاہم میرے سامنے آڑی ترچھی چند تاریخی لکیریں اور غیر مبہم سرے ہیں جن کو آپس میں جوڑنے سے ان اسرار تک پہنچنے کا امکان روشن ہو جاتا ہے جن کی وجہ سے تاریخ کے ایک عظیم سانحے کو نظر انداز کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے اور شروع سے اب تک مورخین اس کے حقیقی مقصد پر پردہ ڈالتے ہوئے اس کے ظاہری اسباب کی تفتیش وتحقیق میں لگے رہے ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے مورخین کے معاندانہ رویہ کی وجوہات دریافت کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے انقلاب ۱۸۵۷ء کے مقصد پر غور کرنا ہوگا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے ۱۸۵۸ء میں اسباب بغاوت ہند لکھی۔ اس سے قبل خطوط، روز نامچے اور دیگر دستاویزات تو ایسے ملتے ہیں جن میں انقلاب کی روداد موجود ہے، مگر سرسید کی یہ کتاب تجزیاتی نوعیت کی پہلی تحریر ہے۔ خاں صاحب انگریزوں کے وفادار شخص تھے، بغاوت مخالف تھے، اس لیے انہوں نے بالعموم اسی ذہنیت وفکر کی ترجمانی کی، انگریز جس کے حامل تھے، تاہم اس کتاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر دبے لفظوں میں ہی سہی ڈھیر سارے حقائق جمع کر دیے گئے ہیں، اس میں انگریزوں کے مظالم بھی ہیں، عوام کی غلط فہمی بھی ہے اور اس کے مذہبی، سماجی اور سیاسی اسباب کا ذکر بھی ہے، جو اس انقلاب کے فی الجملہ محرک تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے ساتھ آج اس کتاب کے بھی ۱۵۰ سال پورے ہونے کو آئے اور اس پورے دور میں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس میں جو نکات اٹھائے گئے تھے آج تک مسلسل ان کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ میری رائے میں یہ اسلوب اور یہ باتیں مبنی بر صداقت ہونے کے باوجود سخت گمراہ کن ہیں مبنی بر صداقت اس لیے کہ یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ برطانوی حکومت ایک غیر ملکی حکومت تھی، اس کی فکر، مذہب اور تہذیب وثقافت ہندوستانیوں سے مختلف تھی، نیز وہ ایک تجارتی کمپنی تھی، جو یہاں کے مال واسباب جمع کر کے برطانیہ بھیجا کرتی تھی، ایسی حکومت کے خلاف اگر بغاوت ہوتی ہے تو فطری طور پر اس کے اسباب مذہبی بھی ہوں گے، سماجی اور سیاسی بھی اور معاشی واقتصادی بھی۔ یہ ایک واضح صداقت ہے جس کے لیے نہ کسی قوی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ قاطع برہان کی۔ لیکن ان واقعی اسباب کا تجزیہ ایک گمراہ کن رویہ اس لیے ہے کہ اس تجزیہ نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی مقصود کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ان سارے اسباب وعوامل کو بسر وچشم تسلیم کرنے کے بعد اگر آپ یہ سوال اٹھائیں کہ ان اسباب ومحرکات

کے بعد جو عوامی جنگ برپا ہوئی اس کا مقصود کیا تھا؟ تو سر سید سے لے کر موجودہ مورخین تک اس کے جواب سے یا تو عاجز و خاموش نظر آئیں گے یا ایسی باتیں کہیں گے جو تاریخ کے طالب علم کو روشنی عطا کرنے کی بجائے اسے تاریکیوں میں دھکیل دینے والی ہوں گی، مثلاً سر سید کی کتابوں کا نام ہی لے لیجیے، ''سرکشی ضلع بجنور'' ہندوستانیوں کی ''سرکشی'' کو بتا رہا ہے تو ''اسباب بغاوت ہند'' ان کی ''بغاوت'' کی نشاندہی کر رہا ہے۔ یہ دونوں مذموم صفات ہیں اور انہی صفات کو سر سید نے اس انقلاب کا مقصود بتانے کی مبہم کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے نہ سرکشوں کا کوئی نیک مقصود ہوتا ہے اور نہ باغیوں کی کوئی مشترکہ پلاننگ ہوتی ہے۔ اس طرح کچھ نہ کہہ کر سر سید نے یہ کہہ دیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ چند سرکش اور باغی افراد کی بے ہنگم اور غیر دانش مندانہ کوشش تھی۔

انگریز بھی اس بڑے اور وسیع جہاد کو چند فوجیوں کی بغاوت اور بے وفا، کم عقل اور احسان فراموش ہندوستانیوں کا غدر کا نام دیتے رہے، غالباً وی۔ ایس ساورکر کی مراٹھی کتاب ''ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی'' سے، جو انقلاب ۱۸۵۷ء کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی، اسے ''پہلی جنگ آزادی'' کے نام سے موسوم کرنے کی روایت قائم ہوئی۔ راج کشور لکھتے ہیں:

''یہ بھی کم پر اسرار نہیں ہے کہ ابھی حال تک ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ایک بہت ہی محدود ضمن میں دیکھا جاتا رہا، وہ محض سپاہیوں کی بغاوت نہیں تھی، جیسا کہ انگریز چاہتے تھے کہ اسے مانتے رہیں، بلکہ معاملہ اس سے بہت آگے کا تھا، یہ بات ہمارے ماہرین اور دانش ور بھی ہم سے راز میں رکھتے ہیں......... جواہر لال نہرو نے ''ڈسکوری آف انڈیا'' کے نام سے ہندوستان کی جو تاریخ تحریر کی ہے اس میں وہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کو کچھ لوگوں کی بغاوت کہہ کر خارج کر دیتے ہیں۔ اس طرح کی غیر ذمہ داری کے پیچھے حقیقت یہ لگتی ہے کہ ہندوستان کے ابھر رہے انگریزی نواز متوسط طبقہ نے ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی قوم پرست اہمیت کو نامنظور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔'' (ایضاً)

جناب راج کشور کی یہ تحریر معاصر مورخین کے فکر و مزاج کی ترجمانی کر رہی ہے۔ موجودہ مورخین کی اکثریت اسی نتیجے پر پہنچی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ ہندوستانی قومیت پرستانہ جذبے کے تحت لڑی گئی۔ مورخین اپنے اس موقف کی تائید میں ہر مذہب وملت کے افراد کی شرکت، ملا سے پنڈت تک اور راجہ سے نواب تک ہر طبقے اور ہر سطح کے افراد کی موجودگی کو پیش کرتے ہیں اور اس انقلاب کی ناکامی کے باوصف اس کے اس پہلو کو بڑے طمطراق سے پیش کرتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں ''قومیت'' کے جذبے میں لڑی جانے والی کامیاب جنگ آزادی اسی انقلاب ۱۸۵۷ء کا نتیجہ تھی، مورخین کی یہ بات بظاہر خواہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو لیکن سخت گمراہ کن ہے، گمراہ کن اس لیے ہے کہ اگر آزادی ۱۹۴۷ء کی طرح انقلاب ۱۸۵۷ء بھی قومیت کے جذبے کے تحت برپا کیا گیا ہوتا تو اتنی آسانی سے مسٹر نہرو جنہیں گاندھی کے بعد ہندوستان کا دوسرا قومی نمائندہ سمجھا جاتا ہے اتنی آسانی سے ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں انقلاب ۱۸۵۷ء کو نظر انداز نہیں کر دیتے۔ اس لیے ہمیں اس اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ موجودہ مورخین جس تحقیق تک پہنچے ہوئے ہیں وہ ۱۸۵۷ء کی اصل شبیہ کو پیش کرنے کی بجائے بری طرح اس کی صورت مسخ کر رہی ہے، افسوس کہ سارے مسلم قلم کار بھی مورخین کی اس تحقیق کو اپنے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھ بیٹھے ہیں، انہیں کیا معلوم کہ یہ تصور ان کے لیے نعمت نہیں لعنت ہے۔ اس سے جہاں تھوڑی دیر کے لیے انہیں یہ تسلی مل جاتی ہے کہ آزادی ۱۹۴۷ء کے اصل بانی وہی ہیں کیوں کہ وہی ۱۸۵۷ء کے ہیرو ہیں تو دوسری طرف یہ تھپکی ان کو ان کے حقیقی مقام کے شعور سے یکسر غافل کر دیتی ہے۔

اب سوال ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے پیچھے کون سا جذبہ اور کون سا مقصد کارفرما تھا؟ اس کے لیے درج ذیل اقتباسات پر نظر کرنا چاہیے۔

ایک انگریز مورخ لکھتا ہے: ''اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہو گئی کہ یہ اسلامی بغاوت تھی'' (تاریخ دعوت و جہاد: برصغیر کے تناظر میں، ہندوستان پبلی کیشنز دہلی اشاعت بار دوم ۱۹۹۶ء، ص: ۱۷۱)

منشی ذکاء اللہ عروج سلطنت انگلشیہ ص: ۷۱۲ پر لکھتے ہیں: ''ایک انگریز کا شیوہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ ہر ایک سے پوچھتا کہ

ہندو ہے یا مسلمان، جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا۔'' (ایضاً)

ہنری ہملٹن نے اپنی کتاب Late Rebillions in India and our future policy انقلاب ۱۸۵۷ء سے صرف ایک سال بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں لکھی تھی، وہ اپنی اس کتاب میں کہتا ہے: ''میں نے پہلے کہا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر وہ اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے۔ ''(مسلمان) خلیفہ اول کے وقت سے لے کر موجودہ زمانہ تک عیسائیت کے ساتھ مغرور، غیر روادار اور ظالم رہے ہیں، ہمیشہ ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعے سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشو ونما ہو، مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔'' (ایضاً)

ڈاکٹر رفیق زکریا لکھتے ہیں: ''۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بازیافت کی بھرپور کوشش کی لیکن اس بار انہوں نے بالکل مختلف قسم کے حالات میں ایک انوکھا کردار نبھانے کی کوشش کی''۔ (ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، ص:۱۹)

آگے لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کے لیے ۱۸۵۷ء کی سرکشی برطانیہ کے خلاف محض ایک بغاوت نہ تھی، بلکہ وہ ان کی کھوئی مراعات کی بازیابی کی آخری جان توڑ کوشش تھی، اس وقت ہندوستان میں ان کی تعداد پانچ کروڑ تھی لیکن ان کے پاس قیادت اور تنظیم کا فقدان تھا'' (ایضاً:۲۲)

سر جارج کیمبل نے اس انقلاب کے بعد لندن کے اخبار ''دی ٹائمز'' میں اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں: ''سب سے واضح، مقبول اور شدید نظریہ یہ ہے کہ بغاوت مسلمانوں نے کی تھی۔'' (ایضاً:۲۳)

جنرل میجر الیف جے ہیرٹ کا بیان ہے کہ: ''ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ہم نے تفتیش کی ہے مسلمانوں کی سازش کے آثار پائے ہیں، لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا برہمنوں اور پجاریوں نے عیسائیوں کے خلاف جہادی پرچار کیا ہو۔'' (پی سی جوشی، انقلاب اٹھارہ سو ستاون ص: ۳۶/۳۵)

کیا ان حقائق کے بعد بھی انقلاب ۱۸۵۷ء کو قومیت پرستانہ جذبات کا نتیجہ قرار دینا انصاف و دیانت کا گلا گھونٹنے کے ہم معنی نہیں ہے؟ اور کیا اب بھی اس کے ''اسلامی انقلاب'' ہونے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟ مذکورہ حوالے نظر میں رکھتے ہوئے غالب نیم جان کی بھی سنیے: ''اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔'' (غالب شاعر و مکتوب نگار: ص:۱۷۷، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)

اگر یہ جنگ ''ہندوستانی قومیت'' کی بنیاد پر لڑی گئی ہوتی تو شکست کے بعد ''ہندوستانی'' مارے جاتے، صرف بے چارے مسلمانوں پر ہی بجلیاں نہ گرتیں۔ ''ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیمور یہ کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا، بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔'' (تاریخ دعوت و جہاد: برصغیر کے تناظر میں، ص:۱۷۲)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اگر انگریز خائف تھے تو صرف مسلمانوں سے، انقلاب کے فوراً بعد جنرل رسل نے ''دی ٹائمز'' کو یہ خط لکھا: ''ہمیں شمع محمدی کے پروانوں کے ساتھ جو معاندت ہے وہ اس مخاصمت کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جو ہم شیو Shiva اور وشنو کے پرستاروں کے ساتھ رکھتے ہیں، مسلمان ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں، اگر ہم بیک جنبش محمد کی حدیثوں اور معبدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ بات عیسائی مذہب اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے فال نیک ثابت ہوگی۔'' (ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج:۲۳)

شعبہ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر سید عزیز الدین احمد ایک مصاحبے میں فرماتے ہیں: ''فتویٰ جہاد کا آغاز شاہ عبد العزیز سے شروع ہوا، پھر بعد میں دہلی کے بہت سارے علماء نے فتویٰ جہاد دیا اور نہ

صرف دہلی کے بلکہ علی گڑھ، مرادآباد اور دوسرے مقامات کے علماء نے بھی اپنے اپنے طور پر فتوی جہاد صادر کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی اپنی مسجد میں جمعہ کے خطبات میں انگریزوں کے خلاف تقریریں کیں اور عوام کو ان سے لڑنے کی ترغیب دلائی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جوش و جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ آمادہ جنگ ہو گئے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے بعد میں انتقام بھی زیادہ مسلمانوں سے لیا، سب سے زیادہ مسلمانوں کو کچلا، پھانسی دی، برباد کیا، کالا پانی بھیجا، اتنی سخت کارروائی انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہیں کی۔" (جام نور، دہلی، اگست ۲۰۰۷ء)

معاصر عالم دین مفتی آل مصطفیٰ مصباحی ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: "۱۸۵۷ء کا انقلاب جو مختلف ظاہری و باطنی عوامل کے نتیجے میں رونما ہوا، شرعی نقطۂ نگاہ سے مسلمانان ہند کے لیے انگریزوں کے خلاف جہاد تھا، وجہ یہ ہے کہ جہاد کے فرض ہونے کی جو شرائط ہیں وہ انگریزوں کے بے پناہ ظلم و ستم اور سفاکیت و حیوانیت کے نتیجے میں پائی جاتی تھیں۔" (جام نور، دہلی، اگست ۲۰۰۷ء)

۱۸۵۷ء کا منصفانہ مطالعہ یقینی طور پر اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ مسلم/اسلامی حکومت کے قیام کی آخری کوشش تھی، اس کو اب تک غدر، بغاوت، انقلاب، پہلی جنگ آزادی جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر لفظ اس سانحے کی صحیح تعبیر سے قاصر ہے، ویسے خوشی ہے کہ ماہ و سال گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ حجابات اٹھ رہے ہیں اور اس معرکہ کے رخ سے غبار چھٹ رہے ہیں، آخری پردہ ابھی بھی پڑا ہوا ہے اور یہ اس وقت اٹھے گا جب تاریخ کے طالب علم "پہلی جنگ آزادی" سے ایک زینہ آگے بڑھ کر اسے "آخری جہاد" باور کر لیں گے۔ ایسا جہاد جس میں شکست کے بعد رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمان نہ صرف جہاد کا عزم چھوڑ بیٹھے، بلکہ اس کی سوچ سے بھی گھبرانے لگے، ایسا جہاد جس میں شکست کے بعد ہندوستان میں دوبارہ اسلامی/مسلم حکومت کے قیام کا تصور منتا ہی چلا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو جمہوریت کے ممکنہ مواقع سے بھی محروم کر دیے جائیں گے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی قومیت سے جوڑنا کیوں غلط ہے؟:- موجودہ مورخین جو انقلاب ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی قومیت کی جنگ قرار دیتے ہیں اور اپنی اس رائے کو باب تحقیق میں حرف آخر گمان کرتے ہیں، وہ اپنے موقف کے اثبات میں میکانکی طرز استدلال اختیار کرتے ہیں اور بظاہر ان کی بات دو دو چار کی طرح عقل لگتی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے استدلال کا تجزیہ ضروری ہے تاکہ توہمات کے پردے چاک ہو سکیں۔ ان کے دلائل کچھ اس طرح ہیں:

(۱) انگریزوں کے مظالم کا نشانہ مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔

(۲) انگریزوں کی تعلیم اور ثقافت اسلام اور ہندومت دونوں کے لیے ہلاکت خیز تھی۔ اس لیے

(۳) اس انقلاب میں ہندو مسلم سب شامل تھے۔

(۴) اس کے اندر راجا بھی تھے نواب بھی، ملا بھی تھے اور پنڈت بھی، ہر مذہب کے فوجی بھی تھے اور عوام بھی۔

(۵) غداروں میں بھی دونوں مذاہب کے لوگ موجود تھے۔

مورخین کی دلیل کے یہ سارے مقدمات ناقابل انکار تاریخی حقائق پر مبنی ہیں، لیکن بایں ہمہ ان سے یہ منطقی نتیجہ اخذ کرنا کہ "ہندوستانی قومیت" نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جمع کر دیا تھا اور اسی کی بحالی کے لیے ۱۸۵۷ء کی معرکہ آرائیاں ہوئیں، مغالطہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور اس مغالطہ سے پردہ اس وقت اٹھتا ہے جب مذکورہ بالا مقدمات کے ساتھ درج ذیل حقائق کو بھی مدنظر رکھیں:

(الف) ہندوستان کے اصل باشندے وہ قومیں ہیں جو آج بالعموم ایس سی اور ایس ٹی کے خانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

(ب) آریہ قوم، جو موجودہ حکمراں جماعت کی غالب اکثریت ہے، وسط ایشیا سے آنے والی حملہ آور قوم ہے۔ آریہ قوم سے ہندوستانیوں کی لڑائی ہوئی، شکست و فتح اور کسر و انکسار کے بعد آریہ قوم غالب آئی اور یہاں کی حکمراں جماعت بن گئی۔ اور باوجود اس کے کہ اس نے اصلی ہندوستانیوں پر مظالم روا رکھے تاہم رفتہ رفتہ وہ بھی ہندوستانیوں کے ساتھ منضم اور ان کے لیے قابل قبول ہو گئی۔

(ج) اسلام تجارت و تصوف کے ہمراہ ہندوستان پہنچا، پھر عرب و ایران کے مسلم بادشاہوں نے حملے کیے، ایک زمانے تک ہندوستانی

ان کا مقابلہ کرتے رہے بالآخر مسلمان غالب آئے اور یہاں کے تخت و تاج کے مالک ہو گئے۔ لیکن انہوں نے زور و جبر کی بجائے مساوات اور رواداری کی مثال قائم کی، دینی وفکری حریت کے ساتھ غیر مسلموں کے لیے سیاسی مناصب کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔ اسے ہندوستانیوں نے بہت پسند کیا اور خوب فائدہ اٹھایا۔ تاہم قوموں کا نفسیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ آریہ قوم کے اندر اقتدار سے محرومی کی کسک ضرور باقی رہی ہوگی۔

(د) ۱۶۰۰ء میں بغرض تجارت انگریز ہندوستان آئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ مسلم حکمراں تجارت کے دشمن نہ تھے، انہوں نے اس کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کے لیے سہولیات بھی فراہم کر دیں۔ انگریز رفتہ رفتہ تجارت سے حکومت کی طرف بڑھنے لگے، دہلی کا شہنشاہ حاکم رہ کر بھی محکوم بن گیا۔

(ہ) مغل دور میں مرکزی کمان مغل شہنشاہ کے پاس ہوتا اور ریاستی وعلاقائی حکومتیں نوابوں، راجاؤں اور مہاراجوں کے پاس، وہ اپنے مقبوضہ علاقوں میں بڑی حد تک آزاد تھے، شہنشاہ کے لیے صرف مرکزی اقتدار تسلیم کرتے۔

(و) انگریزوں نے جب تجارت سے حکومت کی طرف بڑھنا شروع کیا تو شہنشاہ کے اقتدار کے ساتھ ان نوابوں اور مہاراجوں کا اقتدار بھی خطرے میں پڑ گیا۔

(ز) مغل دور میں عوام کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی، انگریزوں کے زور بڑھنے کے ساتھ ان کی آزادی محدود ہونے لگی تھی۔ اس لیے عوام ہر صورت میں انگریز مخالف رہے۔

(ح) انگریزوں سے نفرت پورے ہندوستان میں تھی، جس نے ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف کئی بار صف آرا کر دیا۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی، ۱۷۶۴ء میں معرکہ بکسر، ۱۷۷۴ء میں کارزار روہیلہ، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کا خونی تصادم اہم واقعات ہیں۔ انگریزوں نے ۱۸۰۱ء میں نواب واجد علی شاہ لکھنؤ اور ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم سلطان دہلی کو ایک معاہدہ کا پابند کر دیا جس کے تحت وہ نام کے حکمراں رہ گئے۔

(ط) جب شہنشاہ عاجز، ۸۰۰ سالہ مسلم اقتدار اعلیٰ خطرے میں اور اسلامی آزادی زیر حبس نظر آئی تو علماء کی جماعت نے عوامی جہاد کے لیے ماحول سازی شروع کر دی۔ یہ جماعت نہ صرف یہ کہ اس دور کی نمائندہ و سرکردہ تھی بلکہ اس کے اکثر افراد منصب قضا اور منصب صدر الصدور وغیرہ پر فائز تھے۔ انہوں نے زیریز میں اپنا کام شروع کیا۔

(ی) دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ۱۸۴۶ء میں اپنے شیخ محراب شاہ قلندر گوالیاری کے حکم سے دہلی آئے اور انگریزوں سے جہاد کی بابت دہلی کے سرخیل علماء سے تبادلۂ خیالات کیا۔ دہلی کے صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی نے ماحول سازی کے لیے آپ کو آگرہ روانہ کر دیا۔ آپ نے وہاں مجلس علماء قائم کی اور پورے ملک میں جہاد کی تحریک شروع کر دی۔ انگریزی مورخ میلسن لکھتا ہے: ''بے شک اس تمام سازش کا رہنما مولوی (احمد اللہ) تھا اور یہ سازش تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی............ میں سمجھتا ہوں کہ یہی شخص بغاوت کی سازش کا دماغ و دست و بازو تھا۔ اپنے سفر کے دوران اسی نے وہ اسکیم تیار کی جو چپاتی اسکیم کہلاتی ہے۔'' (تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء)

مولانا یٰسین اختر مصباحی رقم طراز ہیں: ''مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جنہوں نے ۱۸۴۶ء سے دلی، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ تک اپنی خفیہ مہم کا جال پھیلا رکھا تھا اور میرٹھ کے انقلابیوں میں بھی ان کے آدمی کام کر رہے تھے۔'' (ماہنامہ جام نور، دہلی اگست: ۲۰۰۷ء)

واضح رہے کہ یہی وہ مقامات ہیں جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے براہ راست متاثر ہوئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے نیٹ ورک پر غور کیجیے اور ان سے جڑے ہندوستان کے پائے کے علماء مفتی صدر الدین آزردہ، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا کفایت علی کافی، مفتی عنایت احمد کاکوری، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر مولانا وزیر خاں اکبر آبادی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کی کوششوں، معرکہ آرائیوں اور فتووں اور تقریروں کا جائزہ لیجیے تو انقلاب ۱۸۵۷ء کی ایک الگ ہی صورت نمودار ہوتی ہے اور ''ہندوستانی قومیت'' کی بات ایک فریب نظر معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہاں مزید تدبر کریں تو ''قومیت'' کی بات کرنے والوں کے دلائل کا ظاہری طلسم بھی ٹوٹ جاتا ہے، کیوں کہ:

(ا) یہ سچ ہے کہ ہندو بھی انگریزوں کے مظالم کا نشانہ تھے، لیکن

ان پر ظلم کی چکی بہت ہلکی تھی، نیز انگریزوں کی عنایات بھی ان پر خوب خوب رہیں، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی اور بعد میں خاص طور پر ہندوؤں کو اعلیٰ مناصب ملے۔

(۲) انگریزوں کی تعلیم و ثقافت اسلام کے ساتھ ہندومت کے بھی خلاف تھی، تاہم ہندو سمجھوتا کے لیے بڑی حد تک تیار تھے جب کہ مسلمان کسی طور پر انگریزی تعلیم و ثقافت سے مفاہمت کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جب کہ مسلمان اس سے محروم رہ گئے۔

(۳) یہ بھی سچ ہے کہ اس انقلاب میں ہندو مسلم سب شامل تھے، لیکن شمولیت کی نوعیت الگ الگ تھی، عوامی سطح کی بات کیجیے تو ہندو مسلم سب کے سب انگریزی حکومت سے بیزار تھے، کیوں کہ وہ سخت گیر غیر ملکی حکومت تھی، لیکن مسلم عوام میں ایک اضافی جذبہ بھی تھا، یعنی اپنی حکومت کی بازیافت۔

(۴) یہ بھی سچ ہے کہ اس انقلاب میں نوابوں کے ساتھ راجا مہاراجا بھی شریک تھے، لیکن ان سب کی شراکت کے پس پردہ مرکزی اقتدار کے تحفظ کے ساتھ ایک بڑا عامل اپنے اقتدار کا تحفظ بھی تھا، پنڈت اور ہندو فوجی اس لیے انگریزوں کے خلاف صف آراء ہوئے کہ ان کا مذہب بھی خطرے میں تھا۔

(۵) یہ بھی سچ ہے کہ غداروں میں بھی دونوں مذاہب کے لوگ موجود تھے، لیکن دونوں کی موجودگی میں فرق ہے، بعض مسلمان شخصی طور پر اپنے وقار کے تحفظ یا اقتدار میں شراکت کی امید پر آمادۂ غدر ہو گئے، جب کہ ہندوؤں کو انگریزوں نے ''من حیث القوم'' مسلمانوں کے خلاف سینہ سپر ہونے اور انہیں کمزور کرنے کے لیے برانگیختہ کیا۔

الحاصل یہ کہ مسلمان اسلام کے لیے بھی لڑ رہے تھے اور اپنے مرکزی و علاقائی اقتدار کے تحفظ کے لیے بھی، جو دور مغل میں انہیں مکمل طور سے حاصل تھا، اور مسلمان غدار صرف اپنی نحوست سے اپنے علاقائی اقتدار کے تحفظ یا اس کے حصول کی امید میں غداری پر اترے ہوئے تھے جبکہ ہنود کے اندر ایک اضافی جذبہ ان کے ہاتھوں سے ملک چھیننے والے مسلمانوں کے زوال نے بھی پیدا کر دیا تھا، یا انگریزوں کی سازش سے پیدا کیا جا رہا تھا۔ اس حقیقت کو گزشتہ صفحات میں نقل کیے گئے حوالوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے، خاص طور سے جنرل میجر ایف۔ جے۔ ہیرائٹ کا یہ بیان کہ ''ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں''۔ (انقلاب ۱۸۵۷ء، ص:۱۳۶ از پی جوشی)

انقلاب ۱۸۵۷ء کو قومی جذبہ سے جوڑنے کی وجہ اگر صرف یہ ہے کہ اس میں ہندو اور مسلمان شریک تھے اور دونوں اپنے مذہب اور اپنے اقتدار کے لیے لڑ رہے تھے تو یہ بات سچ تو ہو گی لیکن بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی۔ ☆☆☆

سلفی حضرات سے متعلق ابن الجوزی کا موقف

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی

حافظ عبدالرحمٰن بن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۹۷ھ) اپنے زمانے کے مشہور حنبلی عالم دین اور میدان وعظ کے شہسوار تھے۔ ان کے آہوئے قلم سے تین سو سے زائد نافۂ مشک کتابوں کی شکل میں نکل کر سامنے آئے۔ "تلبیس ابلیس" میں پورے اسلامی معاشرہ اور خصوصیت کے ساتھ صوفیہ پر جارح تنقید اور موضوعات حدیث کے بیان میں بے اعتدالیوں کی وجہ سے مطعون بھی ہوئے۔ لیکن ان سب کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تمام تالیفات نافع اور امت مسلمہ کی اصلاح کرنے والی ہیں۔ انہی کتابوں میں ایک نام "صید الخاطر" کا ہے۔

دراصل اس کتاب میں حرم دل میں پرواز کرنے والے طائرِ خیال واحساس کو قید کر لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں فکر کی صداقت، بیان کی خوبی اس قدر نمایاں ہے کہ اس پر نو صدیاں بیت جانے کے باوجود قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ یہ عصر جدید کی کوئی تصنیف ہے۔

اس کتاب کی ایک فصل "سلفیون جهال" (نادان سلفی حضرات) میں انہوں نے متشابہ صفات باری تعالیٰ کے تعلق سے سلفی حضرات کے علمی موقف پر ضرب کاری لگائی ہے اور تشبیہ کے قائلین کو معرفت الٰہی سے بے بہرہ قرار دیا ہے۔ زیر نظر تحریر میں اسی فصل کا ترجمہ و تلخیص کے ساتھ بلا تبصرہ پیش خدمت ہے۔

علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں: مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو دعویِ علم رکھنے کے باوجود احادیث کو ان ظاہری معانی پر محمول کرتے ہوئے تشبیہ کا قول کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ان احادیث کو ان کی اصل پر باقی رکھ کر کیفیت بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاتے تو انہیں سلامتی نصیب ہو جاتی۔ کیوں کہ اگر کوئی ان مروی احادیث کو پڑھ کر کلام کئے بغیر آگے بڑھ جائے تو وہ نہ اس کے ظاہری معنی کے حق میں کوئی بات کہے گا اور نہ ہی اس کے خلاف۔ لیکن بات یہ ہے کہ تشبیہ صفات باری تعالیٰ کے قائلین کا دامنِ علم تنگ ہے۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ کلام کو غیر ظاہری معنی پر محمول کرنا ایک قسم کی تعطیل ہے۔ کاش! انہیں لغت کے دامن کی پنہائیوں کا اندازہ ہوتا تو وہ ایسا خیال نہ کرتے۔ ان لوگوں کی مثال حجاج بن یوسف کے سکریٹری کی سی ہے۔ جب حجاج نے اپنے سکریٹری سے "اقطع لسانها" اس وقت کہا جب حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس کی مدح میں یہ شعر کہہ کر فارغ ہوئیں:

إِذَا هَبَطَ الْحَجَّاجُ أَرضاً مَرِيضَةً
تَتَبَّعَ أَقْصىٰ دَاءِهَا فَشَفَاهَا

(جب حجاج بیمار سرزمیں پر اترتا ہے تو وہ تمام اسباب مرض تلاش کر کے اسے شفا بخش دیتا ہے) اور پھر سلسلۂ اشعار کو آگے بڑھانا چاہا تو وہ نادان سکریٹری محل کلام کو نہیں سمجھ سکا اور ظاہری معنی پر کلام کو محمول کر کے استرا لے آیا اور یہ سمجھا کہ خنساء کی زبان کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے حالانکہ حجاج کی مراد ظاہری کے معنیٰ کے خلاف تھی اور اس کے اس جملے کا مطلب یہ تھا کہ احسان کر کے اس کی زبان بند کر دو۔

یہی حال ان ظاہر بینوں کا بھی ہے جنہوں نے مروی آیات واحادیث کو اس کے معنیٰ میں کلام کئے بغیر قبول نہیں کیا۔ کیوں کہ اگر کوئی ان قرآنی آیات واحادیث کو پڑھ بس کر دے تو میں اس کی ملامت نہیں کرتا کیوں کہ یہی سلف کا طریقہ بھی رہا ہے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ظاہر حدیث اس معنیٰ کا اقتضا کرتا ہے اور محمول اس معنی پر کیا جاتا ہے لہٰذا یہ صحیح نہیں تو میں ایسے شخص کی ملامت کرتا ہوں۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ عرش پر حسی طور پر جلوس فرمائے ہوئے ہے اور وہ حسی طور

آسمان دنیا کی جانب نزول فرماتا ہے تو یہ ایک قسم کی زیادتی ہے۔ایسے شخص نے یہ قول، نقل کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنی حس کی بنا پر کیا ہے۔

مجھے اندلس کے باشندے ابن عبدالبر پر تعجب ہے جس نے اپنی کتاب "التمهید" میں اللہ عزّ وجل کے آسمان دنیا کی جانب نزول فرمانے والی حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسّی طور پر عرش کے اوپر ہے ورنہ حدیث مذکور میں لفظ "ینزل" کا کوئی معنیٰ نہیں رہ جائے گا۔ یہ ایک ایسے انسان کی گفتگو ہے جسے معرفت الٰہی حاصل نہیں کیوں کہ اس نے یہ بات حسّی نزول اجسام سے ادھار لے کر اسی پر حق تعالیٰ کی صفات کو قیاس کرتے ہوئے کہی ہے۔ان لوگوں کو اتباع حدیث سے کیا لینا دینا؟ انہوں نے تو ان لوگوں سے بھی زیادہ قبیح بات کہی ہے جو اس طرح کی آیات واحادیث میں تاویل کر کے ان کو غیر ظاہری معنیٰ پر محمول کرتے ہیں اور پھر یہی وہ لوگ ہیں جو متکلمین کو برا بھلا بھی کہتے ہیں۔

اے ہدایت کے طلب گار! اس طرح کی احادیث کے سلسلے میں عقل ونقل دو محکم اصلیں ہیں ان پر ہی تمام احادیث کو محمول کیا جائے گا۔منقول اصل تو رب تعالیٰ کا یہ فرمان ہے "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (الشوریٰ :۱۱) اس کے مثل کوئی شئی نہیں۔ جو اس اصل کو سمجھ لے گا صفات الٰہی کو حسّی معنیٰ کے مطابق محمول نہیں کرے گا۔اور عقلی قاعدہ یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ صانع مصنوعات سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ مصنوعات تغیر وتبدل اور اثر پذیری کی بنا پر حادث ہوا کرتی ہیں تو ثابت ہوگیا کہ صانع کی ذات قدیم ہے۔تعجب ہے اس شخص پر جو کلام کی نزاکتوں سے آشنا نہیں ہے۔کیا صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوا کہ موت کو جنت وجہنم کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا؟ کیوں کہ موت کی حقیقت سے آشنا افراد خوب مانتے ہیں کہ موت کوئی ذبح کے قابل چیز نہیں ہے۔ مان لیجئے! کوئی حدیث کی تاویل یہ استدلال کرتے ہوئے کرے کہ موت ایک عرضی چیز ہے جو بطلان حیات کو ثابت کرتی ہے اس لیے موت کو موت نہیں آسکتی لہٰذا معنیٰ حدیث کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تاویل کی جائے اور یہ کہا جائے کہ یہاں صورت قائم کر کے ایک مَثَل بیان کی گئی ہے تا کہ اس جیسی صورت سے اس معنیٰ کے فوت ہو جانے کا یقین ہو جائے۔

یوں ہی صحیح حدیث میں روایت ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران بدلیوں کی شکل میں آئیں گے۔اب اس حدیث میں تاویل کرتے ہوئے کوئی شخص یہ کہے کہ چوں کہ کلام کا بدلی کی شکل میں آنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کے مشابہ ہونا محتمل۔علاوہ ازیں منقول حدیث کو معطل بھی قرار دیا نہیں جاسکتا لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ ان دونوں سورتوں کا ثواب بدلی کی شکل میں سامنے آئے گا۔

اس پر ہم اس سے کہیں کہ آخر تم ان حقیقتوں کو ان کے ظاہر سے کیوں پھیر رہے ہو تو وہ مجھے یہی جواب دے گا کہ چوں کہ کلام کے اندر جسم یا مشابہ جسم ہونے کی صلاحیت نہیں۔موت کو جانوروں کی طرح ذبح بھی نہیں کیا جاسکتا اور تعطیل احادیث بھی ممکن نہیں لہٰذا اس مجبوری کی بنا پر ظاہری معنیٰ سے صرف نظر کرنا پڑے گا۔اس کے علاوہ آپ کو یہ خوب ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ عربی زبان کے دامن میں بڑی پہنائی ہے۔

اگر کوئی اسی طرز پر کلام کو اس کے ظاہر سے پھیرتا جاتا ہے تو یہ باتیں آپ حضرات کی سماعت پر بار نہیں ہوتیں بلکہ اسی وقت تو آپ علماحضرات بھی اس کے سُر سے سُر ملا کر فرمائیں گے کہ تم سچ کہہ رہے ہو: سورۂ بقرہ کی بدلی کی شکل میں آمد اور موت کے ذبح کے سلسلے میں ہم بھی اسی بات کے قائل ہیں تو کیا اس وقت انسے یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ آپ حضرات پر مجھے تعجب ہے کہ آپ نے موت اور کلام کی حقیقت پر منطبق نہ ہونے والے معنیٰ کو اس کے ظاہر سے تو پھیر دیا لیکن کیا بات ہے کہ قدیم معبود کی ذات سے متعلق ان صفات کی حقیقتوں کو اس کے ظاہر سے پھیرنے کے لیے تیار نہیں جن کی بنا پر اس کی صفتوں کا مخلوق کے مشابہ ہونا لازم آتا ہے جب کہ نص موجود ہے کہ وہ اپنی صفات میں مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے۔(ابن الجوزي، صيد الخاطر، فصل : ۴۹، ص : ۸۳۔۸۶، مطبوعه دار الكتب الحديثة، مصر، ومكتبة المثنىٰ، بغداد)

☆☆☆

باب چهارم

مدارس و مساجد

مدارس اور دہشت گردی

حقیقت یا پروپیگنڈہ

جناب احمد جاوید صاحب

ہماری دینی درسگاہیں تو ویسے ہمیشہ سے دشمنانِ اسلام کے نشانے پر ہیں اور ہر دور میں ان کو بدنام کرنے کی سازشیں کی جاتی رہی ہیں لیکن جب سے امریکہ نے ''دہشت گردی'' کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے اسلامی مدارس کے خلاف یورشیں پہلے سے کئی گنا زیادہ تیز ہوگئی ہیں۔ اس کا پس منظر کیا ہے؟ شاید آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ افغانستان کی طالبان حکومت پر امریکہ کا عتاب نازل ہونے سے پہلے جو جنگجو امریکہ اور اس کے حلیفوں کی نگاہوں میں مجاہدین اسلام تھے اور سرزمین افغانستان پر اپنے وجود اور اپنے مذہب وملّت کی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے وہی مجاہدین سعودی عرب اور پاکستان جیسے ملکوں کی نگاہوں میں بھی راتوں رات دہشت گرد کیسے بن گئے؟ اس کی حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ حسنِ کرشمہ ساز کی کارستانی کہ وہ جو چاہے کرے۔ جنوں کا نام خرد رکھے یا خرد کا نام جنوں۔ میری نگاہ میں اسلامی دینی مدارس اور دہشت گردی میں اس سے زیادہ کوئی نسبت نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مسلم معاشرے میں دہشت گردی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اپنے ناپاک سیاسی وغیر سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے جہاد کی قرآنی اصطلاح کو استعمال کرنے والوں کی کمی کسی دور میں نہیں رہی ہے۔ یہ عناصر اسلام کی بدنامی اور مسلمانوں کی تباہی وبربادی کا سبب بنتے رہے ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں پچھلے سو دو سو سال کی تاریخ پر ہی نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ نام نہاد مجاہدین اور مغربی طاقتیں بڑے ہی تال میل سے کام کرتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض تو کلمہ گو ہوکر اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر ومشرک اور قابلِ گردن زدنی کہتے ہیں اور ان کے مقابلے پر یہود ونصاریٰ کو اپنا بھائی تصور کرتے ہیں کہ وہ ان کی نظر میں اہل کتاب ہیں۔ ہر بار انکا جہاد مغربی طاقتوں کی پیش قدمی کا ہی سبب ہوا ہے۔ سرزمین حجاز سے افغانستان تک ایسے جہاد کی اَن گنت خوں چکاں داستانیں بکھری پڑی ہیں جس نے خون مسلم کی ارزانی میں اضافہ کیا ہے۔ اس نقطے پر آج غور وفکر کی بڑی شدید ضرورت ہے۔ تاہم یہ ایک ایسی بحث ہے جس میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے لیکن اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ اسلام اور دہشت گردی ایک دوسری کی ضد ہیں۔

اسلام دنیا سے دہشت گردی مٹانے کے لیے آیا تھا۔ انصاف کی حکمرانی اور ہر ظلم وجبر کا خاتمہ ہی اس کا نصب العین ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں دین کی تعلیم دی جائے، انصاف اور انسانیت کا سبق پڑھایا جائے، قرآن وحدیث کا درس دیا جائے وہاں دہشت گردی کو فروغ حاصل ہو۔ مگر بدقسمتی سے مغربی میڈیا ہی نہیں امریکہ، برطانیہ اور ان کے حلیف ممالک کی حکومتیں بھی اس ذہنی فتور میں مبتلا ہیں کہ ''مسلمانوں کی دینی درس گاہیں جو مدرسوں کے نام سے جانے جاتے ہیں اور جو بالعموم غریبوں کے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں ان میں پڑھ لکھ کر جوان ہونے والے طلبہ دہشت گرد بن جاتے ہیں''۔

امریکہ کے سابق وزیر خارجہ کولن پاول نے تو ایک موقع پر پاکستان اور دوسرے ممالک کے مدرسوں کو نشانہ بناتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''یہ بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کے بیج تیار کرنے والی زمینیں ہیں۔'' اس سے قبل بش کے وزیر دفاع ڈونالڈ رمسفیلڈ ایک سرکاری میمورنڈم میں جو کسی طرح لیک (Leak) ہوگیا تھا یہ کہہ چکے تھے کہ '' کیا ہم روزانہ اس سے زیادہ دہشت گردوں کو پکڑ رہے ہیں، مار رہے ہیں یا انہیں گھیر کر ان کی بیخ کنی کر رہے ہیں جتنے دہشت گرد ہمارے خلاف مدرسے اور بنیاد پرست علماء ہر روز بحال کرتے، ٹریننگ دیتے اور کارروائی پر لگاتے ہیں؟''

اس زہریلی سوچ اور اس پروپیگنڈے کی حقیقت کیا ہے؟ کسی ذی شعور شخص سے مخفی نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی اگر اس کے تعلق سے ہم اور آپ کچھ کہیں گے تو اسے جانب داری کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن جب خود ایک شہرہ آفاق امریکی محقق ہی اس جھوٹ کا پردہ چاک کرنے پر آجائیں تو اس کو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے۔

پیٹر برگن کو کون نہیں جانتا، اپنی معرکۃ الآراء کتاب: ہولی وار انکاپوریٹ (Holy War Inc.) کے حوالے سے دنیا بھر میں زیر بحث رہے ہیں۔ نیو امریکہ فاؤنڈیشن کے فیلو کی حیثیت سے علمی دنیا میں ان کا بڑا نام ہے۔ خصوصاً بین الاقوامی سیاسیات میں وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی رفیق کار سواتی پانڈے بھی اسی ادارے کی ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں۔ ان دونوں کے ایک تحقیقی مطالعہ نے جس کی تلخیص جون 2005 میں انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون اور کئی دوسرے عالمی اخبارات ورسائل میں شائع ہوئی تھی اس پروپیگنڈہ کی حقیقت کو بے نقاب کر کے رکھ دی ہے۔

پیٹر برگن اور سوائی پانڈے اپنی مشترکہ تحقیق میں لکھتی ہیں کہ ''اس بات کا بہت کم بلکہ بالکل نہیں ہے کہ مدرسے ایسے دہشت گرد پیدا کرتے ہیں جو مغرب پر حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور قومی سلامتی کے مسئلے میں امریکہ کو ایسے بنیاد پرستوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو اس کی پالیسیوں کے خلاف تو ہوں لیکن اس کے خلاف حملہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔''

یہ محققین بتاتے ہیں کہ ہم نے مغرب کے خلاف تازہ اور بڑے حملوں میں ملوث دہشت گردوں میں سے 75 کے تعلیمی پس منظر کی چھان بین کی تو پتہ چلا کہ ان کی اکثریت یونیورسٹیوں کی تعلیم یافتہ ہے اور ان میں بھی انجینئر نگ جیسی تکنیکی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کیا ہم اس موقع پر رمسفیلڈ اور ان کے آقا جارج بش سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ یونیورسٹیوں اور انجینئر نگ کالجوں کو دہشت گردوں کی بیج تیار کرنے والی زمینیں کیوں نہیں کہتے؟

برگن اور سوائی نے اپنی تحقیق کے خلاصے میں لکھا ہے کہ جن 4 بڑے حملوں کو انجام دینے والوں کی تعلیمی قابلیتوں کی مکمل معلومات دستیاب ہیں وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر 1993 کی بمباری، کینیا امریکی سفارت خانوں پر 1998 کے حملے، 11 دسمبر کے بم دھماکے ہیں۔ ان حملوں کو انجام دینے والوں یا تو یونیورسٹیوں کی ڈگریاں رکھتے ہیں یا کم از کم وہ پڑھ چکے ہیں۔ اس مقام پر یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ صرف کے 52 فیصد شہری یونیورسٹی سطح تک تعلیم یافتہ ہیں۔ گردوں کا تعلیمی تناسب اتنا ہی اچھا ہے جتنا امریکہ کا ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کرنے والے تمام 12 ملزمین کالج کے پڑھے لکھے ہیں۔ 11 ستمبر کے حملوں میں شامل پائلٹوں اور جن سازوں کی نشاندہی نائن الیون کمیشن نے کی ہے وہ سب کے سب مغربی یونیورسٹیوں میں پڑھ چکے تھے جن میں تعلیم حاصل کرنا وسطیٰ کے کسی بھی خوشحال اور روشن خیال شخص کے لیے قابل فخر ہوتی ہے۔ محمد عطا ایک جرمن یونیورسٹی کا فارغ التحصیل تھا۔ خالد شیخ نے نارتھ کیرولینا میں انجینئر نگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔

25 اغوا کاروں اور منصوبہ سازوں میں سے 16 یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ گہری چھان بین سے پتہ چلا کہ 75 میں سے صرف 9 دہشت گرد ایسے ہیں جنہوں نے کبھی کسی مدرسہ میں پڑھا تھا۔ اور وہ بھی تمام کے تمام ایک ہی بالی حملے کے ملزمین ہیں۔ پھر اس میں بھی یہ بات سامنے آئی کہ بالی بم دھماکے کے انجام دینے کے پیچھے جو اصل دماغ کارفرما تھے وہ 5 کے 5 یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے۔

جس طرح یہ پروپیگنڈہ سراسر بے بنیاد اور معاندانہ ہے کہ مسلمانوں کے دینی مدرسوں میں دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں۔ پیٹر برگن کی تحقیقات اسی طرح اس الزام کو بھی بے بنیاد ثابت کرتی ہے کہ مسلمانوں کی غریبی اور بے روزگاری دہشت گردی کے لیے ایندھن فراہم کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بے شمار شواہد سے یہ باتیں غلط ثابت ہو چکی ہیں کہ دبے کچلے، بے روزگار اور جاہل نوجوانوں کے بجائے یونیورسٹیوں کے گریجویٹ مغرب کے خلاف حملے کر رہے ہیں۔'' بتاتے ہیں کہ ورلڈ بینک کی مالی امداد سے کرائے گئے ایک مطالعہ میں جو اپریل 2005 میں شائع ہوا تھا، یہ بات سامنے آتی ہے کہ پاکستان

یں مدرسوں کا اثر ورسوخ تو مشکوک ہے لیکن ملک کے تمام بڑے اور با اثر اسکولوں میں امریکہ مخالف جذبات انتہائی طاقتور ہیں۔ ان رپورٹوں اور تحقیقات سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ پاکستان جیسے مسلم ملکوں میں بہ مشکل تمام 10 فیصد طلبہ مدرسوں میں پڑھتے ہیں جب کہ اس سے کہیں زیادہ بچے اسکول یا مدرسے جاتے ہی نہیں۔ یہ کوئی احمد جاوید یا محمد علی نہیں کہتا بلکہ پیٹر برگن اور سوائی پانڈے کی رائے ہے کہ مسلم ملکوں کی تعلیم وترقی میں مدرسوں کا بڑا ہی اہم اور مؤثر کردار ہے۔ نہ تو یہ امریکہ کے لیے کسی طرح کا خطرہ ہیں اور نہ امریکہ کو چاہیے کہ انہیں اپنے لیے خطرہ تصور کرے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان مدرسوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی جو ہزاروں، غریبوں اور پسماندہ خاندانوں کو بلا کسی معاوضہ کے جہالت کی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں مگر الٹے ان کو بے بنیاد مفروضات اور غلط فہمیوں کی بنا پر طرح طرح سے نشانہ بنایا جارہا ہے۔

☆ نیوز ایڈیٹر، ہندوستان ایکسپریس
5051۔ تیسری منزل، نیتاجی سبھاش مارگ دریا گنج، نئی دہلی۔
9818844546, 9818624740
ahmedjawed1970@yahoo.com

جدید میڈیا اور فضلائے مدارس

امکانات اور اندیشے

مولانا جلیس نصیری☆

چرند و پرند کے ذریعے پیغامات پہنچائے جانے کے عہد سے لے کر موجودہ دور تک کے الیکٹرانک عہد کا سفر بے حد دلچسپ ہے۔ پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا میں جہاں بے حد گلیمر و چیلنجز ہیں وہیں اس کے ذریعے اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک بہتر ذریعۂ معاش بھی ہے۔

اخبار و رسائل کی صحافت (Print Journalism) کا ہمارے ملک میں ایک قدیم اور طویل تاریخی سلسلہ ہے، جس نے معاشرتی و سیاسی لحاظ سے اپنا اہم رول ادا کیا ہے۔ سیٹلائٹ کے اس دور میں تکنیکی و اطلاعاتی نظام کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے۔ اس نے نہ صرف ایک نئے اور طاقت ور ذریعۂ ابلاغ کو فروغ دیا ہے بلکہ یہ روزگار کے ایک نئے متبادل کے طور پر سامنے آیا ہے۔ عہدِ جدید میں پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا سے جڑے ادارتی و تکنیکی عہدوں کے لیے بہتر اور با صلاحیت نوجوانوں کی مانگ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ گو کہ پرنٹ میڈیا کی اہمیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے لیکن سیٹلائٹ چینلوں کی کثرت اور ذرائع ابلاغ کی بہتات نے الیکٹرانک میڈیا میں کریئر اور اس کے ذریعے پیغامات کے ابلاغ و ترسیل کے نئے امکانات کو فروغ دیا ہے۔ قومی سطح پر آج دوردرشن کے علاوہ دیگر پرائیویٹ چینل خبریں، تجزیے، تبصرے، تفریح اور سائنس و ٹکنالوجی سے متعلق بہت سے موضوعات پر اپنے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ اس میں ہندی و انگریزی کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں میں بھی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر اخبار و رسائل، ٹی-وی چینلز اور خبر رساں ایجنسیاں اس قدر کثیر تعداد میں وجود میں آچکی ہیں کہ وہ اپنی خبروں و تجزیوں (News and Views) کے ذریعے کبھی بھی حالات کا رخ موڑنے میں کامیابی حاصل کر لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور کو اطلاعاتی انقلاب کا دور کہا جاسکتا ہے۔ ترسیل و ابلاغ کے لیے آج وہ سہولیات مہیا ہو چکی ہیں جو ماضی میں مشکل سے حاصل ہوتی تھیں۔ آج کوئی بھی قومی یا بین الاقوامی چھوٹی بڑی خبر لمحہ بھر میں پوری دنیا کے کونے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ آج کا میڈیا (پرنٹ، الیکٹرانک، انٹرنیٹ وغیرہ) بے حد طاقت ور ہے۔ صحافتی جوہر سے آراستہ ہونے کے لیے نہ صرف صحافتی صلاحیتوں میں مہارت کی ضرورت ہے بلکہ کم از کم ایک یا کئی زبانوں پر عبور ہونا بھی ضروری ہے۔ مزید یہ کہ قومی یا بین الاقوامی سطح کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کی واقفیت کے علاوہ اس میدان میں کم از کم ایک یا کئی موضوعات پر مہارت ہونا بھی لازمی حیثیت رکھتا ہے۔

مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اگر ان خوبیوں کے حامل ہو جائیں تو وہ نہ صرف صحافت کے ذریعے دعوت و تبلیغ کا کام دے سکتے ہیں بلکہ اس کو اپنا ذریعۂ معاش بھی بنا سکتے ہیں۔ مسرت کی بات یہ ہے کہ مدارس کے فارغ التحصیل بہت سے طلبہ اس میدان میں اپنا کریئر بنا چکے ہیں، لیکن اجتماعی طور پر ہمیں ایک سنگلاخ مرحلہ طے کرنا ہے۔ اس کے لیے میڈیا کی بہت سی باریکیوں کو سمجھنے کے علاوہ خود ہمیں اپنی لیاقت کا محاسبہ کرنا ہوگا۔

صحافت کے لیے مطلوبہ صلاحیتوں کی اگر بات کی جائے تو اس چیز سے سبھی واقف ہیں کہ صحافتی نصابِ تعلیم اور مدارسِ اسلامیہ کے طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں کس قدر گہری کھائی ہے، یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس طویل فاصلے کو مٹانے کی بات تو دور ابھی ہم اس فاصلے کو محسوس تک بھی نہیں کر پائے ہیں۔ ہمیں اردو زبان میں ہزار دو ہزار کی تعداد میں سرکولیشن والے رسائل کے مدیر و صحافی بن کر بہت زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے اور

اس کے گوشے گوشے تک رسائی کو ممکن بنانے کے لیے ہمیں ایسی صلاحیتوں کی ضرورت ہے جن کے ابھی ہم ابتدائی مرحلے میں ہیں۔

جہاں تک اپنی کم مائیگی کے احساس کی بات ہے، جماعت کے اندر ایک ایسی شخصیت نے نہ صرف اسے محسوس کیا بلکہ اس کی تلافی کے لیے عملی طور پر قدم بھی اٹھایا۔ حضرت رئیس القلم کے ذریعے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا قیام شاید نہیں بلکہ یقیناً اس احساس کا نتیجہ تھا۔ راقم الحروف کو حضرت موصوف کی تحریر کا وہ جملہ یاد آ رہا ہے جو کبھی اس کے سامنے ان کی تحریر میں گزرا تھا، جو کچھ اس طرح تھا:

''ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں، لیکن نئی نسل کو آگے بڑھنے کا ہم نے ایک تصور ضرور دیا ہے۔'' (ملخصاً)

یقیناً حضرت کے اسی ''آگے بڑھنے کے تصور'' نے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے کثیر فارغین کو جہاں ملک و بیرون ملک کی عصری درس گاہوں تک پہنچایا وہیں بہت سے فارغین کو صحافت جیسے مشکل میدان کا پیشہ ور بنا دیا۔ راقم الحروف کو یہ اعتراف کرنے میں قطعی گریز نہیں کہ وہ بھی حضرت کے اسی وژن (Vision) کا حصہ ہے۔ اپنی خامیوں کے ذمہ دار یقیناً ہم خود ہیں لیکن کامیابیوں کا سہرا بلاشبہ انہی کے سر ہے۔

حضرت موصوف نے ہمیں آگے بڑھنے کا ایک تصور ضرور دیا ہے لیکن ہم خود ان کے تصور کو کس قدر سمجھنے میں کامیاب ہوئے اور عملاً اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں، اس کے لیے ہمیں اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔ جہاں تک میڈیا کا تعلق ہے اس میں ان صلاحیتوں کی ضرورت ہے جن کے بارے میں مدارسِ اسلامیہ سے توقع کرنا فضول کی بات ہوگی۔ لیکن کم از کم ان کے حصول کے لیے ہمارے مدارس ایک ''بنیاد'' (Base) تو فراہم کر ہی سکتے ہیں۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا تعلق اسی بنیاد سے ہے جس پر صلاحیتوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مدرسہ کم از کم اس بنیاد کی فراہمی کی ضرورت کو محسوس کرے۔

علاوہ ازیں صحافت میں کئی ایسے عناصر بھی ہیں جن سے متعلق علماء و عمائدین کے درمیان اب بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ماضی قریب تک ہم ٹی-وی بینی کے جواز و عدم جواز کے مسئلے میں ہی الجھے رہے۔ صحافت کے ایک اہم حصے ''تصاویر'' پر اب تک علماء و عمائدین کا موقف بہت زیادہ واضح نہیں ہے، جبکہ تصویر آج کی صحافت میں نہ صرف ایک اہم باب ہے بلکہ تصویری صحافت (Photo Journalism) ایک مستقل مسئلۂ حیات (Career Option) کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

یوں تو الفاظ پر تصاویر و علامات کی فوقیت کو ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے مگر آج ذرائع ابلاغ اور خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں جو انقلاب برپا ہے، وہ دراصل تصاویر کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔ فوٹو گرافی آج ایک علم (Science) بھی ہے اور فن (Art) بھی۔ یہ ایک ایسا فنی ذریعۂ اظہار ہے جس میں قلم یا برش (Brush) کی بجائے کیمرے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہزار الفاظ پر مبنی ایک مضمون میں جو بات کہہ پانا دشوار ہوتا ہے اسے محض ایک تصویر کے ذریعے بآسانی بیان کیا جاسکتا ہے۔ تصاویر کے جواز و عدم جواز کی ایک علاحدہ بحث ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ تصاویر کے ذریعے سے آج قومی و عالمی ذرائع ابلاغ ہماری بشمول ہمارے علمائے کرام کی نفسیات میں اثر انداز ہوتا ہے۔ خواہ عراق کی خونی داستان ہو یا لبنان و فلسطین کے شہریوں پر امریکی وصیہونی بربریت، ان واقعات سے متعلق مضامین کو ہم بعد میں پڑھتے ہیں، اور اخباروں و ٹیلی ویژن پر نشر قتل و غارت گری کی تصاویر و مناظر دیکھ کر ہم آہیں پہلے بھرتے ہیں۔ بہت سے خواندہ و تعلیم یافتہ حضرات تو مضامین پڑھ بھی لیتے ہیں لیکن مضامین سے زیادہ یقیناً تصاویر و مناظر ہی ان کو متاثر کرتے ہوں گے۔ جہاں تک ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد کی بات ہے، ان کے لیے معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ یہی تصاویر رہ گئی ہیں، جن کے ذریعے نہ صرف ان میں آگہی پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ نفسیاتی طور پر بھی متاثر ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تصویر کی حرمت کی جو علت ہے وہ ''علت'' یہاں ندارد ہے۔ علمائے کرام سے اختلاف کی جرأت کیسے ہوسکتی ہے، لیکن ایک جملے کے ذریعے ایک سوال ضرور اٹھایا جاسکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے کھلونوں سے کھیلنے کی شکل میں بے جان مورتیوں و تصاویر کی ''علت حرمت'' جب جاتی رہی تو آج کی صحافتی تصاویر سے متعلق (جو کافی حد تک آج کی

ضرورت بھی ہیں)، کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین؟

چلتے چلتے میڈیا سے متعلق اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کامیابی کا راز زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچنے میں پنہاں ہے۔ اس کے لیے ادارتی و تکنیکی صلاحیتوں کے علاوہ مارکیٹنگ و ایڈورٹائزنگ میں ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے سخت مقابلہ آرائی کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ آج کی صحافت پہلے ہی کئی شعبوں میں تقسیم ہوچکی ہے۔ جیسے سیاسی صحافت (Political Journalism)، تجارتی صحافت (Business Journalism)، ثقافتی صحافت (Cultural Jounalism) وغیرہ۔ یعنی جتنے تعلیمی شعبے اتنے صحافتی شعبے، جن میں سے کسی ایک میں صحافی کی مہارت ناگزیر ہوتی ہے۔ اسی طرح صحافت کی مارکیٹنگ، فینانس، سرکولیشن وغیرہ کے لیے ہمیں کئی قسم کے ماہرین کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے مارکیٹنگ منیجر، سرکولیشن منیجر واگزیکیٹو، ایڈورٹائزنگ منیجر وغیرہ۔

یقیناً جماعت کے نوجوان صحافت کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔ سنگلاخ راہوں سے متعلق تمام مصائب برداشت کرنے کے لیے تیار بھی ہیں، ہمیں ''آگے بڑھنے کا تصور'' مل چکا ہے۔ نئی نسل کو زیر دینے کے لیے رئیس القلم کے ویژن (Vision) کو حقیقت میں بدلنے کے لیے بہت سے رؤساء قلم کی ضرورت ہے۔

''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں''

☆☆☆

☆ سب ایڈیٹر: سہارا انڈیا میڈیا اینڈ انٹرٹینمنٹ
ریسرچ سکالر: سنٹر آف عربک اینڈ افریکن سٹڈیز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی)

جیلان کا تاجدار

سرکار غوث الوریٰ کی عظمت مقام کیا پوچھنا؟ کہتے ہیں کہ ابھی فرش گیتی قدموں کی ٹھوکر سے سرفراز بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے خورشید کمال کا سپیدۂ سحر دلوں کے آفاق پر چمک رہا تھا۔ رحمت و نور کے کتنے ہی آبشاروں نے اس بحر بیکراں سے زندگی کی خیرات مانگی اور وقت کے بڑے بڑے مسندنشینوں نے اپنے امیر کشور کی آمد کے غلغلے بلند کئے، سرکار غوث الوریٰ کی کتاب زندگی کا یہی وہ باب ہے جسے پڑھنے کے بعد اقلیم ولایت میں ان کی شہنشاہی کا یقین چمکنے لگتا ہے۔

انبیاء سابقین نے ہزاروں سال پیشتر اگر مطلع رسالت پر ایک آفتاب کے طلوع ہونے کی خبر دی تھی تو یہاں بھی مظہر اتم کی شان یوں جلوہ گر ہوئی کہ ظہور سے سینکڑوں سال قبل روئے زمین کے اولیاء کاملین نے ولایت کے آفاق پر ایک خورشید کے چمکنے کی بشارتیں دیں، ان کے مناقب و محامد کے خطبے پڑھے اور ہراول دستوں کی طرح دلوں کی سرزمین کو ایک شہنشاہ کی جلوہ گری کے لیے ہموار کیا۔

(حضرت علامہ ارشد القادری)

حضور مفتی اعظم ہند

مفتی اعظم کون تھے؟......اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ وہ ایک سچے نائب رسول، ایک قدسی صفت بزرگ اور ایک راسخ الاعتقاد مرد مؤمن تھے......وہ اخلاص و یقین اور عشق و وفا کا ایک پیکر جمیل تھے......وہ سلف صالحین کی ایک زندہ و تابندہ روایت تھے......وائمہ اسلام اور مشاہیر امت کا نقش حیات تھے......وہ اولیاء اللہ کی برکت و فیضان کا جلوۂ زیبا تھے......وہ عقل و عشق، فقر و غنا، علم و عمل اور شریعت و طریقت کے دریاؤں کا سنگم تھے......وہ عقل و عشق، فقر و غنا، علم و عمل اور شریعت و طریقت کے دریاؤں کا سنگم تھے......وہ غوث الوری کے الطاف و عنایت کا گہوارۂ فیض تھے......وہ امام ابوحنیفہ کی فکر، امام رازی کی حکمت، امام غزالی کا تصوف اور مولائے روم کا سوز و گداز تھے..........وہ خواجۂ ہند کی شاہان سطوت و اقتدار کے وارث تھے۔

(حضرت علامہ ارشد القادری)

مسجدیں

دعوت وتبلیغ کے بہترین مراکز

مولانا نیاز احمد مصباحی☆

دعوت وتبلیغ ایک مقدس فریضہ اور مقصد تخلیق جن وانس کے حصول کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اس صالح مقصد کے لئے ہر زمانے میں انبیاء ورسل بھیجے جاتے رہے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے دور میں حالات کے اقتضاء کے مطابق اس مقدس فریضہ کی بجا آوری کی ہے۔ نبی خاتم جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد یہ ذمہ داری علمائے امت کو سونپی گئی ہے۔ علمائے امت کی ذمہ داری ہے کہ اپنے دور کے حالات کے مطابق اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام سرانجام دیں۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اس باب میں بھی ہمارے لئے بہترین نمونۂ عمل ہے۔ جب اس جہت سے ہم رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو دعوت وتبلیغ کے بہتر اور بنیادی مراکز کے طور پر مسجدیں ہی نظر آتی ہیں بلکہ ایک طرح سے نبی رحمت کی داعیانہ زندگی کا نقطۂ آغاز وانجام مسجدیں ہی رہی ہیں۔ کوہ صفا سے شروع ہونے والی اعلانیہ تبلیغ خطبۂ حجۃ الوداع پر ختم ہوتی ہے۔ اس کوہ صفا پر حضرت ارقم کا مکان تھا۔ اعلان نبوت کے پانچویں سال جب مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو ان مسلمانوں پر کفار قریش کے مظالم میں تیزی اور شدت آ گئی جو مکہ میں ہی رہ گئے تھے۔ جب ان کے مظالم حد سے تجاوز کر گئے تو نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ دارارقم میں پناہ گزیں ہو گئے اور یہیں سے دعوت وتبلیغ کا کام شروع کیا۔ دارارقم گو کہ صرف ایک مکان تھا لیکن اللہ کے نبی یہیں رہ کر اللہ کی عبادت کیا کرتے، لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے اور معبودان باطل کو چھوڑ کر خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی طرف بلاتے تھے۔ اس لئے اس مکان کو سب سے پہلی مسجد اور سب سے پہلا مدرسہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو حضرات اللہ کے نبی کی دعوت پر لبیک کہتے وہ یہیں مقیم رہتے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات حاصل کرتے۔ ان کے کھانے پینے کیلئے جاگیر کا انتظام ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یجمع الرجل والرجلین اذا أسلما عند الرجل به قوة یکونان معه یصیبان من طعامه وقد ضم الی زوج أختي رجلین ممن أسلم أحدهما خباب بن الارت والآخر لم أقف علی اسمه۔ اللہ کے نبی ﷺ ایک ایک دو دو مسلمان کو کسی ایسے مسلمان کے ساتھ لگا دیتے جو مالی اعتبار سے مضبوط ہوتے تھے، وہ ان کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ میرے بہنوئی کے ساتھ بھی دو مسلمان کر دیئے گئے تھے جن میں ایک تو خباب بن ارت ہیں اور دوسرے کا نام مجھے معلوم نہیں۔

دارارقم میں نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ ایک ماہ تک رہے اور اس مدت میں چالیس افراد نے اسلام قبول کیا۔ حضرت عمار، صہیب بن سنان، حضرت خباب بن ارت، حضرت عمر کی بہن فاطمہ بنت خطاب، بہنوئی حضرت سعید، حضرت نعیم بن عبداللہ بن نحام رضی اللہ عنہم دارارقم میں نبی اکرم ﷺ کے قیام کے دوران اسلام لائے۔ سب سے اخیر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شرف بہ اسلام ہوئے۔ جس کے بعد مسلمان دارارقم سے باہر آ گئے اور علی الاعلان مسلمانوں نے تبلیغ ودعوت اور عبادت خداوندی شروع کر دی۔ بعد کے زمانہ میں دارارقم مسجد کی شکل اختیار کر گیا۔

دارارقم کو اس کی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے دارالاسلام کا نام بھی دیا گیا۔ اس طرح وہ اسلام کا سب سے پہلا دعوتی وتبلیغی مرکز قرار پایا۔

دارارقم کے علاوہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں کئی اور بھی مسجدیں تھیں جو اپنے آپ میں اسلامی دعوت وتبلیغ کے مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لیکن چونکہ ابتدائے اسلام میں فدایان اسلام مختلف مصائب ومشکلات میں گھرے ہوئے تھے اس لئے کسی بھی چیز کا باضابطہ نظم ونسق نہیں تھا، مسلمانوں کو جہاں امن کے دو لمحے میسر ہو جاتے وہیں وہ خدا کی عبادت اور قرآن کی تعلیمات میں لگ جاتے۔ اس سلسلے کا دعوتی مرکز مسجد ابوبکر بھی ہے۔ یہ پہلے ایک کھلی

جگہ تھی جہاں پر آس پاس کے لڑکے آکر بیٹھتے تھے لیکن بعد میں یہاں سے اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دعوت وارشاد کا کام انجام پانے لگا۔

اگر مدینہ منورہ کی بات کریں تو یہاں مسجد بنوزریق کو دعوت اسلام کے اولین مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ قرآنی تعلیمات کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اور حضرت رافع بن مالک اس کے اولین استاذ ہیں ۔دس سال کی مدت میں قرآن کا جس قدر حصہ نازل ہوا تھا حضرت رافع اہل مدینہ کو اس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

مسجد بنوزریق کے علاوہ مسجد قبادعوت اسلامی کا اہم مرکز تھی۔ مدینہ کی جانب عام ہجرت سے پہلے بھی صحابہ کی آمد کا سلسلہ یہاں شروع تھا۔ وہ عام طور سے مدینہ منورہ سے باہر مقام قباء میں قیام فرماتے تھے اور ان کا ایک گروہ تعلیم وتعلم میں مشغول رہتا تھا۔

مسجد بنوزریق اور مسجد قبا کے علاوہ بھی کئی مسجدیں تھیں جہاں خدا کی عبادت کے علاوہ اسلام کی تعلیمات عام کرنے کا بھی نظام تھا۔ ان مسجدوں میں جو امام ہوا کرتے تھے وہ صرف امام نہیں بلکہ معلم اور مبلغ اسلام کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

ہجرت کے بعد اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے مسجد نبوی کی شکل میں ایک مرکز کی تعمیر فرمائی۔ اس مسجد کا اندرونی حصہ نماز پڑھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا اور باہر شیدائیان اسلام کو اسلامی تعلیمات واحکام سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ یہاں صفہ کے نام سے ایک مقام تھا، خاص اسی مقام پر بیٹھ کر اسلامی احکام کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی۔ اس مقام پر بیٹھ کر پڑھنے پڑھانے والوں کو اصحاب صفہ کہا جاتا تھا۔ جو حضرات اسلام لاتے وہ دن کو کسب معاش کے لئے لکڑیاں وغیرہ لاکر فروخت کرتے اور رات کو اسی مقام پر آرام فرماتے۔ بعض اصحاب رات کو دوسرے اصحاب کے یہاں جاکر تعلیم حاصل کرتے اور صبح کو فجر کے بعد سے دن چڑھنے تک رسول اللہ ﷺ کی خاص مجلس سے استفادہ کرتے تھے۔ یہاں کے فضلاء کو قراء کہا جاتا تھا۔ وہ مختلف عرب قبائل اور دنیا کے دوسرے ممالک میں جاکر اسلام کی تبلیغ واشاعت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

مسجد نبوی اور جامعہ صفہ کے علاوہ وہاں اور بھی کئی مسجدیں تھیں جہاں مستقل باجماعت نمازیں ہوا کرتی تھیں اور وہاں کے ائمہ معلم بھی ہوا کرتے تھے جو دعوت وتبلیغ کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ عام طور سے وہاں جامعہ صفہ کے فضلاء دعوت وتبلیغ اور امامت کی خدمات کے لئے مامور کیے جاتے تھے۔

ابتدائے اسلام میں دعوت وتبلیغ کی سطح پر مساجد کا جو مرکزی کردار رہا ہے وہ مذکورہ بالا تفصیل سے بحسن وخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ مساجد کی یہی اہمیت بعد کے ادوار میں بھی رہی۔ ہاں اتنا ضرور فرق آیا کہ پہلے مدارس مسجدوں میں ہی ہوا کرتے تھے لیکن بعد کے عہد میں مدارس کو مستقل حیثیت مل گئی۔ اس کے باوجود مساجد کی سابقہ اہمیت ختم نہ ہوئی اور مساجد میں بھی تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ آج بھی ایسی مسجدیں ہیں جہاں تعلیم وتربیت اور دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔ دعوت وتبلیغ کے باب میں مساجد کا کیا رول رہا ہے اور مساجد کیا کردار ادا کرسکتی ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ تبلیغی جماعت اپنے مقصد میں آج کامیاب ہے اور دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں پھیل چکی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اس راز کو آغاز میں ہی سمجھ لیا تھا اور ابتدا سے ہی اس نے مسجدوں سے اپنی آواز بھولے مسلمانوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔

دعوت اسلامی یا سنی دعوت اسلامی کی کارکردگیوں کے نتیجے میں جو مثبت نتائج ہمارے سامنے ہیں وہ دعوت وتبلیغ میں مساجد کے مرکزی کردار کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ آج دعوت اسلامی یا سنی دعوت اسلامی سے وابستہ افراد کو دیکھ کر ابتدائے اسلام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سر پر عمامہ باندھے، جیب میں مسواک رکھے سنی بھائی کم وبیش ہر شہر میں مل جاتے ہیں۔ یہ مذکورہ دونوں جماعتوں کے بانیان وسربراہان اور ذمہ داران کی کاوشوں کے علاوہ مساجد کی برکت ہے۔ مساجد سے پہنچائی جانے والی آواز زیادہ مقبول اس لیے بھی ہوتی ہے کہ دنیا کی بھاگ دوڑ اور شور شرابہ سے کنارہ کشی اختیار کر کے تھوڑی دیر کیلئے بندہ بارگاہ خداوندی میں حاضری دیتا ہے تو حق تعالیٰ کی رحمتیں اس پر زیادہ مہربان ہوتی ہیں، وہ نیک باتوں اور صالح کاموں کے لیے پہلے سے ہی تیار ہوتا ہے، ایسے میں اس کی سماعت سے جو بات ٹکراتی ہے وہ نہ صرف حواس ظاہرہ پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ حواس باطنہ بھی اسے قبول کرتے ہیں۔ اس لیے مساجد میں جمعہ کے

روز ہونے والی دس پندرہ منٹ کی سنجیدہ تقریریں سہ روزہ چہارروزہ جلسوں اور کانفرنسوں سے زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔

علماے امت اور وارثین انبیاء کے اندر اگر احساس ذمہ داری اور دعوت وتبلیغ کا جذبہ و لگن ہو تو آج مسجدوں سے جس قدر دعوت وتبلیغ کا کام ہو رہا ہے اس میں بہت زیادہ تیزی لائی جاسکتی ہے، لیکن آج سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ امامت کا مفہوم نہایت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ امامت سب سے بڑا منصب ہے جس کا اہل بادشاہ اسلام یا اس کا نائب ہے، جس کیلئے ضروری ہے کہ وہ علمی، اخلاقی اور روحانی اوصاف وکمالات سے متصف ہو۔ فقہ اسلامی کے مطابق امام وہ ہوگا جو علماء میں سب سے لائق وفائق ہو لیکن آج اکثریت ایسے ائمہ کی ہے جو کسی لائق نہیں ہوتے اور آج امام ہونے کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جسے چند سورتیں اور ترکیب نماز کا علم ہو۔ نتیجۃً امامت کے وہ اغراض ومقاصد آج حاصل نہیں ہو پا رہے ہیں جو اسلام کے عہد زرین میں حاصل ہوتے تھے۔ اگر یہ صورتحال جس کا ختم ہونا تقریباً ناممکن ہے، اگر ختم ہو جائے تو مساجد کو اپنی کھوئی ہوئی مرکزیت ومعنویت پھر سے حاصل ہوسکتی ہے۔

☆☆☆

☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

niyaz_mail@yahoo.co.in

نعت پاک

(حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ)

ان کے روضے پہ بہاروں کی وہ زیبائی ہے
جیسے فردوس پہ فردوس اتر آئی ہے

پاؤں چھو جائے تو پتھر کا جگر موم کرے
ہاتھ لگ جائے تو شرمندہ مسیحائی ہے

جانے کیوں عرش کی قندیل بجھی جاتی ہے
ان کے جلوؤں میں نظر جب سے نہا آئی ہے

مل گئی ہے سر بالیں جو قدم کی آہٹ
روح جاتی ہوئی شرما کے پلٹ آئی ہے

سر پہ سر کیوں نہ جھکیں ان کے قدم پہ ارشدؔ
اک غلامی ہے تو کونین کی آقائی ہے

اسلامی مدارس

انسان سازی کے سرچشمے

مولانا ظفرالدین برکاتی

اسلامی مدارس اور دینی درس گاہیں وہ کارگاہ علم وفن ہیں جہاں آدم گیری، مردم سازی اور انسانیت وشخصیات سازی جیسے بنیادی کام کیے جاتے اور ملک وملت کے لیے اچھے شہری، کارآمد افراد، سماجی صلاح کار اور وطن دوست انسانوں کو تیار کرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس عملی توازن، تعلیمی تناسب اور ہمہ گیر تربیت اور تعمیری اقدام کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اسلامی مدارس کا شجرۂ نسب، اسلامی تاریخ کی اس اولین درس گاہ سے جاملتا ہے جسے ''صفہ'' یا ''مجلس اصحاب صفہ'' کے نام سے تاریخ نے اپنے لیے محفوظ کررکھا ہے۔

چنانچہ صفہ مسجد نبوی کے قریب وہ چبوترہ تھا جہاں معلم کائنات، محسن انسانیت ﷺ اپنے صحابہ کو ہم جہت تعلیم وتربیت فرماتے۔ جس کے نتیجے میں وہاں سے مذہب اسلام کے عظیم واولین داعی، انسانیت کے بے لوث پاسبان، مذہب ووطن کے جاں باز سپاہی اور اسلامی معاشرت کے قابل تقلید سماجی مصلح (صحابہ) اتنی اچھی تعداد میں فارغ ہوئے جنھوں نے پوری دنیا میں اور بڑی مختصر مدت میں ایک عظیم انقلاب برپا کردیا اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ، نقوش قدم اور بہترین نمونۂ عمل بن گئے۔

چوں کہ مسجد نبوی عالم اسلام کا عالمی پاور ہاؤس تھی اور مدینہ شریف دور رسالت کا اشاعت دین، ترویج اسلام اور نفوذ شریعت اسلامی کے ساتھ ساتھ بقائے باہم کے عملی اصولوں اور انسانیت سازی کے تمام محکموں اور حکام واولیا کا عالمی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اسی لیے اس مرکز علم وفن اور مخزن اخلاق وانسانیت سے فارغ شدہ مخلص افراد بلاتفریق مذہب وملت ساری انسانی آبادی میں علوم وانسانیت کی روشنی تقسیم کرنے کو اپنا مذہبی، اخلاقی اور فطری فریضہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس مقام کو مرکزیت اور حکومت ومملکت کی وہ انفرادی حیثیت حاصل ہوگئی کہ وہاں کا فرمان سارے عالم انسانیت پہ نافذ ہوا کرتا لیکن کسی عالم[?] فرمان اس اسلامی مرکز اور نبوی دانش گاہ پہ نافذ نہیں ہوسکتا اور نہ نافذ ہونے کے دروازے کھولے گئے۔ کیوں کہ مدرسہ نبوی کا تعلق کسی خاص تہذیب وتمدن یا کسی مخصوص عہد، تہذیب اور زبان وادب سے نہیں بلکہ اس کا تعلق براہ راست رسالت احمدی اور مشکوٰۃ نبوی سے تھا جو عالم گیر بھی ہے اور زندۂ جاوید بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی اعتبار سے مدرسہ یا خالص اسلامی دانش گاہ صحیح معنوں میں قدیم وجدید کی بحثوں اور بے بنیاد قیل وقال سے بالاتر ہے۔

قدیم وجدید کی بحث تو اس وقت کی پیداوار ہے جب کہ مغربی ممالک اور یورپی اقوام نے انسانیت، اخلاقیات اور سماجی قوانین کی ساری اصولی چیزوں کو پامال کرتے ہوئے نوآبادیاتی نظام کی زمینی فضا کو اپنے لیے ہموار کرنا شروع کیا اور برِّ اعظم ایشیا کے اکثر حصوں پہ قابض ہوگئے۔

زیر عنوان بحث کے تعلق سے سچی بات یہ ہے کہ ہر چیز کی اصلیت، اہمیت اور کامیابی کا انحصار اس چیز کی بنیاد اول اور مثبت ابتدا پہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات تادیر قائم رہتے یا قائم رکھے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کے تناظر میں اسلامی مدارس کی بنیاد اول اور ابتدا کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد میں انسانیت کی بقا، انسانوں کی ہمہ جہت تربیت اور شہریوں کی مفید تعمیر وترقی کے صاف وشفاف جذبات کی مضبوط اینٹیں شامل ہیں۔ اسی لیے یورپی گوروں کی ہزار کالا بازاریوں کے باوجود کسی بھی ملک نے سرکاری طور پہ اسلامی دانش گاہوں اور دینی مدارس کو انسانیت مخالف، سماج دشمن اور ملک وملت کا بدخواہ بتانے کی جرأت نہیں کی ہے بلکہ اسلام دشمن انتہائی خطرناک پروپیگنڈوں کے نتیجے میں لگائے جارہے الزامات کو تسلیم کرنے سے بھی

انکار کر دیا ہے۔ جب کہ موجودہ عالمی منظر نامہ ان بارلیش اور نام نہاد مجاہدین اسلام کی دہشت میں یوں ڈوبا ہوا ہے کہ ہر کس و ناکس ان کی شکل و شباہت کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنے لگتا ہے کہ یقیناً یہ کسی اسلامی درس گاہ یا کالج کا پروردہ ہے۔ ہمارے خیال سے موجودہ دور میں اسلامی درس گاہوں کے حوالے سے جو چہ می گوئیاں کی جاتی ہیں ان کی اصل وجہ یہ ہے کہ دور رسالت کی ''مسجد ضرار'' کے بانیوں سے فکری نسب اور ان کی ضرارذہنیت سے گہرا تعلق رکھنے والے موجودہ دور میں بھی موجود ہیں جو اسلام مخالف اور ملک وقوم مخالف فضا کو ہموار کرنے کا براہ راست یا بالواسطہ سبب بنتے ہیں۔ یہی اسلام پسندوں اور مدارس کے تربیت یافتہ طبقہ کی شکل وصورت میں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے دنیا کی نظریں صوری شکل وشباہت اور قربت کی وجہ سے ان اسلامی قلعوں کی طرف اٹھتی رہتی ہیں۔ نتیجۃً اسلامی مدارس کو ہمیشہ دفاعی صورت حال سے دوچار رہنا پڑتا ہے۔ اپنی صفائی دینے کی ضرورت پڑتی اور اپنی وطن دوستی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ تاہم ہندوستانی معاشرہ اب تک مدارس مخالف ہاہا کاریوں اور اسلام مخالف قرابت داریوں سے بہت حد تک پاک ہے۔

اسلامی مدارس کے حوالے سے چند بنیادی حقائق کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں جو مدارس ومکاتب قائم ہیں ان کی تعلیم وتربیت کا بنیادی مقصد، دینی علوم وفنون میں دسترس اور قابلیت کے ساتھ اسلامی تہذیب وثقافت کے مطابق شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ اس طرح ہندوستان کے تمام دینی مدارس مذہبی، روحانی اور اخلاقی اقدار کے مراکز ہیں۔ اسی لیے ان میں حکومت کے خلاف نہ تو انحراف وبغاوت کے محرکات پائے جاتے ہیں اور نہ ہی کسی سازشی تحریک یا تخریبی تنظیم سے کوئی لگاؤ۔ نیز ان مدارس میں جس قدر بھی کتابیں داخل نصاب ہیں ان میں اسلامی امور ومعاملات کے علاوہ اخلاق ومحبت، وطن دوستی وبھائی چارگی، اخوت ومساوات، انصاف وحقیقت پسندی، بقائے باہمی کے اصول، استوارئ تعلقات اور انسانی ہمدردی کی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ان مدارس کے فضلا اور علمانے قتل وغارت گری، انسانیت مخالف سرگرمیوں، دہشت گرد کوششوں اور نقض امن وسلامتی کرنے والوں کے خلاف ہمیشہ محاذ آرائی کی ہے۔ نیز قومی، ملکی اور دینی تخریب کاری اور ہر طرح کی دہشت گردی کے خاتمے کے لیے حکومتوں، سماجی تحریکوں اور دیہی یا خاندانی پیش قدمیوں کا بھر پور عملی ساتھ دیا ہے اور دیتے رہیں گے۔

یہ بنیادی چیز بھی سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب حکومتوں نے اسلامی مدارس کی تعمیر وترقی اور اسلامی اخلاق واقدار کو فروغ دینے سے غفلت برتنے کو اپنا شیوہ بنالیا تو علمائے اسلام نے ارباب حکومت کی کوتاہیوں اور مجرمانہ غفلتوں کی تلافی کی خاطر بڑے پیمانے پہ مدارس کو قائم کرنا شروع کیا اور خود اپنی کوششوں اور قوم کے تعاون سے معاشرے کے بچے بچیوں کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا اور رفتہ رفتہ تعلیم بالغاں نیز اعلیٰ تعلیم، اخلاق واقدار کے فروغ اور ملک وملت کی فلاح وبہودی کے لیے بڑے بڑے ادارے قائم کیے اور آج حسب ضرورت واستطاعت ان میں نمایاں تبدیلیاں اور قابل لحاظ اہتمام اور انتظام کے حق میں مخلص وپرعزم ہیں۔

اس طرح تمام دینی مدارس کے پس منظر اور پیش منظر سے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حکومت ومملکت یا سماج کے متمول یا اہل ثروت افراد کی تحریک سے نہیں بلکہ قوم وملت کے دردمند، حوصلہ مند، علم دوست اور اہل دل کے تعاون وامداد کے سہارے اپنا تعلیمی، اصلاحی اور تعمیری سفر جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ اب تو زمانے کی رفتار، ترقیاتی پیش قدمیوں، جدید تعلیمی رجحانات اور مفید ایجادات کی کثرت کو ان تعلیم گاہوں نے بھی مناسب طریقے سے برتنا اور قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے ملک میں کارآمد، مفید اور اسلام کے اصولیات سے غیر متصادم تقریباً تمام مناسب ذرائع کو استعمال کرنے والے اور اپنی تعلیم وتربیت کا حصہ بنانے والے مدارس کی تعداد مسرت کن اور قابل ذکر ہوتی جارہی ہے۔ تاہم ایسی صورت حال میں بھی ان دانش گاہوں نے اپنے تشخص اور بنیادول کے اثرات کو باقی رکھنے سے غفلت نہیں برتی ہے بلکہ صالح معاشرہ کی تشکیل، بہترین شہری پیدا کرنے اور ملک وملت کی خوش حالی کو دوام بخشنے کا دامن مضبوطی سے عملاً تھام رکھا ہے۔

☆☆☆

''تبلیغی جماعت: حقائق ومعلومات کے اجالے میں''

ایک مطالعہ

مولانا ارشاد عالم نعمانی☆

یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ ہر دور میں اسلام مخالف جماعتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔لیکن جتنا نقصان اسلام کو کھلے مخالفین سے نہیں پہنچا ہے اس سے کہیں زیادہ بنام اسلام جو جماعتیں وجود پذیر ہوئی ہیں ان سے پہنچا ہے۔

اسلام کے نام پر ایسی ہی ایک جماعت ہندوستان میں ''تبلیغی جماعت'' کے نام سے ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں وجود میں آئی جو در حقیقت نجد کے اسلام مخالف ''وہابی جماعت'' کی دوسری ہندی تصویر ہے۔ یہ ابتداءً اپنے آقایان نعمت برطانیہ کے ''مالی امداد'' سے پلی، بڑھی اور پھیلی ۱ اور پھر رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے حکومت سعود تک رسائی حاصل کرلی ۲ جس کے لئے ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء ہی میں بانی جماعت مولوی الیاس صاحب (ولادت ۱۳۰۳ھ وفات ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء بن مولانا اسماعیل م۱۸۸۹ء) نے اپنے تیسرے دورۂ حج میں شاہ والی سعود سے اپنے کام اور نظام سے متعلق پورے وثوق واطمینان اور یقینی عہد وپیمان لے کر آئے تھے ۳ لہذا ان دونوں محسنوں کی بخششوں اور خصوصی عنایات سے ہندوستان میں یہ الیاسی جماعت ان (وہابی جماعت) کے عقائد وافکار اور خیالات ونظریات کی اشاعت وتشہیر میں لگ گئی اور لگی ہوئی ہے اور ایک جہانِ خوش عقیدہ کو اپنے مصنوعی تقدس اور بناوٹی خوش نمائیوں سے بدعقیدگی، رسول دشمنی اور فکری آوارگی کے سانچے میں ڈھالنے کی مذموم وناپاک کوششیں کر رہی ہے۔

اسی اسلام دشمن جماعت کے حقائق ومعلومات کی نقاب کشائی کے لیے رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ (م ۲۰۰۲ء) نے ایک کتاب بنام ''تبلیغی جماعت: حقائق ومعلومات کے اجالے میں'' لکھی۔

صاحب کتاب معروف محقق ونقاد ہونے کے ساتھ صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز اور مایہ ناز وممتاز قلم کار تھے۔ وہ جماعت اہل سنت کے عالمی شہرت یافتہ باصلاحیت عالم دین ہونے کے ساتھ قوم وملت کے مخلص وبے لوث خادم اور دینی رہنما تھے۔ کتاب چونکہ ایک ''نومولود جماعت'' کے تعارف، ان کے عقائد ونظریات اور اغراض ومقاصد کی وضاحت ونشاندہی کے لیے لکھی گئی اس لیے انہوں نے ٹھوس اور ناقابل انکار دلائل وشواہد کی روشنی میں پورے انصاف ودیانت کے ساتھ اس کی اصل حقیقت کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اندازِ بیان شگفتہ وشائستہ اور لب ولہجہ انتہائی سادہ وسنجیدہ ہے۔ جو سلیم الطبع، سلیم الخیال اور انصاف پسند قارئین کے لیے دعوت فکر ومطالعہ ہے۔

اس کے مشمولات میں ایک پیش لفظ، مقدمہ، آٹھ ابواب اور ایک خاتمہ ہے۔ پیش لفظ بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان صاحب اعظمی مدظلہ العالی کے قلم حقیقت رقم سے ہے جو کتاب کی اہمیت وعظمت پر بذات خود ایک سند ہے۔ مقدمہ میں ''اشارات'' کے عنوان سے تبلیغی فتنہ کے نقطۂ آغاز، علامت، ہندی تبلیغی جماعت کے ''وہابی'' ہونے کا اقرار نامہ، ''نجد'' کے فتنۂ وہابیت سے ان کا تعلق، حمایت ومعاہدہ اور پالیسی کا اجمالی خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ مقدمہ ہی میں ''ایک آپ بیتی'' کے عنوان سے کتاب لکھنے کے تین اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ چوتھے سبب میں تبلیغی جماعت کے تعلق سے جناب قاری اسماعیل ٹنکاروی صاحب کا سوالنامہ درج ہے جو انہوں نے تبلیغی جماعت کے حقائق ومقاصد کی دریافت کے لیے بھیجا تھا جو ص ۲۷ پہ ۳۷ منقول ہے۔ اور اس سوالنامہ کا جواب ص ۳۸ سے ص ۲۰۷ تک بہت مفصل طور سے تاریخی حقائق وشواہد کے آئینے میں علمی وتحقیقی انداز میں دیا گیا ہے۔

پہلے آٹھوں ابواب کی شاہ سرخیاں ملاحظہ کرلیں تا کہ اس کے تحت مشمولات ومندرجات کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آجائے۔ پھر مختصر طور پر ہر باب کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا تا کہ اس جماعت کے حقیقی خدوخال کی پوری طرح نقاب کشائی جو مصنفِ موصوف نے کی ہے'' سامنے آسکے۔

پہلا باب: تبلیغی جماعت کی ابتدائے آفرینش اور اس کے بانی کا تعارف
دوسرا باب: تبلیغی جماعت کے اغراض ومقاصد
تیسرا باب: دینی شقاوتوں کی ایک دردناک کہانی
چوتھا باب: اسلام دشمن سازشوں کی تحریک
پانچواں باب: تبلیغی جماعت کے ظاہری محاسن کا تذکرہ
چھٹا باب: ایک ذہنی خلجان کا علاج
ساتواں باب: تبلیغی جماعت اپنے گھر میں
آٹھواں باب: تبلیغی جماعت احادیث کی روشنی میں

پہلے باب: میں تبلیغی جماعت کے بانی مولوی الیاس کا تعارف۔ اس جماعت کی تشکیل وبنا سے ان کا مقصد، تبلیغ ودعوت کے پس پردہ پیغمبرانہ منصب کی طرف پیش قدمی اور صرف پیش قدمی ہی نہیں بلکہ چھلانگ لگا کر انبیا سے بھی آگے نکل جانے کی لاحاصل وناپاک کوشش نیز ان کا اپنے ماننے والوں میں ''تنقیص انبیا وصحابہ وبزرگانِ دین کے جذبہ'' کی حوصلہ افزائی کو ناقابل انکار دلائل وشواہد سے بیان کیا گیا ہے اور پھر اس پر زبردست علمی وشرعی گرفت کی گئی ہے۔

دوسرے باب: میں تبلیغی جماعت کے اغراض ومقاصد، ان کی جدوجہد کا مرکزی نقطہ اور ان حقائق کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ تبلیغ سے کس قسم کے مقاصد اس جماعت کے پیش نظر ہیں؟ اور کن لوگوں کی تعلیمات وہدایات کی اشاعت ان کا مقصد ہے؟ اور سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ کا رشتہ یہ کن سے جوڑنا چاہتی ہے؟

تیسرے باب: میں نجد کے ''فرقۂ وہابیہ'' کی مسلمانوں اور مذہبی مقامات کے تعلق سے ان کے قیامت آشوب مظالم کی دردناک کہانی دیوبندی گروہ کے شیخ الاسلام مولوی حسین احمد ٹانڈوی، خلافت کمیٹی کے وفد کی رپورٹ اور مولانا محمد علی جوہر کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ پھر ہند کے ''تبلیغی جماعت'' کی نجد کے اس ''وہابی جماعت'' کے ساتھ اعتقادی اور فکری ارتباط ویکسانیت کو انہیں کے مرکزی قائدوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب: میں اسلام مخالف تحریکات، جماعتیں اور ان کا باہمی رشتہ اور رمالی امداد واعانت کے جذبات کی تفصیل کو آشکارا کیا گیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے اخراجات اور آمدنی کے دوخفیہ ذرائع: برطانیہ کی جانب سے مالی معاونت کو'' مکالمۃ الصدرین'' مطبوعہ دیوبند ص۱۰ کے حوالہ سے اور سعودی حکومت کی جانب سے مالی امداد کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔ پھر غیروں کے پس خوردہ پہ پلنے والی اس جماعت کے حقیقی مشن کو واضح کیا گیا ہے۔

پانچویں باب: میں تبلیغی جماعت کے ظاہری محاسن کو ان دو عنوان (۱) مسلمانوں میں دینی زندگی برپا کرنے کی جدوجہد (۲) بیرون ممالک میں دین کی تبلیغ، کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان دونوں کی قرار واقعی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی باب میں عوام کی اس ''خوش فہمی'' کہ ''جو جماعت تبلیغی جدوجہد کے ذریعہ لوگوں میں دین کے ساتھ وابستگی کا والہانہ جذبہ پیدا کرے اس کی برائیوں کو نظر انداز کر کے صرف اس کی اچھائیوں کی طرف بڑھنے میں کوئی مضایقہ نہیں'' کی تردید بذات خود کرنے کے بجائے ایک معروف دیوبندی عالم مولانا عامر عثمانی ایڈیٹر ''تجلی'' دیوبند کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے جو اس طرح کے تمام خیالات اور خوش فہمیوں کے تاروپود بکھیرنے کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے۔ مدیر ''تجلی'' کا اقتباس یہ ہے۔

''عقیدہ وخیال کی ایک خرابی بھی بعض مرتبہ اتنی شدید ہوتی ہے کہ تمام اعمالِ خیر فاسد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان نہ رکھتا ہو یا صحابہ کرام کی عزت اس کے دل میں نہ ہو یا احادیث صحیحہ کو تاریخ سے زیادہ وقعت نہ دیتا ہو تو ان میں سے ہر بات بجائے خود اتنی قبیح ہے کہ اس کی قباحت حسن عمل کا پورا دفتر بھی کم نہیں کر سکتا۔ اور جہاں یہ قباحت پائی جائے گی وہاں اگر نیکوکاری کے پہاڑ بھی کھڑے ہوں تو بھی یہی کہا جائے گا کہ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔''[۴]

''تجلی'' کے اس اقتباس کی روشنی میں تبلیغی جماعت کے تعلق سے عوام کو ان کی خوش گمانیوں پر لمحہ فکریہ دیتے ہوئے صاحب کتاب رقمطراز ہیں ''غور فرمایئے! عقیدہ وخیال کی صرف ایک خرابی کا جب یہ حال ہے تو جہاں بدعقیدگی کی شقاوتوں سے دفتر کے دفتر سیاہ ہو گئے ہوں وہاں نکوکاری کی نمائش کیا کام آسکتی ہے؟[۵]

دوسرے عنوان: ''بیرون ممالک میں دین کی تبلیغ'' کی قرار واقعی حیثیت پر تنقیدی تبصرہ اور عالمی تبلیغی جدوجہد کے فسانہ کے پیچھے چھپے ہوئے سربستہ رازوں اور پروپیگنڈوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پھر

"قادیانی جماعت" کی عالمگیر تبلیغی جدوجہد کو بیان کرتے ہوئے "ختم نبوت" کے انکار پر قادیانی جماعت اور تبلیغی جماعت کے نقطہ اتحاد کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر "مدعا" ان الفاظ میں قلم بند کیا گیا ہے۔

"ان ساری بحثوں سے میرا مدعا یہ ہے کہ ختم نبوت کے انکار کی بنیاد پر اگر قادیانی جماعت کی تبلیغی تحریک ایک سچے مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسی بنیاد پر تبلیغی جماعت کو بھی ایک سچے مسلمان کے لیے ناقابل قبول نہ قرار دیا جائے۔ [6]

چھٹے باب: میں اس ذہنی خلجان کا بھرپور "علاج نامہ" پیش کیا گیا ہے کہ ان کی تقریریں اجتماعات کے موقع پر صرف اسلام کی موٹی موٹی باتیں اور اصلاحی قسم کی موضوعات کے اوپر ہی کیوں ہوتی ہیں۔ مذہبی اختلافات اور اعتقادی مسائل پر وہ اپنے اجتماعات میں اظہار خیال کیوں نہیں کرتے۔ اس صورت حال کے ہوتے ہوئے ان پر کسی کا مذہب تبدیل کرنے کا الزام کیوں عائد کیا جاتا ہے؟

پھر اسی کے بیچ میں آٹھ صفحات میں خوش عقیدہ مسلمانوں پہ نجدی مظالم کی کہانی تصویروں کی زبانی پیش کی گئی ہے اور جن اہم اور مقدس مقامات کو نجدیوں نے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا تھا اور نہایت سفاکی اور بے دردی سے انہیں مسمار کر دیا تھا ان مقامات کا عکس بھی پیش کیا گیا ہے۔

ساتویں باب: میں ایک فاضل دیوبند مولوی عبدالرحیم شاہ کی کتاب "اصول دعوت وتبلیغ" کے حوالے سے تبلیغی جماعت کے تعلق سے حیران کن انکشافات، مفاسد کی نشاندہی، ان کا دینی تعصب، ان کے اندر نماز کا غرور اور جاہلانہ قیادت وپیشوائی اور ان کے علاوہ بے شمار قباحتیں، شناعتیں، بدعات وخرافات، تصنعات نیز اس جماعت کی شرعی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے اور اس میں بھی اس سچائی اور دیانت داری کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کسی ایسے شخص کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے جو آپسی تفرقہ وتنازع کی وجہ سے اپنے راز درون خانہ کو اگلا ہو نہیں بلکہ اس شخص کی باتیں پیش کی گئی ہیں جن کا مقصود محض اصلاح تھا۔ جیسا کہ اس کی کتاب "اصول دعوت وتبلیغ" کے ص ۵۲/۵۴ پہ مصنف موصوف کا اس تعلق سے حلفیہ بیان موجود ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس کتاب پر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند شمارہ دسمبر ۱۹۶۸ء میں مبصر نے تبصرہ کرتے ہوئے کتاب کے اندر مندرج حالات ودعاوی اور الزامات کی تصدیق بھی تبلیغی جماعت کے ذمہ داران سے طلب کی تھی لیکن مبصر کے اشاعت کے کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی تبلیغی جماعت کی طرف سے خاموشی ہی برتی گئی جو ان کی بداعتقادی وبدعملی کا "یقینی اعتراف" ثابت ہوا۔

یہی باب کتاب کی اصل جان ہے کیونکہ کسی بھی جماعت کے تعلق سے خود ان کے کسی فرد کی شہادت وگواہی کا اعتبار زیادہ اہم کا حامل ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کے تعصب وتنگ نظری کا شائبہ یا جماعتی عصبیت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا اس کا اظہار خود زیر نظر کتاب کے مصنف نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کسی فرد یا جماعت کی اصل حقیقت سے باخبر ہونے کے لیے گھر والوں کی رائے سب سے زیادہ قابل اعتماد قرار دی جاتی ہے۔ یہاں مذہبی تعصب اور جماعتی عناد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں جو کچھ ہے سرتا سر واقعہ ہے۔ حقیقت کا اظہار ہے اور ایک سربستہ راز ہے جو فاش ہو گیا۔" [7]

آٹھویں باب: میں کل پندرہ احادیث، ان کی نفیس تشریحات ان میں مذکور علامات کی روشنی میں "تبلیغی جماعت کے فتنہ ہونے کی حقیقت" کو بڑے نرالے اور اچھوتے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

خاتمہ میں "الوداعی کلمات" کے عنوان سے امت مسلمہ کو "دعوت فکر وعمل" دیا گیا ہے۔ جس پہ سنجیدگی سے سوچنے اور عمل پیرا ہونے پر ہر کوئی اپنے کو فتنہ میں مبتلا ہونے اور اس کی بھٹی میں جلنے سے بچا سکتا ہے۔ اس کتاب کا ہندی، انگلش وعربی ایڈیشن بھی نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ ہر طبقہ کے افراد کے لیے یکساں مفید ہونے کے ساتھ بیرونی ممالک کے افراد بھی اس جماعت کے صحیح خدوخال، مقاصد ونصب العین اور حقیقت حال سے متعارف ہو سکیں۔

مراجع: [1] المکالمۃ الصدرین، مطبوعہ دیوبند ص ۸ [2] شاہ والی سعود کا دورۂ ہند، شائع کردہ لالہ رخ پبلیکیشنز سرینگر ص ۳۸ [3] مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت مطبوعہ لکھنو۔ ص ۷۹ [4] ماہنامہ تجلی دیوبند شمارہ جون ص ۱۹ سن ۱۹۸۵ء [5] تبلیغی جماعت حقائق ومعلومات کے اجالے میں ص ۱۱۴ [6] ایضا۔ ص ۱۲۷ [7] ایضا ص۔ ۱۵۵

☆☆☆

اللہ کرے کہ حضرت علامہ ارشد القادری کا

یہ کارواں اپنی منزل کی طرف

کامیابی کے ساتھ گامزن رہے

باب پنجم

مقالات طلبہ

(اردو، عربی اور انگریزی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی

جاوید عالم نظامی

اس کرۂ ارض پر دین ودنیا کی تزئین وترقی کے لیے بے شمار حکمراں، امراء اور لیڈران پیدا ہوئے جن کی طوفانی شخصیتوں نے مثالی انقلابات برپا کیے، لیکن ہم ان کی ساری جدّ وجہد اور انقلابات کو وقتی اور جزئی حد تک ہی مؤثر دیکھتے ہیں۔

ہاں! اس لہلہاتی زمین سے ایک جماعت جلوہ بار ہوئی جس نے انسان کی ہدایت ورہنمائی فرمائی اور انسان اس سے منسلک ہوتے ہوئے کبھی بھی ضلالت وہلاکت کی جانب نہیں جاسکتا، جس جماعت کو انبیاء ومرسلین سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خالق کائنات عزوجل حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک یکے بعد دیگرے انبیاء کرام علیہم السلام کو انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے مبعوث فرماتا رہا۔ مگر جب وہ دور آگیا جس میں ہدایت ونور کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، چہار دانگ عالم میں کفروشرک کا تاریک بادل چھا چکا تھا، عدل وانصاف کا وجود ختم ہونے لگا تھا، مظلوموں، بے کسوں، بے بسوں، بیواؤں، یتیموں، اور کمزوروں کا کوئی پرسان حال نہ تھا تو ایسے پُرآشوب اور پُرفتن ماحول میں ۱۲ ربیع الاول شریف عام الفیل بمطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ عیسوی بروز دوشنبہ بوقت صبح صادق ہادیٔ اعظم، نوید مسیحا محمد عربی ﷺ مکہ کی سرزمین پر عالم وجود میں جلوہ بار ہوئے، اور ساری انسانیت کو اپنی ضوفشاں رحمت وانوار کی کرنوں سے مستنیر ومستفیض فرمایا۔ جیسا کہ خالق کائنات عزوجل کا قرآن کریم میں ارشاد گرامی ہے: قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین "بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب" (سورۃ المائدۃ ۵۸، ۵۹) مزید دوسرے مقام پر فرمایا ہے: وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ "اے محبوب! ہم نے تمہیں سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا" (سورۃ الانبیاء آیت ۱۸۹) چنانچہ نبی مکرم ﷺ کے پیدا ہوتے ہی اور اس سے قبل شکم مادر میں بے شمار فیضان وبرکات ظہور پذیر ہوئے جیسا کہ علامہ پیر کرم شاہ ازہری نے اپنی کتاب میں ایک حدیث پاک نقل فرمائی "حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو آپ کی برکت سے ایک نور نمودار ہوا جس کی روشنی میں میری آنکھوں کے حجابات اٹھ گئے یہاں تک کہ میں نے شام کے محلات دیکھ لیے" (سیرۃ الرسول المعروف ب ضیاء النبی ج ۲، ص ۲۹ مصنفہ پیر کرم شاہ ازہری)

حضرت عبدالمطلب کو خوشخبری: آج دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ہے، مکہ کا ماحول انتہائی خوشگوار دکھائی دے رہا ہے، فضا سازگار ہے ایسی خوشگوار گھڑی میں مکہ کے سردار جناب عبدالمطلب حطیم کعبہ میں اپنے بیٹوں اور دیگر لوگوں کے ساتھ گفت وشنید کر رہے ہیں اتنے میں حضرت عبداللہ کی کنیز (برکت نامی) ام ایمن حاضر ہوکر عرض کرتی ہے حضور! مالکن حضور آمنہ کے گھر میں حسین وجمیل اور سُرمگیں آنکھوں والا فرزند تولد ہوا ہے اس لیے مالکن کا حکم ہے کہ آپ تشریف لائیں۔

یہ سن کر حضرت عبدالمطلب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگتے ہیں اور اٹھ کر غلاف کعبہ کو بوسہ دیتے ہیں اور خدائے عزوجل کی بارگاہ میں دعاء کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر زیر لب دعا میں مصروف ہوکر تیزی سے حضرت آمنہ کے پاس آتے ہیں تو حضرت آمنہ ولادت کے وقت کے انوار تجلیات بیان کرتی ہیں۔ حضرت عبدالمطلب انتہائی خوشی سے اپنے عزیز پوتے کو بوسہ دے کر بیت اللہ میں لے آتے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں اس کے لیے خوب دعائیں کرتے ہیں۔ اور پھر واپس گھر لے آتے ہیں۔

ثوبیہ کی آزادی:۔ جب حضرت عبداللہ کے یتیم بیٹے کی خبر ہاشم کے گھرانے میں پھیلی تو ہر طرف خوشی ہی خوشی چھا گئی، چنانچہ یہ خبر عبدالعزیٰ ابولہب کی کنیز ثوبیہ کے گوش گزار ہوئی تو وہ دوڑتی ہوئی اپنے آقا ابولہب کے پاس آئی اور عرض کی آقا حضور! آپ کے مرحوم بھائی عبداللہ کے گھر میں چاند سا ایک بچہ تولّد ہوا ہے، یہ سن کر ابولہب فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا اور ثوبیہ کو آزادی کا پروانہ دے دیا۔

ثوبیہ عرض کرتی ہے آقا حضور! میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کرسکتی ہوں؟ ابولہب کہتا ہے تمہارا شکریہ یہی ہے کہ جب تک آمنہ کو کوئی دائی ہاتھ نہ آجائے تب تک میرے یتیم بھتیجے کو تم دودھ پلاؤ میں تمہیں اس کی مزدوری بھی دوں گا۔ ثوبیہ کہتی ہے خدا آپ کا بھلا کرے! آپ نے تو مجھے حیات بخش دی ہے میں نے جس طرح دو سال قبل آپ کے بھائی حمزہ کو دودھ پلایا اسی طرح اس کو بھی بخوشی دودھ پلاؤں گی تین روز دودھ پلانے کے بعد سیدہ آمنہ اپنے لختِ جگر کو ثوبیہ کے سپرد کر دیتی ہیں، ثوبیہ بحسن خوبی اپنا کام انجام دیتی ہے۔

مولد مقدس:۔ فرش زمین کا وہ مقدس حصّہ ہے جو سب سے پہلے عقیل بن ابی طالب اور ان کی اولاد کی ملکیت میں رہا پھر حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف ثقفی نے ایک لاکھ دینار قیمت ادا کر کے اپنے گھر کا حصّہ بنالیا اور ایک عرصہ دراز تک ابن یوسف کا مملوک رہا اور البیضاء کے نام سے موسوم رہا کیونکہ یہ سفید چونا سے تعمیر کیا گیا تھا اور پلاسٹر بھی سفید چونا کا تھا۔

پھر ہارون رشید کے دور خلافت میں ان کی نیک بخت اہلیہ۔ بروایت دیگر ان کی والدہ خیزران (جب وہ بارادۂ حج مکہ آئی) نے اس مکان کو حاصل کر کے اس جگہ مسجد تعمیر کروادی۔

اسم مبارک:۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں مذکور ہے کہ ساتویں دن آپ کا ختنہ کیا گیا اور ایک جانور ذبح کر کے آپ کے نام عقیقہ کیا گیا۔ حضرت عبدالمطلب نے اپنے قبیلے کو دعوت عام دی۔ قبیلہ والے آئے اور انتہائی مسرت کے ساتھ کھانا تناول کیا۔

جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو حضرت عبدالمطلب سے فرزند کا نام دریافت کیا۔ حضرت عبدالمطلب نے اس کا نام "محمد" ﷺ بتایا۔ لوگ ازراہِ حیرت واستعجاب بولے: یہ کیسا نام تجویز کیا ہے جسے آپ نے اس سے پہلے اہل بیت میں سے کسی کے لیے بھی منتخب نہیں فرمایا تو آپ نے جواباً فرمایا: أَرَدْتُ أَنْ يَحْمَدَهُ اللهُ فِي السَّماءِ وَخَلْقُهُ فِي الْأَرْضِ "میری خواہش ہے کہ آسمان میں اللہ تعالیٰ اور زمین میں اس کی مخلوق اس مولود مسعود کی ثناء کرے" اس بناء پر میں نے اس کے لیے سب سے نمایاں نام کا انتخاب کیا۔

رضاعت:۔ سب سے پہلے سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے اپنے نورِ نظر کو دودھ پلایا پھر ثوبیہ کو یہ شرف حاصل ہوا، اس کے بعد کئی خواتین حضرت حلیمہ سعدیہ بنت ابوذؤیب الحارث، خولہ بنت منذر ام ایمن اور بنی سعد کی ایک اور خاتون ہیں جنہیں خدمت رضاعت کی یہ دولت عظمیٰ ملی۔ لیکن سب سے زیادہ خدمت رضاعت کا سہرا حضرت حلیمہ سعدیہ کے سر ہے جنہیں دو سال تک یہ سعادت حاصل رہی۔

سرورِ دوعالم حضرت عبدالمطلب کی کفالت میں:۔ جب سیدہ آمنہ کے انتقال پُر ملال کی خبر حضرت عبدالمطلب کو پہنچی تو آپ پر بھی آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا اور اپنے یتیم فرزند ارجمند کو خود اپنی کفالت میں لے لیا اور بڑی شفقت والفت کیساتھ تربیت کرنے لگے اور اٹھتے بیٹھتے، کھاتے اور پیتے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے لگے یہاں تک کہ اپنی مخصوص نشست میں بھی اپنے پاس بٹھاتے جہاں کوئی دوسرا بیٹھنے کی جُرأت نہیں کرسکتا تھا۔ لوگ وہاں بیٹھنے سے منع کرتے تو حضرت عبدالمطلب فرماتے "دَعُوْا إِبنِي فواللهِ أنّ له لشاناً" "میرے بچہ کو مت روکو آگے آنے دو بخدا اس کی بڑی شان ہوگی۔

اس طرح سے ماں کے بعد دو سال دادا کی بے پاں محبتوں میں بسر ہوگئے یہاں تک کہ جب سرورِ دوعالم نے آٹھ سال کی عمر میں قدم رکھا تو قدرت خداوندی نے دادا کو بھی ایک سو چالیس، بروایت دیگر ایک سو دس سال کی عمر میں اٹھالیا۔

مگر اس جہاں سے رخصت ہونے سے قبل حضرت ابوطالب کو

بلا کر سرور عالم کو ان کے سپرد کیا اور ان کی نگہداشت کی وصیت کی جب جنازہ اٹھایا گیا تو آپ ﷺ جنازہ سے لپٹ گئے اور خوب گریہ وزاری کی یہاں تک کہ دفن کر دئے گئے۔

نبی مکرم ابوطالب کی کفالت میں:۔ حضرت ابوطالب نے بھی نبی کریم ﷺ کی وہ خدمت انجام دی کہ کبھی آپ کو یتیمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ کتب سیرت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ حضرت ابوطالب کے نزدیک اپنے بچوں سے بھی زیادہ محبوب تھے جس کی بناء پر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور آپ کو بہت مبارک سمجھتے تھے۔

چنانچہ جب تک سرور عالم دسترخوان پر تشریف نہ لے آتے تب تک کھانا تناول نہ کیا جاتا تھا یا کبھی اتفاقیہ طور پر آپ موجود نہ ہوتے تو حضرت ابوطالب کسی بچہ کو بھیج کر بلاتے تب کھانا شروع فرماتے کیونکہ آپ کی وجہ سے کھانے میں برکتوں کا ظہور ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے جب کبھی آپ کی غیر موجودگی میں کھانا تناول کر لیا جاتا تو گھر والوں کو شکم سیری حاصل نہ ہو پاتی تھی۔

کسب معاش کا دور:۔ سرکار دو عالم ﷺ اس طرح اپنے مشفق چچا کی کفالت میں پروان چڑھتے رہے، مگر حضرت ابوطالب چونکہ انتہائی قلاشی و مفلسی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس لیے گھریلو حالت کا سدھار بھی ضروری تھا۔ تو جب رحمت دو عالم نو یا دس سال کے ہو گئے تو حضرت ابوطالب نے لوگوں سے کچھ ریوڑ لے کر چرانے کے لیے آپ کو دے دیے۔ سرور دو عالم بکریاں چراتے جن سے کچھ قرار حاصل کرتے اور اس طرح اپنے چچا کی اعانت و مدد ان قرار سے کرتے تا کہ ان کا بار گراں کچھ تو ہلکا ہو۔

سفر شام اور بحیری راہب سے ملاقات:۔ جب سرور دو عالم کی عمر تقریباً بارہ سال ہو گئی تو حضرت ابوطالب نے تجارتی مقاصد کیلئے قریشی قافلہ کے ساتھ شام کی طرف سفر کرنے کا قصد کیا روانہ ہونے لگے تو رحمت عالم نے اونٹ کی نکیل پکڑ کر بڑے درد مند لہجہ میں چچا جان سے عرض کیا، چچا جان! آپ ہی تو میرا سہارا ہیں اب مجھ کو کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں؟ حضرت ابوطالب نے یہ اشتیاق دیکھ کر اپنے ساتھ سوار کر لیا، کئی دن کی مسافت کے بعد قافلہ مقام "بصریٰ" میں پہونچا جہاں بحیری نامی ایک راہب اپنے کلیسا میں رہتا تھا، اس نے جب قافلہ کو دیکھا کہ اس میں ایک بچہ ہے جس پر بادل سایہ کیے ہوئے ہے مزید درخت نے بھی اسے اپنے سایہ سے گھیر لیا ہے تو اس نے خیال کیا ہو سکتا ہے کہ ہماری کتابوں میں آخری نبی کی ذکر کردہ صفات کا حامل یہی ہو۔

چنانچہ ان صفات کی تصدیق کرنے کے لیے اس نے تمام قافلہ والوں کو دعوت عام دی کہ اس میں سے بچے، بوڑھا، غلام اور آزاد کوئی بھی نہ چھوٹے۔ اس پر قافلہ والوں نے ازراہ حیرت پوچھا کہ بارہا قافلہ یہاں سے گذرا ہے مگر کبھی بھی آپ نے التفات نہ کی آج یہ معمول کے برعکس کیوں؟ اس پر پادری نے بات ٹالتے ہوئے کہا کہ چونکہ آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور مہمانوں کی عزت افزائی کرنا ہمارا فریضہ ہے بہر حال تمام قافلہ والے دعوت پر پہونچ گئے اور رحمت عالم کو حفاظت کی خاطر خیمہ ہی میں چھوڑ دیا پادری نے جب ان میں وہ صفات نہ پائیں تو بولا! کوئی تم میں سے رہ تو نہیں گیا ہے بتایا گیا کہ ایک بچہ حفاظت کی خاطر خیمہ میں چھوڑ دیا گیا ہے، پادری نے حکم دیا کہ اسے بھی لایا جائے کیونکہ یہ دعوت عام ہے تو رحمت عالم کو بھی لایا گیا اور کھانا تناول کیا گیا۔

جب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو پادری نے خدمت میں حاضر ہو کر لات و عُزیٰ کا واسطہ دے کر سوال کیا آپ نے خود لات عُزیٰ کی قسم کھانے سے منع فرمایا، تو پادری نے اللہ کی قسم کھا کر سوالات کیے جو آپ ﷺ کی نیند و بیداری اور دیگر چیزوں کے متعلق تھے، رحمت دو عالم سب کا جواب دیتے رہے پادری اپنی کتابوں کے مطابق تصدیق کرتا رہا، جب تمام چیزوں کی تصدیق ہو گئی تو اس نے آپ کی پشت انور سے کپڑا اٹھا کر مہر نبوت کو دیکھا اور بوسہ لے لیا، اس پر قافلہ والوں کو بھی بڑا تعجب ہوا۔ اس کے بعد پادری بولا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ابھی تک اس کا باپ زندہ ہو، اس پر ابوطالب نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے یہ شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ پھر والدہ کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کچھ سال قبل وہ بھی وفات پا چکی ہیں۔ اس گفتگو کے بعد راہب نے ابوطالب کو مشورہ دیا ہے کہ آپ جلد از جلد اسے لے

واپس اپنے وطن لوٹ جائیں ورنہ یہودیوں کو ان کے متعلق یہ باتیں معلوم ہوگئیں تو انہیں ایذا دیئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ یہ سن کر ابو طالب شام گئے اور بڑی عجلت و جلد بازی سے لین دین طے فرما کر رحمت عالم کو واپس سرزمین مکہ لے آئے۔

حضرت خدیجہ سے عقد نکاح:۔ سرور دو عالم کی رفیقہ حیات بننے سے قبل حضرت خدیجہ الکبریٰ کی دو شادیاں ہو چکی تھیں، دونوں شوہر وفات پا چکے تھے اور دونوں سے اولاد بھی تھیں۔ جب دوسرے شوہر ابو ہالہ وفات پاچکے تو مکہ کے بڑے بڑے رؤساء نے اپنے عقد میں لانے کے لیے پیغامات بھیجے مگر ام المؤمنین نے سرکار کے علاوہ کسی کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ آپ پہلے ہی سے سرکار کے ظاہری و باطنی کمالات کی وجہ سے آپ کی گرویدہ تھیں مگر جب میسرہ نے آپ کے سفری حالات بتائے تو میلان خاطر میں اور اضافہ ہو گیا۔

چنانچہ ام المؤمنین نے اپنی ہمراز نفیسہ بنت منیہ کی معرفت بلاوا بھیجا، آپ تشریف لائے تو آپ ﷺ کی زوجیت میں داخل ہونے کی تمنا ظاہر کی سرکار نے قبول فرمایا۔

یہ منگنی تھی اسکے بعد سرکار کے چچا ابو طالب اور ام المؤمنین کے چچا عمر بن اسد نے رشتہ طے فرمایا اور تاریخ متعین فرمادی متعینہ تاریخ میں ان دونوں حضرات (ابو طالب اور عمرو بن اسد) کی وکالت میں بڑے بڑے شرفاء و رؤساء کی موجودگی میں عقد نکاح کردیا گیا۔ یہ آپ کی پہلی چالیس ۴۰ سالہ زوجہ مطہرہ تھیں جن سے پچیس سال کی عمر میں نکاح فرمایا اور جب تک یہ باحیات رہیں کسی دوسری عورت کو آپ ﷺ نے شرف زوجیت نہ بخشا۔ ابن ہشام نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ الکبریٰ کے مہر میں بیس جوان اونٹنیاں دیں۔

اعلان نبوت:۔ اس سلسلے میں سب سے معتمد و ثقہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا ہے جسے رئیس المحدثین امام محمد بن اسماعیل البخاری نے اپنی بخاری شریف میں رقم کیا ہے۔ جس کا خلاصہ پیش خدمت ہے خاتم الانبیاء ﷺ کی نبوت کا اعلان چالیس سال کی تکمیل پر ماہ ربیع الاول میں رؤیا صادقہ کے ذریعہ ہوا جن کی تعبیر دوسرے دن صبح کے اجالے کی مانند ظاہر ہو جاتی۔ چھ ماہ تک یہ سلسلہ رہا۔ چنانچہ رؤیا صادقہ شروع ہونے کے بعد تنہائی آپ کے دل کو کھینچنے لگی اس بناء پر آپ کئی کئی روز تک کا کھانا لے کر جبل نور کی ایک غار حراء میں تشریف لے جاتے اور اسی میں محو عبادت رہتے اور تدبر و تفکر میں مستغرق رہتے۔ یونہی ایک دن آپ مصروف عبادت تھے کہ جبرئیل تشریف لائے اور آپ سے کہا "اقرأ" آپ نے جواب دیا "ما انا بقارئ" تو فرشتے نے زور سے آپ کو بھینچا پھر پہلی مرتبہ کی طرح عرض کیا یونہی عرض و معروض کرنے اور بھینچے کا سلسلہ تین مرتبہ تک جاری رہا پانچویں مرتبہ جب فرشتہ نے اقرأ باسم ربک الخ کہا تو آپ نے سورہ علق کی ابتدائی پانچ سورتیں تلاوت فرمادیں۔

فرشتہ چلا گیا تو آپ پسینے میں شرابور گھر تشریف لائے، گھر والوں سے فرمایا زملونی مجھے چادر اڑھاؤ گھر والوں نے چادر اڑھا دیا۔ جب کچھ سکون ہوا تو اپنی جان پر خوف کھایا تو حضرت خدیجہ الکبریٰ نے تسلی دی کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ اتنی ساری بے شمار صفات حمیدہ کے مالک ہوں اور ان سب کے باوجود رب قدیر آپ کو پریشانی میں مبتلا کرے۔

پھر ام المؤمنین آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل (جو کہ بُت پرستی سے علیحدہ ہو کر نصرانی ہوگئے تھے) کے پاس لے کر آئیں تو آپ ﷺ نے غار حرا کے واقعات بتائے تو ورقہ نے کہا یہ (جبرئیل) وہی ناموس رسالت ہیں جو موسیٰ پر بھی وحی لایا کرتے تھے۔ پھر ورقہ نے کہا کاش! میں اس وقت موجود ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکالے گی اور آپ پر ظلم و ستم ڈھائے گی۔ اس پر آپ نے پوچھا کیا مجھے میری قوم وطن سے نکال دے گی ورقہ نے کہاں ہاں! اس طرح کی جو بھی دعوت لے کر آیا ہے قوم نے اس سے دشمنی کی ہے۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد ورقہ انتقال کر گئے اور رسول اللہ ﷺ حمایت نہ کر سکے اس کے بعد کچھ دنوں تک کے لیے یہ سلسلہ وحی منقطع ہو گیا جس میں آپ اتنا مضطرب ہوئے کہ پہاڑ سے کود جانے کی خواہش کی۔ ایک دن آپ کہیں سے گذر رہے تھے کہ آپ کو ندا آئی آپ نے اوپر دیکھا تو فضا میں کرسی پر بیٹھا ایک فرشتہ دکھائی دیا جسے آپ دیکھ کر مرعوب سے ہو گئے پھر آپ گھر آئے اور چادر اوڑھ لی۔ اتنے میں سورۂ مدثر کی

ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد نزول وحی کا سلسلہ بڑی سرگرمی سے شروع اور اسی کے ساتھ اشاعت اسلام کا بھی۔

دعوت اسلام:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سورۂ مدثر میں تبلیغ کا حکم فرمانے کے بعد آپ ﷺ تبلیغ شروع فرماتے ہیں سب سے پہلے جو نفوس قدسیہ ایمان لائے وہ عورتوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ، بالغ مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق، بچوں میں حضرت علی، آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم۔ ان نفوس قدسیہ کے ایمان لانے کے بعد کثیر نیک سرشت اور باکمال شخصیتیں مشرف باسلام ہوئیں جن میں حضرت حمزہ آپ کے چچا ہیں جو بعثت کے دوسرے سال ایمان لائے ان کے بعد ۳ ربعثت نبوی میں حضرت عمر فاروق اعظم ہیں جن سے چالیس کی تعداد پوری ہوئی اور اسلام کو ایک عظیم تقویت حاصل ہوئی۔ یونہی ہادیٔ اعظم ﷺ لوگوں کو راہ راست دکھاتے رہے اور آپ کے ساتھ اشاعت اسلام میں حضرت ابوبکر بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور اس راہ میں وہ بڑی سے بڑی مصیبت کا خندہ روئی سے استقبال کرتے۔ اس طرح تبلیغ کے تین سال گذر گئے جو خفیہ تبلیغ پر مشتمل تھے۔

دعوت اسلامیہ کا دوسرا دور:۔ اس دعوت توحید کو مزید وسعت دینے کے لیے آیت کریمہ ''وانذر عشیرتک الأقربین واخفض جناحک لمن اتبعک من المؤمنین'' (اور آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو اور نیچے کیا کیجئے اپنے پروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان سے) نازل ہوئی یہ حکم سن کر آپ کئی روز متفکر رہے کہ ایک غلط روایت پسند قوم کے سامنے یہ پیغام کیسے پیش کیا جائے؟ بالآخر ایک مضبوط عزم کے ساتھ اُٹھے اور بنو عبدالمطلب کو بُلا بھیجا بنو عبدالمطلب اور بنو عبد مناف میں تقریباً پینتالیس افراد آئے جن میں ابولہب بھی تھا۔

رسول اللہ کے اپنا مدعا پیش کرنے سے قبل ہی ابولہب نے اپنی بکواس شروع کردی اور طرح طرح کے حیلے اور خوف دلا کر آپ ﷺ کو اشاعت اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کی، ابولہب کی انہی باتوں پر مجلس ختم ہوگئی اور سرکار اپنی بات پیش نہ کر سکے۔

پھر چند روز خاموشی سے گذرنے پر جبریل آئے سلسلہ دعوت جاری رکھنے کے لیے کہا تو آپ نے پھر بنو عبدالمطلب کو بُلایا اور دعوت اسلام پیش کی اس پر ابولہب اول فول بکنے لگا تو سب نے اسے ڈانٹا اور غیرت دلائی، ابولہب نے کہا جب عرب سے تمہارا واسطہ پڑے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ حضرت ابوطالب نے سرکار کی حفاظت کا اعلان فرماتے ہوئے کہا کہ جب تک ہمارے جسم میں جان رہے گی ہم ضرور ان کی حفاظت کریں گے۔

تیسری مرتبہ آپ صفا پہاڑی پر آئے اور یا صباحاہ کہہ کر لوگوں کو بلایا آناً فاناً لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا اے لوگو! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے لشکر ہے جو عنقریب تم پر حملہ آور ہونیوالا ہے تو کیا تم مجھے اس قول میں سچا جانو گے؟ لوگوں نے بیک زبان کہا کیوں نہیں آپ نے ہمیشہ سچ بولا ہے۔ یہ جذبہ دیکھ کر آپ ﷺ نے دعوت توحید پیش کی اور جہنم کے عذاب سے ڈراتے ہوئے نیکی پر ابھارا ابولہب نے سنا تو آگ بگولہ ہوکر بولا محمد! ہلاکت ہو تمہارے لیے کیا اسی لیے ہمیں جمع کیا ہے پروردگار عالم نے اس گستاخی کی مذمت میں پوری ایک سورت تبت یدا الخ نازل فرمائی جس میں قیامت تک کے لیے ہلاکت و بربادی ابولہب کے ساتھ کردی۔

دعوت اسلامیہ کا تیسرا دور:۔ جب مختلف قبائل کی عظیم شخصیتیں اسلام قبول فرما کر اسلام کو فروغ دینے میں مصروف ہوگئیں اور دیگر لوگ بھی اسلام سے متاثر ہونے لگے تو آیت کریمہ ''فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین'' ترجمہ۔ اے محبوب حق کو کھول کر بیان کیجئے اور مشرکین کی طرف سے منہ پھیر لیجئے۔ نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے یہ حکم پاکر کھلم کھلا تبلیغ کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئے یہ کارروائیاں دیکھ کر کفار قریش سے رہا نہ گیا تو ان میں سے چند ابوجہل عمرو بن ہشام، ابوسفیان، عتبہ اور شیبہ بن ربیعہ وغیرہم حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور بولے ابوطالب آپ اپنے بھتیجے کو باز رکھ لیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا اور اسلاف کو گمراہ کہتا ہے۔

حضرت ابوطالب نے معاملہ کو بڑی نرمی سے سمجھا بجھا کر ٹال دیا تو

وہ لوگ چلے گئے اور آپ ﷺ اپنے کام میں مصروف رہے، کفار نے جب دیکھا کہ ہماری بات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہے تو پھر وہ ابو طالب کے پاس آئے اور جنگ کی دھمکی دیکر اپنی بات ان کے سامنے رکھی، حضرت ابو طالب چونکہ پیرانہ سالی میں تھے اس لیے وہ کچھ نرم پڑ گئے اور سرورِ دو عالم سے عرض کیا جانِ عم! ایسا بوجھ نہ لو جس کے اٹھانے کی میرے اور تمہارے اندر سکت نہ ہو۔ اس پر سرکار نے فرمایا چچا جان یہ لوگ میرے ہاتھوں میں چاند و سورج رکھ دیں تب بھی میں باز نہ آؤں گا یہاں تک کہ پروردگار عالم اس دین کو غلبہ دے دے یا میری جان چلی جائے۔

یہ کہہ کر آپ روتے ہوئے اٹھنے لگے تو ابو طالب نے تسلی دیتے ہوئے کہا خدا کی قسم میں کبھی بھی تم کو ان کے حوالہ نہ کرونگا۔

اس کے بعد کفار نے دیکھا کہ ابو طالب نہ محمد کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی محمد اپنے مشن سے باز آئے ہیں تو وہ ایک اور پیشکش لے کر ابو طالب کے پاس پہنچے اور عرض کیا ابو طالب! اگر تمہیں محمد سے پیار ہی ہے تو یہ ولید کا خوبصورت بیٹا عُمارہ ہے، اسے اپنے پاس رکھ لو اور محمد ہمیں دے دو تا کہ ہم اسکا بالکل صفایا کردیں، حضرت ابو طالب نے انہیں جھڑکتے ہوئے فرمایا اور غیرت دلائی کہ تم نے میرے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی کی بات کہی ہے۔

کفار نے ابو طالب کا یہ تیور دیکھا تو اٹھ کر چلے گئے اور متحد ہو کر آپ پر حملہ کرنے کی سوچنے لگے اور حالات دن بدن کشیدہ ہونے لگے تو ابو طالب نے سوچا کہ اب اکیلے ان کے وار کو روکنا مشکل ہے تو انہوں نے ایک قصیدہ لکھا جس کے اندر بنو مطلب اور بنو ہاشم کی غیرت کو للکارا تو وہ بھی آپ کے دوش بدوش چلنے کے لیے تیار ہو گئے، کفار نے جب یہ سرگرمیاں دیکھیں تو سب ٹھنڈے پڑ گئے اور دیگر منصوبے بنانے لگے۔

رسول اللہ کے سامنے تجاویز و مطالبات:۔ کافرین و مشرکین حضرت ابو طالب سے ناامید ہو گئے تو مشورہ کیا کہ اب محمد کو باز رکھنے کی یہی صورت ہے کہ اس کے سامنے ایسی ایسی خواہشات اور تجویز رکھ دی جائیں کہ وہ ان کے بہلاوے میں آکر خود بخود اپنے مشن سے دست بردار ہو جائے۔

چنانچہ یہی سوچ لے کر عتبہ بن ربیعہ آیا اور آپ کے سامنے سیادت، حکومت، بادشاہت اور بہترین رشتہ ازدواجیت کی تجاویز رکھیں نیز یہ کہ کوئی آسیبی اثر ہو تو اس کا بھی علاج کردیں۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو آپ ﷺ نے سورہ حٰم السجدہ کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں تو وہ اس کلام کی شیرینی سے دم بخود ہو گیا اور واپس جا کر کہا کہ محمد نہ تو جادوگر ہے نہ ہی شاعر ہے اور نہ ہی کاہن ہے بلکہ وہ تو ایک قادرالکلام شخص ہے جس کی مثال نہیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے اس لیے کہ عرب نے اس کا خاتمہ کردیا تو ہماری پریشانی ختم ہو جائیگی اور اگر عرب میں اسکی حکومت بن گئی تو یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہوگی۔

کفار عرب نے یہ سنا تو کہنے لگے کہ عتبہ بھی اپنے دین سے پھر گیا ہے اور محمد کا جادو اس پر اثر کر گیا ہے جب اس تجویز میں بھی ان کو ناکامی ہوگئی تو ایک مطالبہ کیا کہ محمد! ایک سال تم ہمارے معبود کی عبادت کرو اور ایک سال ہم تمہارے معبود کی اس طرح ہم دونوں طرف سے مستفید بھی ہو جائیں گے اور ساتھ ساتھ ہمارا تنازعہ بھی ختم ہو جائیگا، اس پر سورۂ کافرون نازل ہوئی جس میں ان کے اس مطالبے کی بھرپور تردید کی گئی سب کچھ واضح ہونے کے باوجود بھی آپ ﷺ کی حقیقت کو وہ نہ جان سکے ابھی تک ناجائز شبہات ان کے اذہان میں گردش کر رہے تھے چنانچہ آپ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے انہوں نے اپنے سے دوزیرک آدمی نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو یثرب کے علماء کے پاس بھیجا یہ دونوں پہنچے اور آپ کے بارے میں علماء یہود سے دریافت کیا تو انہوں نے انہیں تین سوالات بتائے کہ اگر وہ (محمد ﷺ) ان کا جواب دے دے تو جان لو کہ وہ نبی ہیں ورنہ نہیں۔

یہ دونوں مکہ آئے اور آپ سے ان تینوں سوالات کے جواب مانگے تو آپ ﷺ نے تین یا پندرہ دن کے بعد بذریعہ وحی جوابات عنایت فرمائے۔ مگر پھر بھی وہ بد بخت ایمان نہیں لائے۔

مظالم و مصائب کی لرزہ خیز داستانیں:۔ ان سب دلائل و براہین کے اظہر من الشمس ہونے کے باوجود وہ ہدایت قبول کرنے کے بجائے اور زیادہ گمراہی میں بڑھ گئے اور ناپاک سازشوں اور مصیبتوں کا عرصہ

دراز تر ہوگیا نوبت بایںجا رسید کہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھادیتے جیسا کہ آپ کی چچی ام جمیل بد بخت کا یہ مشغلہ ہوگیا تھا۔ گھر میں نجاستوں اور کوڑا کرکٹ کا ڈھیر لگا دیتے ، بدبودار اوجھڑی آپ کے سراقدس پرڈال دیتے جیسا کہ عقبہ بن ابی معیط آئے دن یہ ناپاک حرکتیں کیا کرتا تھا۔ بغض وحسد کی آگ اور زیادہ بھڑکتی تو آپ کا سراقدس ہی کچل دینے کے لیے پیش قدمی کر دیتے جیسا کہ ابو جہل شقی نے اس کا عزم کیا تو غیبی نصرت خداوندی آڑے آگئی جس کے سامنے وہ بے بس ہوگیا۔ اس طرح کے بے شمار مصائب آپ ﷺ کو درپیش رہتے تھے جن کا بڑی خندہ روئی اور سنجیدگی سے آپ استقبال کیا کرتے۔

صحابۂ کرام پر ظلم وستم:۔ آپ ﷺ کی طرح صحابۂ کرام بھی سخت سے سخت مصیبتوں کا جوانمردی اور صبر واستقلال سے مقابلہ کیا کرتے تھے اور اسلام کی خاطر جان دے دیتے مگر سرمو بھی انحراف کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

تاریخ میں مذکور ہے کہ صحابہ کی کثیر تعداد اسلام لانے کے وقت کفار کی غلامیت میں تھی جیسا کہ حضرت عثمان، حضرت بلال، خباب، عمار، زنیرہ، اور لطیفہ وغیرہا ہیں جب یہ ایمان لے آئے تو ان کے آقاؤں نے انہیں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینوں پر گرم گرم پتھر رکھے، کچے چمڑے میں لپیٹ کر دھوپ میں کھڑا کیا گیا، گلے میں رسیاں ڈال کر گلیوں میں گھومایا گیا، تمسخر اڑایا گیا صبح وشام انتہائی زدوکوب کی گئی غرضیکہ اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے اشد سے اشد سزائیں ان پر نافذ کی گئیں مگر قربان جائیں ان نفوس قدسیہ پر کہ ہمیشہ احدٌ احدٌ کا نعرہ لگاتے ہوئے مسکراہٹوں کے ساتھ ان مظالم کو گلے لگایا اور وقت آنے پر جان کی بھی پرواہ نہ کی۔

ہجرت حبشہ:۔ جب رحمت عالم ﷺ نے دیکھا کہ اسلام کے ماننے والوں کا جینا دوبھر ہوتا جارہا ہے اور ان کے اندر اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ وہ اپنا یا اپنے مسلمان بھائیوں کا دفاع کرسکیں تو آپ نے انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کرجانے کا حکم فرمایا کیونکہ وہاں ایک رحمدل اور عادل بادشاہ کی حکومت تھی جس کے زیر سایہ ہر ایک چین وسکون سے رہتا تھا۔ یہ حکم ملتے ہی بعثت کے پانچویں سال ماہ رجب میں بارہ مردوں اور چار خواتین نے حضرت عثمان بن عفان کی قیادت میں حبشہ کی طرف کوچ کیا، کفار قریش کو معلوم ہوا تو مکہ بندرگاہ تک پیچھا کیا مگر مہاجرین کو نہ پاسکے۔ مہاجرین حبشہ پہنچے تو نجاشی شاہ حبشہ اصحم نے انہیں رہنے سہنے اور اسلام کے موافق عبادت کرنےکی اجازت عنایت کردی۔ تین ماہ پرسکون گذر گئے، اس کے بعد انہیں یہ افواہ پہنچی کہ اہل مکہ ایمان لے آئے اور مکہ میں ماحول بھی سازگار ہوگیا ہے، یہ سن کر کچھ حضرات جیسے عثمان ابن مظعون وغیرہ مکہ تشریف لے آئے اور کچھ حضرات جیسے حضرت ابوسلمہ وغیرہ ہیں وہیں حبشہ ہی میں رہ گئے۔ مکہ آکر دیکھا کہ اب بھی وہی حال ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہے تو پھر وہ لوگ اسی طرح ظلم سہنے لگے۔

حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ:۔ رحمت عالمیان ﷺ نے دیکھا کہ توحید کے متوالوں پر ظلم میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے تو پھر دوبارہ انہیں حبشہ ہجرت کرجانے کا حکم صادر فرمایا اس مرتبہ تراسی مرد (جن میں جعفر طیار بن ابی طالب بھی تھے) اور اٹھارہ عورتوں نے ہجرت فرمائی یہ لوگ حبشہ پہنچے تو شاہ حبشہ اصحم نجاشی نے پہلے کی طرح ان کا بھی بڑا فراخ دلی سے استقبال کیا اہل مکہ نے یہ دیکھ کر اپنے میں سے دو زیرک اور ماہر سیاست'' دواشخاص عمرو بن العاص اور عمارہ بن ربیعہ بقول ابن ہشام عبداللہ بن ابی ربیعہ کو بیش بہا تحائف دے کر بادشاہ حبشہ کے پاس بھیجا یہ دونوں سفیر حبشہ پہنچے اور بادشاہ اور ان کے امراء میں وہ تحائف پیش کر کے بولے کہ ہماری قوم کے کچھ مرتد اور احمق لوگ یہاں آگئے ہیں جنہوں نے ایک نئے دین کا اختراع کرلیا ہے آپ سے ہم گذارش کرتے ہیں کہ انہیں ہمارے حوالے کردیں بادشاہ نے کہا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کچھ کلام کئے بغیر انہیں تمہارے حوالہ کردوں۔

چنانچہ بادشاہ نے مہاجرین کو بلایا اور نئے دین کی تعلیمات اور عقائد کے متعلق دریافت کیا تو حضرت جعفر طیار اٹھے اور اسلام کی تعلیمات مطہرہ اور عقائد بتائے اور اس کے بعد نجاشی کی خواہش کے مطابق سورۂ کہیعص کی تلاوت فرمائی تو نجاشی، پادریوں اور حاضرین پر رقت طاری ہوئی اور زار وقطار رونے لگے بالآخر بادشاہ نے اعتراف کرلیا کہ یہ اور عیسی علیہ السلام پر نازل کردہ کلام تو ایک ہی ہیں۔ اس

کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ دونوں سفیر یہاں سے نکل جائیں مگر یہ دونوں پھر بادشاہ کے پاس گئے اور مہاجرین سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے عرض کیا۔ بادشاہ نے یہ بھی دریافت کیا تو اس میں بھی انہیں صحیح پایا تو وہ خود سرکار دوعالم پر ایمان لے آیا۔

اس تحقیق کے بعد بادشاہ نے ان کے تمام تحائف واپس کر کے ان دونوں کو لوٹ جانے کا حکم فرمایا اور مہاجرین بڑی خوشحالی سے یہاں قیام پذیر رہے تا آنکہ سرور دوعالم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو یہ بھی حبشہ سے مدینہ ہجرت فرما گئے۔

طائف کے بعد حضور کی تبلیغی سرگرمیاں: سرکار دوعالم ﷺ طائف سے واپس ہوئے تو ماہ شوال آچکا تھا جس میں فریضہ حج ادا کرنے کے لیے دور دراز سے لوگ مکہ آرہے تھے، اتنی ساری تکلیفوں سے سامنا کرنے کے باوجود آپ ﷺ حضرت ابوبکر کے ساتھ حاجیوں کے خیموں میں تشریف لے جاتے اور انہیں دعوت توحید پیش کرتے آپ کے پیچھے پیچھے ابولہب ہوتا جو لوگوں کو آپ کے خلاف تأثر دیتا، اور ابوجہل تو آپ کے سر پر مٹی بھی ڈال دیتا مگر آپ اپنے کام میں مصروف رہتے۔

ہجرت کا حکم: جب اسلام مکہ سے نکل کر دور دراز علاقوں بالخصوص مدینہ منورہ میں لہلہانے لگا اور مؤمنین کو ایک مامون پناہ گاہ حاصل ہوگئی تو رحمت عالم نے صحابۂ کرام کو ہجرت کا حکم فرمایا صحابۂ کرام یہ حکم عالی پاکر متفرق ٹولیاں بنا کر ہجرت فرمانے لگے یہاں تک کہ مکہ میں سوائے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر اور علی مرتضیٰ کے مؤمنین سے کوئی نہیں رہا۔

سرکار دوعالم کی ہجرت: جب تمام صحابۂ کرام ہجرت کر گئے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی سرکار سے بارہا اجازت طلب کرنے لگے تو سرکار دوعالم نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا "**لاتعجل لعل اللہ یجعل لک صاحبا**" "ابوبکر! جلدی نہ کرو شاید اللہ تعالیٰ تمہارا کوئی ساتھی بنادے، یہ ارشاد پاک سن کر حضرت ابوبکر سمجھ گئے کہ صاحب سے مراد آپ ﷺ ہی ہیں تو فوراً صدیق اکبر نے ہجرت کے لیے دو اونٹنیاں خرید لیں۔

جب کفار قریش کو معلوم ہوا کہ سرور دوعالم ہجرت فرمانے والے ہیں تو انہوں نے ہجرت کی رات باہمی مشاورت کے بعد آپ ﷺ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آپ کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے سرکار دوعالم کو معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت علی کو اپنے بستر اقدس پر لٹا کر اپنی حضرمی چادر اطہر اڑھائی اور خود وہاں سے سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات تلاوت فرماتے ہوئے نہایت اطمینان سے نکل گئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی مٹھی کی مٹی ان کے سروں پر پھینکتے گئے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی سلب کرلی اور انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ سرکار دوعالم تشریف لے جاچکے ہیں۔

بہر حال رحمت عالم اپنے گھر سے حضرت ابوبکر صدیق کے گھر تشریف لائے اور پھر وہاں سے صدیق اکبر یار غار رفاقت میں اونٹنی پر سوار ہوکر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما گئے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

ماخذ و مراجع:۔ (۱) سیرۃ النبی (ﷺ) (کامل) مُرتبہ ابن ہشام، مترجم مولانا عبدالجلیل صدیقی۔
ناشر۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان۔ دہلی
(۲) سیرۃ الرسول المعروف بضیاء النبی جلد دوم۔ علامہ پیر کرم شاہ ازہری رحمہ اللہ
مطبوعہ۔ اسلامک پبلشر دہلی۔
(۳) سیّد انسانیت ﷺ۔ مصنفہ نعیم صدیقی۔ مطبوعہ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی
(۴) حضرت محمد ﷺ غارِ حرا سے غار ثور تک مصنفہ علی اصغر پوہدی۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
(۵) سیرت مصطفیٰ ﷺ مصنفہ حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی مطبوعہ۔ اسلامک پبلشر دہلی۔ ۷۔۴۴۴۔ گلی سروطے والی، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔۶
(۶) قرآن کریم، وکنزالایمان مترجم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان۔
(۷) کتب حدیث

☆ مقالہ نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے طالب علم ہیں۔

☆☆☆

اسلام ، جہاد اور دہشت گردی

مولانا حامد رضا نظامی

دنیا میں مختلف مذاہب ہیں اور ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کی حقانیت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ تمام مذاہب برحق نہیں ہوں گے۔ برحق صرف ایک ہی مذہب ہوگا۔ مذہب اسلام جس میں زندگی گزارنے کے ہر گوشے کا کافی وشافی بیان ہے۔ یہی آج تنہا دنیا کا سب سے بڑا اور مقبول مذہب ہے۔ آخر اسلام کی ہمہ گیر مقبولیت کی وجہ کیا ہے؟ چوں کہ مذہب اسلام فطرت انسان کے عین مطابق ہے اس لئے یہ انسان کو انسانیت، بھائی چارگی، اتحاد، محبت اور باہمی تعاون کا سبق سکھاتا ہے، اسے حیوانیت سے بچاتا ہے۔ جو لوگ اپنے متعصبانہ نظریے سے اسلام کو تشدد مذہب کہتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں تاریخ اسلام کا صحیح علم نہیں۔

اسلام کی اخلاقی برتری کی اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہوگی کہ جن نفوس نے اسلام کی مخالفت کی تھیں بعد کے زمانے میں وہی نفوس اسلام قبول کر کے اسلامی فوج کی کمان کرنے لگیں۔ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے اسی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

ہے عیاں شورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

دہشت گردی کا مفہوم:۔ اسلام کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں۔ دہشت گردی کا مطلب کسی بے گناہ جان پر کسی قسم کا ظلم کرنا اور اسے تکلیف دینا ہے۔ اسلام کسی صورت میں اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ مذہب اسلام ہر اس چیز کو معروف قرار دیتا ہے جس سے فتنہ وفساد رکتا ہو، امن وسلامتی اور انصاف وعدل کی ترویج ہوتی ہو اور ہر اس بے انصافی، بدامنی اور ظلم وزیادتی کو منکر ٹھہراتا ہے جس سے آدمیت کو نقصان پہنچتا ہو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یاأیها الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شهداء بالقسط ولا یجرمنکم شنئان قوم علی ألا تعدلوا اعدلوا هو أقرب للتقویٰ۔المائدۃ۔۸﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مضبوط چٹانوں کا سا دم خم اپنے اندر پیدا کر لو اور اللہ کی خاطر انصاف کے نگراں بن جاؤ کسی قوم کی دشمنی تمھیں بالکل اس بات پر نہ اکسائے کہ عدل وانصاف سے کام نہ لو، ہر حال میں عدل کرو کہ عدل تقویٰ سے قریب ہے۔

دفاع نفس کی خاطر ہتھیار کے استعمال کی کب اجازت ہے؟:۔ مسلم قوم نے پہلی صدی ہجری سے لے کر تا ہنوز امن وامان کی خاطر جو جدوجہد کی ہے اس کی مثال کہیں موجود نہیں، مسلمانوں نے تلوار صرف اس وقت اٹھائی ہے جب امن وامان کا قیام اس کے بغیر ممکن نہ رہا ہو اور ظلم کی انتہا ہو گئی ہو۔ سورۃ النساء میں یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔

﴿وما لكم لا تقاتلون في سبيل الله والمستضعفين من الرّجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها۔النساء۔۷۵﴾ یعنی کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کے راستے میں ان کمزور لوگوں کے بچاؤ کی خاطر لڑتے نہیں ہو جن میں کچھ مرد بھی ہیں، کچھ عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی ہیں جو اللہ کے حضور دست بدعا ہیں کہ ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے باشندے ظالم ہیں۔

اسلام کی انفرادیت:۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو پر امن بقائے باہم کی دعوت دی۔ چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿یاأهل الكتاب تعالوا إلی كلمة سواء بيننا وبينكم۔آل عمران۔۶۴﴾

اے اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہو۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام ہی نے مذہبی آزادی کی بنیاد ڈالی اور اعلان کیا کہ ﴿لا إكراه في الدين۔البقرۃ۔۲۵۶﴾ دین میں کوئی اجبار نہیں۔

قرآن نے اقوام عالم اور ادیان عالم میں امن وامان کی ترویج کے لئے یہاں تک اعلان کیا کہ ﴿الله ربنا وربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم لا حجة بيننا وبينكم الله يجمع بيننا وإليه المصير۔الشوریٰ۔ ۱۵﴾ اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، ہمارے کارنامے اور اعمال ہمارے ساتھ ہیں ہم ان پر خود جوابدہ ہیں اور تمہارے اعمال اور کارنامے تمہارے ساتھ ہیں اور تم ان پر جوابدہ ہو، ہمارا نہ کوئی جھگڑا تم سے ہے اور نہ تم ہم سے جھگڑو، اللہ ہمیں اور تمہیں اکٹھا کردے گا اور اخیر کار ہر ایک کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

اسلام بت پرستی کا سخت مخالف ہے مگر بت پرستوں سے نپٹنے کے لئے بھی موزوں اور درست راہیں اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے: ﴿ ولاتسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عَدْوًا بغير علم ۔الأنعام۔ ۱۰۸﴾

خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو کہیں وہ اَن جانے بوجھے غصہ میں آکر اللہ کو برا بھلا نہ کہیں۔

اسلام نے صرف ایسی تبلیغ کی اجازت دی جس سے فتنہ وفساد پیدا نہ ہو اور جس میں سختی کا رنگ نہ جھلکے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے: ﴿ فذكر إنما أنت مذكر لست عليهم بمصيطر۔ الغاشية/ ۲۱۔۲۲ ﴾ تم صرف نصیحت کرنے تک محدود رہو تمہارے ذمہ صرف نصیحت کا کام ہے، تم ان پر زبردستی پہرہ دینے اور سختی کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے۔

ایک مبنی بر حقیقت سچائی:۔ مذکورہ حقائق دیکھنے کے بعد ایک انصاف پسند آدمی ہرگز اسلام کو دہشت گردی کا مذہب نہیں کہے گا۔ جو لوگ اسلام پر دہشت گردی اور تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں وہ خود اپنے مذہب کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا مذہب تشدد پسندی سے قریب ہے۔ اسلام مخالف طاقتوں نے اسلام کے اہم فریضہ ''جہاد'' کی بنا پر اسلام کو دہشت گردی کا مذہب کہا ہے۔ اس لئے ذیل کے سطور میں جہاد کی حقیقت اور اس کے مفہوم سے متعلق بحث کی جاتی ہے۔

جہاد کا مفہوم:۔ لفظ جہاد لغت میں کسی مقصد کے لئے پوری طاقت صرف کرنے کا نام ہے (المنجد اردو ترجمہ ص:۱۷۲) ائمۂ دین نے جہاد کی اصطلاحی تعریف مختلف الفاظ میں پیش کی ہے۔ ابن کمال پاشا نے فرمایا ''انه بذل الوسع في القتال في سبيل الله مباشرة او معاونة بمال أو رأي أو تكثير سواد او غير ذلك (علاء الدين الحصكفي ، امام: درمختار عربی، ج: اول ص:۳۳۹، طبع مجتبائی) جہاد کا معنیٰ اللہ کے راستے میں جنگ میں پوری توانائی صرف کرنا ہے یا تو براہ راست جنگ میں حصہ لے کر یا مال سے امداد دے کر یا فکری اعتبار سے رہنمائی کر کے یا مجاہدین کے ساتھ شامل ہو کر ان کی تعداد میں اضافہ کر کے یا اس کے علاوہ۔ اس اعتبار سے جہاد کی مختلف قسمیں ہو جائیں گی (۱) جانی جہاد یعنی آدمی خود جہاد میں حصہ لے (۲) مالی جہاد یعنی مجاہدین کے لئے ہتھیار اور خوراک وغیرہ مہیا کرنا (۳) فکری جہاد یعنی ایک تجربہ کار اور ماہر جنگ پیچھے بیٹھ کر فوج کو ہدایت دے (۴) لسانی جہاد یعنی برائی کے راستے کو زبان کی قوت سے روکنا اور بھلائی کا حکم دینا (۵) قلمی جہاد یعنی قلم کی قوت کو برائی اور فتنہ وفساد کے خلاف استعمال کرنا (۶) تعدادی جہاد یعنی میدان جنگ میں پہنچ کر مجاہدین کی تعداد میں اضافہ کرے۔

جہاد کے متعلق قرآنی آیات اور ان کا مفہوم:۔ ﴿وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين۔ البقرة۔ ۱۹۰﴾ اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے آگے نہ بڑھو۔

﴿ وقٰتلوهم حتىٰ لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله۔ الأنفال ــ ۳۹﴾ اور کفار سے لڑو یہاں تک کہ کفر کا کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور ایک اللہ کی پرستش ہونے لگے۔

﴿ كتب عليكم القتال وهو كره لكم وعسىٰ أن تكرهوا شيئا وهو خير لكم ۔البقرة۔ ۲۱۶﴾ خدا کی راہ میں لڑنا تم پر فرض کیا گیا اور تمہیں ناگوار ہے اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

﴿إن الله اشترى من المؤمنين أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة يقاتلون في سبيل الله فيقتلون ويقتلون۔ التوبة ۔ ۱۱۱﴾ بے شک اللہ نے جنت کے بدلے میں مومنین کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا وہ اللہ کی راہ میں کافروں سے اس طرح لڑیں کہ انھیں بھی قتل کریں اور خود بھی قتل ہو جائیں۔

علامہ زمخشری (المتوفی ۵۳۸ھ) نے وقاتلوا في سبيل الله کے تحت قتال فی سبیل اللہ کو یوں بیان کیا ہے: المقاتلة في سبيل الله: هو الجهاد لإعلاء كلمة الله وإعزاز الدين (الكشاف عن حقائق التنزيل ص: ۲۳۳ مطبوعه دار الكتب العلمية، لبنان، ۱۹۹۵ء) "قتال فی سبیل اللہ اس جہاد کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے کلمہ کی سر بلندی اور دین کے اعزاز کے لئے ہو" اسی آیت کے ذیل میں قاضی بیضاوی کے یہ الفاظ ہیں: جاهدوا لإعلاء كلمته وإعزاز دينه (تفسير بيضاوی: ۱۰۸/۱، مطبوعه دار الكتب العلمية، لبنان، ۱۹۸۸ء)

"جہاد کرو اللہ کے کلمہ کی سر بلندی اور اس کے دین کی عزت ووقار کے لئے"

امام رازی جہاد کے خالصۃً لوجہ اللہ کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: و قاتلوا في سبيل الله: أي في طاعته وطلب رضوانه (رازی، إمام، التفسير الكبير: ج اجزء: ۵، ص ۱۰۹ مطبوعه دار الكتب العلمية، لبنان، ۱۹۹۰ء)

"جنگ کرو اللہ کے راستے میں یعنی اس کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کی خوشنودی کی طلب میں"

جہاد کے متعلق حدیث شریف اور اس کا مفہوم:۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری روایت فرماتے ہیں: عن أبي موسىٰ رضي الله عنه قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال: الرجل يقاتل للمغنم، والرجل يقاتل للذكر، والرجل يقاتل ليُرىٰ مكانه فمن في سبيل الله؟ قال: من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله " ایک اعرابی حضور ﷺ کی بارگاہ میں آیا اور سوال کیا: اے اللہ کے رسول قتال فی سبیل اللہ کیا ہے؟ اس لیے کہ ایک شخص مال غنیمت کی خاطر جنگ کرتا ہے، ایک شخص ریا کاری کے جذبہ سے لڑتا ہے، اس طرح ایک شخص قومی یا قبائلی حمیت کی خاطر لڑتا ہے ان میں سے کس شخص کی جنگ کو فی سبیل اللہ کہا جائے گا؟ آپ ﷺ نے مقصد جہاد کو چند کلمات میں بیان فرمایا: جس کسی نے صرف اس لیے جنگ کی کہ اس سے اللہ کا کلمہ بلند ہو تو اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہوئی" (بخاری: ج أول ص: ۳۹۴ كتاب الجهاد، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا، مطبع أصح المطابع)

امام نووی اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

و إن الفضل الذي ورد في المجاهدين في سبيل الله يختص بمن قاتل لتكون كلمة الله هي العليا "مجاہدین فی سبیل اللہ کی فضیلت جو حدیث میں آئی ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو صرف اللہ کے کلمہ کی سر بلندی کے لیے جنگ کریں" (شرح مسلم، ج ۷، جز ۳، ص: ۴۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء)

جہاد کے شرائط:۔ (۱) جہاد اسی حالت میں فرض ہے جب مقابلہ کی استطاعت ہو "هذا إذا غلب على ظنه أنه يكافئهم وإلا فلا يباح قتالهم (رد المحتار، ابن عابدين شامی جلد ۶ كتاب الجهاد ص: ۱۹۹ دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، طبع ثانی ۲۰۰۳ء)

(۲) جہاد انہیں افراد پر فرض ہے جنہیں اس کی طاقت ہو ورنہ جو لوگ لڑنے سے معذور ہوں یا معذور کے حکم میں ہوں وہ جہاد سے مستثنیٰ ہیں مثلاً بچے، عورتیں، اپاہج، اندھا، مریض وغیرہ (۳) جہاد اسی وقت فرض ہے جب ہر فرد پر دشمن شہر پر حملہ آور ہو ورنہ جنگ ناگریز ہونے کی تقدیر پر متعلقہ خطے کے تمام مسلمان پر جو مکلّف ہوں بطور کفایہ جہاد فرض ہے (۴) اگر دشمن صلح کی پیشکش کرے تو اسے ہر حال میں قبول کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وإن جنحوا للسّلم فاجنح لها وتوكّل على الله إنه هو السميع العليم، وإن يريدوا أن يّخدعوك فإن حسبك الله ـ الأنفال ۶۲-۶۱ ﴾ اگر دشمن صلح کا ہاتھ پھیلائیں تو تم بھی اپنا ہاتھ آگے کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے اگر وہ لوگ تم کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمہیں کافی ہے۔ جہاد کے مذکورہ شرائط، قرآن کی آیات اور حدیث کی نصوص سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اسلام امن وامان کا داعی ہے دہشت گردی کا نہیں۔

جہاد اسلامی اور عام جنگ میں باہمی فرق:۔ جہاد اور عالم جنگوں میں یہ فرق ہے کہ عام جنگیں قوموں کو غلام بنانے اور مال غنیمت لوٹنے

کے لیے کی جاتی ہیں مگر جہاد سے دنیا کی دولت اور ملک گیری مقصود نہیں ہوتی ہے بلکہ اللہ کی زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے، بے قصوروں کی مدد کرنے اور ظلم و بے انصافی کو ختم کرنے کی خاطر اس فریضہ کو انجام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ نیک کاموں میں ایک اہم کام بن جاتا ہے جس کی خاطر انسان اپنی جان و مال کی قربانی پیش کر دیتا ہے۔ بیسویں صدی کی دو عالمی جنگ سے لے کر افغانستان و عراق کی حالیہ جنگوں تک کروڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ اس تناظر میں جب ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیش آمدہ جنگوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت انگیز مسرّت ہوتی ہے۔ اتنے کم اتلاف جان کے ساتھ ایک ہمہ گیر تہذیب زمین پر نمودار ہوگئی اور ایک صدی کے اندر آدھی دنیا پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ اس وقت نہ کوئی استعمار تھا اور نہ کوئی استحصال تھا۔

اسلام بدامنی اور قانون شکنی کا روادار نہیں بلکہ وہ امن وامان کا ضامن ہے۔ فتح مکہ کا عظیم الشان تاریخی کارنامہ بغیر کسی خونریزی کے پیش آیا اور آج جب کوئی قوم غالب آتی ہے تو وہ اپنے حریف پر ظلم وستم کا پہاڑ ڈھا دیتی ہے۔ حضور ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں کفار کے ظلم وستم کے سائے تلے تیرہ سال تک رہے، کفر کے ترکش میں جور وجفا کے جتنے تیر تھے آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب پر چلائے گئے۔ باطل کے اسلحہ خانہ میں جس قسم کا اسلحہ تھا سب ہی آزمایا گیا۔ مگر رب کا حکم تھا کہ صبر وضبط سے کام لیں اور کسی طرح کی جوابی کارروائی نہ کریں۔ اعلان نبوت کے تیرہویں سال ہجرت کی اجازت ملی۔ آپ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے ڈھائی تین سو میل دور ''یثرب'' نامی ایک بستی میں جمع ہوگئے لیکن کفار مکہ کی آتش غضب اب بھی سرد نہ ہوئی اور طرح طرح سے مسلمانوں کو ایذا دینے لگے۔ کبھی مویشی لے جاتے۔ کبھی اکا دکا مسلمان کو قتل بھی کردیتے۔ چودہ سال بعد مظلوموں کو ان کے رب نے اجازت دی کہ ﴿وقتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين -البقرة-۱۹۰﴾ تم اپنی مدافعت کے لیے جو تم سے لڑیں ان سے لڑو (اگرچہ تلوار اٹھانا پڑے) تب مسلمانوں نے تلوار اٹھائی تھی مگر مسلمانوں کو پابند کیا گیا کہ قتال میں حد سے تجاوز نہ کریں۔

اسلامی جہاد سے متعلق اصول وضوابط: حضور ﷺ جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تھے تو درج ذیل باتوں کی ضرورت وصیت فرماتے: قال رسول الله ﷺ أوصيكم بتقوى الله وبمن معكم من المسلمين خيرا أغزوا بإسم الله في سبيل الله من كفر بالله لا تغدروا ولا تغلّوا ولا تقتلوا وليدا، ولا امرأة، ولا كبيرا فانيا، ولا منعزلا بصومعة ولا تقربوا نخلا ولا تقطعوا شجرا ولا تهدموا بناءً ا. (السيرة النبوية: ج۲، ص: ۲۳۶) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کا تاکیدی حکم دیتا ہوں اور جو مسلمان تمہارے ساتھ ہیں ان کے ساتھ بھلائی کی تاکید کرتا ہوں، اللہ کے نام سے اس کی راہ میں منکروں سے جہاد کرو، کسی کے ساتھ دھوکہ اور فریب نہ کرو، بددیانتی نہ کرو، کسی بچے اور عورت کو قتل نہ کرو، کسی بوڑھے اور اپنی خانقاہ میں گوشہ نشیں رہنے والے کو قتل نہ کرو، کسی کھجور کے درخت کو نہ کاٹو اور نہ ہی کسی مکان کو ڈھاؤ''

اسلام کو امن وشانتی اس قدر محبوب ہے کہ حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ اس خدشہ کے باوجود کہ دشمنی کا مقصود فریب دہی ہو تو بھی اپنی طرف بڑھے ہوئے صلح کے ہاتھ جھٹکو نہیں۔ مؤرخ ابن ہشام اور مؤرخ ابن سعد وغیرہ نے بالاتفاق یہ بات کہی ہے کہ حضور ﷺ ۷ رہجری میں جب حج بیت اللہ کے لیے نکلے تو آپ کے ہم رکاب سترہ سو ایسے نفوس قدسیہ تھے جو آپ کے اشارہ پر ساری کائنات سے جنگ کر لیتے اس کے باوجود آپ ﷺ نے اللہ کے حکم پر صلح فرمالی۔

جہاد عصر حاضر کے تناظر میں:۔ جہاد کی حقیقت، اس کے شرائط اور اصول وضوابط بیان کرنے کے بعد اب ہم اپنی گفتگو کا رخ عصر حاضر کے چند ان جہادی تحریکوں کی طرف کر رہے ہیں جو فلسطین، کشمیر، افغانستان اور عراق وغیرہ میں کفار کے خلاف سرگرم ہیں۔

ارض مقدس فلسطین میں بے قصور و معصوم اہل حق پر اسرائیلی حملوں کا سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ فلسطین میں قبلۂ اول کی بقا اور جان وعزت کی حفاظت کے لیے اپنا دفاع کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں فلسطینیوں کا خودکش حملہ کرنا اور اسرائیل سے جہاد کرنا بالکل درست ہے۔ اسے دہشت گردی نہ کہی جائے گی۔ ہدایہ ج ۲ ص ۵۵۹ پر ہے: الجهاد فرض على

الكفاية إذا قام به فريق من الناس سقط عن الباقين فإن العدو على بلد وجب على جميع الناس، الدفع. ''یعنی جہاد فرض کفایہ ہے جب کہ کچھ لوگ جہاد کریں تو باقی سے وہ فرض ساقط ہو جائے گا۔لیکن اگر دشمن شہر پر حملہ کردے تو تمام لوگوں پر اس کا دفع واجب ہے'' چوں کہ فلسطین میں مسلمان دشمن کے نرغے میں رہتے ہیں نہ ان کی جان محفوظ ہے اور نہ ان کی عبادت گاہ تو ایسی صورت میں جہاد صحیح ہے۔

اسلام کا یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ بے قصور اور بے گناہ جانوں کو کسی صورت میں ہلاک کرنا جائز نہیں ہے اور ایسی جگہ جہاں انسان کی جان ،اس کی عزت اور عبادت گاہ محفوظ ہوں ایسی صورت میں خود کش حملہ درست نہیں اور اگر حالت اس کے برخلاف ہو تو درست ہے۔کشمیر میں یا دنیا کے کسی گوشہ میں جتنے خود کش حملے اور بم اسپورٹ ہوتے ہیں ان میں دشمن کی اگر ۵ رجانیں ضائع ہوتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ بے قصور عوام کی جان ضائع ہوتی ہیں اور ان تمام حملوں میں کسی ایسے مسلمان کا ہاتھ نہیں رہتا ہے جو اسلام کے احکام کو صحیح طور پر جانتے ہو۔خبر رساں ایجنسیاں اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھ میں ہیں۔اس لئے وہ ایک منظم طور پر ہر حملے کے پیچھے کسی نے کسی مسلمان کا ہاتھ ثابت کرتے ہیں جب کہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اس حملے میں مسلمانوں کا نام ونشان تک نہیں ہے مگر اسلام کو بدنام اور اسے دہشت گردی کا مذہب قرار دینے کے لئے اسلام مخالف طاقتیں اپنی قوت کا استعمال کرتی ہیں اور چند ایسی خیالی تنظیم اور ایسے ہوائی افراد کی طرف حملے کو منسوب کرتی ہیں کہ جس کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔اسامہ ،ملا عمر اور ایمن الظواہری کے نام پر آج مسلمانوں کو دہشت گرد کہا جا رہا ہے حالاں کہ یہ سب ایسے آدمی ہیں کہ شاید ان کا وجود بھی نہ ہو۔اسامہ ،ملا عمر اور ایمن الظواہری جو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں اگر اسلام کے احکام سے واقف ہوتے تو فوراً دنیا کے سامنے ظاہر ہو جاتے اس لئے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ اپنی جان کی خاطر دوسری ہزاروں جانوں کو ہلاک کیا جائے۔امریکہ واسرائیل کے پاس بھی اتنی قوت ہے کہ وہ ہزاروں اسامہ کو دنیا کے کسی بھی غار سے نکال کر ظاہر کردیں مگر ان کا اچھا خاصا کام جب اسامہ کو پوشیدہ ہی رکھنے میں ہے تو پھر اسے دنیا کے سامنے لایا کیوں جائے؟

جو حضرات اخبارات کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں ان پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اسامہ اور ایمن الظواہری کا وقتاً فوقتاً جو ٹیپ نشر ہوتا ہے جسے ہر اخبار پہلے صفحہ پر جگہ دیتا ہے وہ سراسر جھوٹ ہوتا ہے۔مہینہ، پندرہ دنوں پر اسامہ اور ایمن الظواہری کی ایک ہی تصویر بدل بدل کر شائع ہوتی ہے اور اس تعلق کی تمام خبریں تقریباً ایک ہی ہوتی ہیں۔ہر خبر میں یہی رہتا ہے کہ القاعدہ اگلے مہینہ حملہ کرے گا ،عیسائی کے خلاف جہاد جاری رکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔مغربی میڈیا ان خبروں کو شائع کر کے مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنا چاہتا ہے۔ہم ایسی تمام خبروں کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔اسلام کے مطابق کسی بے گناہ جان کو مار نا جائز نہیں۔اسلام ایک امن پسند مذہب ہے دہشت گرد نہیں۔

☆☆☆

☆ مقالہ نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے طالب علم ہیں

مری آہِ نارسا پر رہی طعنہ زن یہ دنیا
مرے دردِ دل کا عالم نہ سمجھ سکا زمانہ
غمِ عاشقی میں ارشدؔ یہی زندگی کا حاصل
کبھی آہِ صبح گاہی کبھی گریۂ شبانہ

(علامہ ارشد القادری)

اسلام اور حقوق انسانی

مولانا زین العابدین نظامی☆

انسان طبعاً معاشرت پسند ہے وہ اپنی پیدائش سے لیکر تادم حیات بے شمار افراد کی خدمات، توجہ، امداد اور سہاروں کا محتاج ہوتا ہے اپنی عملی زندگی بسر کرنے کیلئے وہ اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ یہ اجتماعی زندگی اس کے گرد تعلقات کا ایک وسیع تان بان تیار کرتی ہے، خاندان برادری، محلے، شہر، ملک اور بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی تک پھیلے ہوئے تعلقات کے یہ چھوٹے بڑے بہت وسیع دائرے ہیں ان تعلقات کو صحیح اور مستحکم بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ قوانین وضوابط عطا فرمایا ہے تاکہ کوئی کسی کو بے جا ضرر نہ دے سکے ہر ایک کے جان ومال اور اولاد محفوظ رہ سکیں۔ انسان پر ماں، باپ، بیٹے، شاگرد، استاذ ملازم، مالک تاجر، خریدار، شہری اور حکمراں ہونے اور بے شمار مختلف حیثیتوں سے جن قوانین وضوابط پر عمل پیرا ہونا ضروری اور لازمی ہے انھیں حقوق انسانی کا نام دیا جاتا ہے ان حقوق میں بعض کی حیثیت صرف اخلاقی ہوتی ہے، مثلاً بڑوں کا حق ادب، چھوٹوں کا حق شفقت، ضرورت مندوں کا حق امداد اور مہمانوں کا حق تواضع وغیرہ اور بعض کو قانونی تحفظ حاصل ہے مثلاً حق ملکیت، حق اجرت، حق مہر اور حق معاوضہ وغیرہ معاشرت کے آداب اور حقوق کی تعلیم بھی اسلام کی خاص اور اہم تعلیمات میں سے ہے اور ایک مسلمان سچا اور پکا مسلمان تبھی ہوسکتا ہے جب وہ اسلام کے معاشرتی احکام پر بھی پوری طرح عمل کرے معاشرتی احکام سے مراد باہمی برتاؤ کے وہ طور طریقے ہیں جو اسلام نے سکھائے ہیں، مثلاً یہ کہ اولاد کا رویہ ماں باپ کے ساتھ کیسا ہو، اور ماں باپ کا برتاؤ اولاد کے ساتھ کیسا ہو۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ کس طرح پیش آئے بہنوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے میاں بیوی کس طرح باہم زندگی گزاریں چھوٹے اپنے بڑوں کے سامنے کس طرح رہیں اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کریں۔ پڑوسیوں کے ساتھ ہمارا رویہ کس طرح کا ہونا چاہئے امیر لوگ غریبوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کریں اور غریب امیروں کے ساتھ کیسا تعلق رکھیں آقا کا تعلق ملازم کے ساتھ اور ملازم کا آقا کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے۔

الغرض اس دنیوی زندگی میں مختلف طبقوں کے جن چھوٹے بڑے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے ان کے ساتھ برتاؤ اور رہن سہن کے بارے میں اسلام نے ہمکو جو نہایت مکمل اور روشن ھدایتیں دی ہیں وہ معاشرے کے آداب واحکام ہیں آیئے ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

عام انسانوں کے حقوق: ۔قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسلمان وہی ہے جو ہر معاملے میں دوسروں کے حقوق کا خیال رکھے اور کاروبار میں امین اور دیانتدار ہو دھوکہ دھڑی چوری، سود خوری اور رشوت خوری وغیرہ کر کے دوسروں کے حقوق کی پامالی نہ کرے اور جن لوگوں کے اندر یہ برائیاں پائی جائیں گی وہ کامل مسلمان نہیں ہیں قرآن کریم نے ناجائز کمائی کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "ولا تأکلو اموالکم بینکم بالباطل" اے ایمان والو! تم کسی غلط اور ناجائز طریقوں سے دوسروں کے مال نہ کھاؤ (سورۃ بقرۃ آیت ۱۰۰) اس آیت کریمہ نے تجارت کے ان تمام ذرائع کو حرام قرار دیا جو باطل اور غلط ہوں جیسے جوا، سٹابازی، سود، رشوت اور چوری وغیرہ ایک دوسری آیت میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے "ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اووزنوھم یخسرون الا یظن أولئک أنھم مبعوثون لیوم عظیم یوم یقوم الناس لرب العالمین (سورہ مطففین آیت ۱/۴) ترجمہ: ان کم دینے والوں کیلئے بڑی تباہی ہے جو دوسرے لوگوں سے جب ناپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے اور جب خود ہی دوسروں کے لئے

پاتے ہیں تو کم دیتے ہیں کیا انکو یہ خیال نہیں ہے کہ وہ بہت بڑے دن اٹھا ئے جائیں گے جس دن کہ سارے لوگ جزاء وسزا کے لئے رب العالمین کے حضور میں حاضر ہوں گے۔

ماں باپ کے حقوق:۔ اس دنیا میں انسان کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا تعلق ماں باپ سے ہے، اسلام نے ماں باپ کا بہت بڑا حق بتایا ہے، کیونکہ انھوں نے ہماری رہنمائی اس وقت بہت ہی بہتر طریقے سے کی ہے، جب ہمیں کسی بھی چیز کا شعور نہ تھا انھوں نے ہمیں بننے بولنے، پہننے اوڑھنے، کھانے پینے اور پڑھنے لکھنے کے طریقے بتائے اور حتی الامکان اچھا سے اچھا سلیقہ سکھایا، اور بہترین تربیت فرمائی ہمارے لئے تمام مصیبتوں کو برداشت کیا طرح طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا یہاں تک کہ سخت ٹھنڈی کے موسم میں بچے نے بستر پر پیشاب کر دیا اور پورا بستر سخت ٹھنڈی رات میں گیلا ہو گیا مگر ماں نے بچے کو نہ پیٹا نہ ہی مارا بلکہ کسی طرح دوسرے بستر کا انتظام کر کے بچے کو اس پر لٹایا اور خود دوسرا بستر نہ ہونے کی وجہ سے یا تو گیلے بستر پر لیٹ کر یا برف کی طرح ٹھنڈی زمین پر لیٹ کر پوری رات صبح کی کرنوں کے پھوٹنے کا انتظار کرتی رہی باپ نے دن بھر خون پسینہ ایک کیا اور شام کو بچوں کے کھانے کا سامان لے کر گھر پہنچا تا کہ ہماری بچے خوش رہیں الغرض ہزاروں مصیبتوں اور پریشانیوں کو برداشت کرنے کے بعد ماں باپ نے اپنے پیارے کو پال پوس کر نوجوان کر دیا اور جب لڑکا بڑا ہو گیا تو ایسا نہیں کہ جس ذات نے اس پر احسانات کے دریا بہا دیے ہیں اور اپنے مستقبل کا سہارا سمجھ کر اس سے کچھ امیدیں وابستہ کر لی ہیں ان تمام امیدوں پر نوجوان بڑی بے دردی کے ساتھ پانی پھر دے اور خود مختار ہو کر جو چاہے کرے اور ماں باپ کا اس پر کوئی حق نہ رہا بلکہ اسلام نے اولاد پر کچھ حقوق مقرر کئے ہیں کہ ان کا کہنا مانے ان کی باتوں پر عمل کرے اور انکو اُف تک نہ کہے یہاں تک کہ اگر ماں باپ کی عزت کرنے اور ان کے حقوق پر عمل پیرا ہونے کی سخت تاکید کی گئی ہے مثلاً اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا "**وقضی ربک الاتعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا**" ترجمہ: ترے رب نے حتمی حکم دیا ہے کہ اسکے سوا تم کسی کی عبادت اور بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو (سورہ بنی اسرائیل)

اولاد کے حقوق:۔ اسلام نے جس طرح اولاد پر ماں باپ کے حقوق مقرر کئے ہیں اس طرح ماں باپ پر بھی اولاد کے کچھ حقوق رکھے ہیں جہاں تک انکو کھلانے پلانے اور پہنانے کا تعلق ہے اس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں، کیوں کہ اولاد کے اس حق کا احساس ہمیں فطری اور طبعی طور بھی ہے ماں اولاد کے جس حق کی ادائیگی میں عموماً کوتاہی کرتی ہے وہ انکی دینی اور اخلاقی تربیت ہے پروردگار عالم نے والدین پر فرض کیا ہے کہ اپنی اولاد اور اہل وعیال کی تربیت اور نگرانی اس طرح کریں کہ مرنے کے بعد وہ جہنم میں نہ جائیں قرآن عظیم میں ہے "**یاا یھاالذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا**" (تحریم) ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، بعض لوگوں کو اپنی اولاد میں سے لڑکوں سے زیادہ اور محبت ہوتی ہے اور بیچاری لڑکیوں کو وہ بوجھ سمجھتے ہیں اور اس واسطے ان کی خبر گیری اور تربیت میں کوتاہی کرتے ہیں اس لئے اسلام میں لڑکیوں کی تربیت کے سلسلے میں خصوصیت سے تاکید کی گئی ہے اور اس کی بڑی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں ہے:۔ "جس شخص کی بیٹیاں ہوں اور وہ ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرے اور ان کو اچھی تربیت دے اور (مناسب جگہ) ان کی شادی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت دے گا" اس کے علاوہ بہت سی احادیث میں ماں باپ کو اولاد کی صحیح تربیت کا حکم دیا گیا ہے۔

عن جابر بن سمرہ قال قال رسول اللہ ﷺ لأن یودب الرجل ولدہ خیر لہ من أن یتصدق بصاع"

حضرت جابر بن سمرۃ نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنی اولاد کو ادب سکھائے تو اس کے لیے ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

انتباہ:۔ بچہ کا اچھا سا نام رکھے برا نام نہ رکھے کہ برے نام کا برا اثر ہوگا اور ترتیب قبول نہ کرے گا، ماں یا کسی نیک نمازی عورت سے دو سال تک دودھ پلوائے پاک کمائی سے ان کی پرورش کرے کیونکہ ناپاک مال ناپاک عادتیں پید کرتا ہے۔ بہلانے کے لیے ان سے جھوٹا وعدہ نہ کرے۔ جب کہ ہوشیار ہوں تو کھانے پینے، اٹھنے، بیٹھنے چلنے

پھرنے کا طریقہ سکھائے حضور ﷺ کی تعظیم و محبت ان کے دل میں ڈالے کہ یہی اصل ایمان ہے جب بچہ سات برس کا ہوجائے تو نماز کی تاکید کرے اور جب دس برس ہوجائے۔ تو نماز کی تاکید کرے اور اس کے ساتھ ساتھ سختی بھی کرے یہاں تک اگر نہ پڑھے تو مار کر پڑھائے، وضو غسل اور نماز وغیرہ کے مسائل بتائے۔ لکھنے، پڑھنے کی تعلیم دیے۔ جب جوان ہوجائے تو نیک شریف النفس لڑکی سے شادی کرائے اور وراثت سے اسے ہرگز محروم نہ کرے۔

اور لڑکیوں کو سینا پرونا، کاتنا اور کھانا پکانا سکھائے، سورۂ نور کی تعلیم دے بیٹوں سے زیادہ ان کی دلجوئی کرے۔ نو برس کی عمر سے ان کی خاص نگہداشت شروع کرے۔ شادی بارات میں جہاں ناچ گانا ہو وہاں ہرگز نہ جانے دے۔ ریڈیو سے بھی گانا بجانا ہرگز نہ سننے دے جب بالغ ہوجائے تو نیک شریف النفس لڑکے کے ساتھ شادی کرے، فاسق وفاجر خصوصاً بدمذہب کے ساتھ ہرگز نکاح نہ کرے۔

عام قرابت داروں کے حقوق:۔ ماں باپ اولاد میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ انسان کا ایک خاص تعلق اپنے قرابت داروں سے بھی ہوتا ہے۔ اسلام نے اس تعلق اور رشتے کا بھی بہت لحاظ رکھا ہے۔ اور اس کے تعلق سے بھی کچھ باہمی حقوق مقرر کیے ہیں، چنانچہ قرآن عظیم نے ''ذوی القربیٰ'' کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید فرمائی ہے۔ اور اسلام میں اس شخص کو بہت بڑا مجرم قرار دیا گیا ہے جو رشتے داری اور قرابت داری کو مجروح کرے، ایک حدیث میں سرکار نے فرمایا'' قرابت کے حقوق کو پامال کرنے والا اور اپنے برتاؤ میں رشتے ناتوں کا لحاظ نہ رکھنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

پھر اس سلسلے میں رسول ﷺ کی ایک خاص تاکید یہ بھی ہے کہ اگر بالفرض تمہارا کوئی قرابت دار حق قرابت داری ادا نہ کرے، تو اس کی قرابت داری کا حق تم اس صورت میں بھی ادا کرتے رہو، چنانچہ سرکار ﷺ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا'' تمہارا جو عزیز قریب تم سے بے تعلقی اور بے مروتی برتے اور حق قرابت داری ادا نہ کرے تو تم اس سے بے تعلقی مت برتو بلکہ اپنی طرف سے تم اس کی قرابت داری کا حق ادا کرتے رہو۔

بڑوں اور چھوٹوں کے حقوق:۔ اسلام نے معاشرت کے سلسلے میں ایک عمومی اور اصولی تعلیم بھی دی ہے کہ ہر چھوٹا اپنے بڑے کی تعظیم و تکریم کرے۔ ان کے سامنے ادب سے رہے، اور بڑے کو چاہئے کہ اپنے چھوٹوں سے پیار و محبت اور شفقت کا برتاؤ کرے (اگر چہ ان میں باہمی کوئی رشتہ نہ ہو) اسلام کی نظر میں یہ چیز اتنی اہم ہے کہ حضور ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا'' جو بڑا اپنے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور چھوٹا اپنے بڑے کا ادب و لحاظ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ایک حدیث میں سرکار ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو جوان کسی بوڑھے بزرگ کی بڑی عمر کی وجہ سے عزت کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے واسطے بھی ایسے لوگ مقرر کردے گا۔ جو اس کے بڑھاپے کے وقت اس کی عزت کریں گے۔

پڑوسیوں کے حقوق:۔ انسان کا اپنے رشتے داروں کے علاوہ ایک مستقل رشتہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسلام نے اس تعلق کو بھی بڑی اہمیت دی ہے۔ اور اس کے لیے مستقل اور مفصل ہدایتیں دی ہیں۔ قرآن عظیم میں جہاں ماں باپ میاں بیوی اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے وہیں پڑوسیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور ان کی عزت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے'' الجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب'' اس آیت کریمہ میں تین طرح کے پڑوسیوں کا ذکر ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ''والجار ذی القربیٰ'' سے مراد وہ پڑوسی ہیں۔ جن سے پڑوس کے علاوہ خاص قرابت بھی ہو۔ اور'' والجار الجنب'' سے مراد وہ پڑوسی ہیں۔ جن کے ساتھ کوئی اور تعلق رشتہ داری وغیرہ نہ ہو۔ صرف پڑوس کا تعلق ہو، جس میں غیر مسلم پڑوسی بھی داخل ہیں اور'' والصاحب بالجنب'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا کہیں اتفاقیہ ساتھ ہوگیا ہو۔ جیسے سفر کے ساتھی، مدرسے کے ساتھی، یا ساتھ کام کرنے والے ساتھی، اس میں بھی مسلم غیر مسلم کی تخصیص نہیں ہے اور ان تینوں قسم کے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا مذہب اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے۔

کمزوروں اور حاجت مندوں کے حقوق:۔ یہاں تک جن طبقوں کے حقوق کا بیان ہوا، یہ سب وہ تھے جن کے ساتھ انسان کا کوئی

خاص تعلق یا لگاؤ ہوتا ہے۔لیکن اسلام نے ان کے علاوہ تمام کمزور طبقوں اور ہر طرح کے حاجت مندوں کا بھی حق مقرر کیا ہے۔ اور جو لوگ قدرت وحیثیت رکھتے ہیں، ان پر لازم ہے کہ وہ ان کی خبر گیری اور خدمت کریں اور اپنی دولت میں ان کا بھی حق اور حصہ سمجھیں، یتیموں، مسکینوں، مفلسوں، مسافروں اور دوسرے حاجت مندوں کی خدمت کی جائے، بھوکوں کے لیے کھانے اور ننگوں کے لیے کپڑے کا انتظام کیا جائے مریضوں کے لیے دواؤں کا اہتمام کیا جائے۔

سرکار ﷺ نے ایک حدیث میں اپنی دو انگلیاں برابر کر کے فرمایا، کسی یتیم بچے کی کفالت کرنے والا شخص جنت میں مجھ سے اتنا قریب ہوگا جس طرح یہ دونوں انگلیاں ملی ہوئی ہیں۔

عورتوں کے حقوق:۔ زمانہ جاہلیت میں نہ صرف عرب ممالک بلکہ دنیا بھر میں عورت کی حیثیت ایک معمولی جانور سے زیادہ نہ تھی۔ کائنات عالم میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا، کہیں تہذیب وتمدن کا نام ونشان تک نہ تھا جو زور آور تھے وہ لاچاروں پر حکمرانی کرتے، اور انکو اپنا نوکر اور غلام بنائے رکھتے خاص کر لڑکیوں کو منحوس سمجھ کر پیدا ہوتے ہی زندہ در گور کر دیا جاتا تھا، کسی کام پر نکلتے وقت اگر عورت سامنے پڑجاتی تو وہ کام ترک کر دیا جاتا تھا۔ بیوہ ہوجانے کی صورت میں اسے نہ صرف نکاح ثانی کرنے کا حق نہیں تھا۔ بلکہ اسے کسی تقریب میں شرکت سے بھی محروم کر دیا جاتا تھا۔ سوتیلی ماں کو ترکہ کے ساتھ ساتھ ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ غیر اسلامی ممالک میں شوہر کے مرنے کے بعد جبراً اس کی بیوہ کو بھی آگ کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب عرب بت پرستی اور جاہلیت کے جنون میں مبتلا تھے۔ بچیوں کی پیدائش کو برا فال سمجھا جاتا تھا، الغرض ہر طرح سے عورت کو جینے کا حق نہ تھا، اور خوش حال زندگی گزارنے کا انہیں حق حاصل نہ تھا۔ ناگاہ فاران کی چوٹی سے نور حق کی کرن پھوٹی اور سارے عرب میں نکھر کر ضیاء پاشی کرنے لگی، اس ضیاء پاشی سے سرزمین عرب کا گوشہ ہی نہیں بلکہ ساری کائنات روشنی حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہوگئی۔ اور بتدریج اصل عرب لڑکیوں کو برا شگون نہ سمجھ کر باعث برکت خیال کرنے لگے، اسلام نے سب سے پہلے عورت کو انسانیت کا مقام بخشا، بیویوں کے حقوق مقرر کیے، ان سے نیک سلوک کرنے کی تلقین کی گئی، لڑکیوں کو رحمت قرار دیا گیا، ان کو وراثت کا حقدار بنایا گیا، علم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی، لوگوں کو لاتعداد عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا، ایک ہی عورت پر اکتفاء کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی، صرف مخصوص حالات میں مخصوص شرطوں کے ساتھ چار تک کی اجازت دی گئی۔

آغاز اسلام سے پیش تر سو سو شادیاں کرنے کی کھلی اجازت تھی انہیں باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرد اگر بیک وقت ایک سو بیویاں رکھے، تو ان میں سے کسے خوش رکھ سکتا ہے اس وجہ سے سرکار اقدس ﷺ نے سو بیویوں سے عقد کرنے پر پابندی عائد کر دی۔

اگر تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں اسلام نے یہ اجازت دی ہے کہ مرد عورت کو طلاق بھی دے سکتا ہے وہیں پیغمبر اسلام نے یہ بھی ذہن نشین کر دیا ہے کہ خالق کائنات کے نزدیک سب سے بدترین حلال چیز طلاق ہے، مردوں کے ساتھ ہی ساتھ عورتوں کو بھی حق ملا کہ اگر وہ بھی چاہیں تو شوہر کے جور وجفا سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خلع والے مسئلے پر عمل کر سکتی ہیں۔

عورتوں کے حقوق کو واضح کرتے ہوئے محسن انسانیت نے ایک وعظ میں ارشاد فرمایا کہ عورتوں کا بھی اسلامی قانون کے مطابق ویسا ہی حق ہے جیسا کہ مردوں کا عورتوں پر، کیوں کہ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور دونوں خدا کی مخلوق ہیں اس کے بندے ہیں اور دونوں مادۂ افہام وتفہیم اور ادراکات واحساسات رکھتے ہیں، اور دونوں کے اندر ایسے دل ہیں جو اچھے اور برے طرز عمل سے خوش اور ناخوش ہوتے ہیں، پھر تو یہ کہاں کا عدل وانصاف ہے کہ ان میں سے ایک ہستی کو احترام کے قابل سمجھا جائے اور دوسرے کو احترام وعزت سے محروم کر دیا جائے، اگر مرد اپنی بیوی سے راحت وخدمت گزاری کا مطالبہ کرتا ہے تو بیوی کو آرام پہونچانا اسے خوش رکھنا شوہر کا اولین فریضہ ہے۔

مریضوں کے حقوق:۔ پروردگار عالم نے جہاں ہر طرح کے حقوق سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے وہیں ہمیں بیماروں اور مریضوں کے حقوق سے بھی آگاہ فرمایا ہے کیوں کہ یہ انسانیت کے خلاف ہوگا کہ کوئی

ہمارا بھائی جب تک صحیح، سالم اور صحت مند رہے، اس وقت ہم اس کے ساتھ زندگی کے اوقات گزاریں اور اس سے اپنی ضرورت پوری کریں مگر وہ جب بیمار ہو جائے تو ہم اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیں، بلکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ اس کی عیادت کی جائے، اور حال وخیریت معلوم کی جائے اور علاج کے مفید مشورہ دینا اس سے جلد شفایاب ہو جانے کی امید ظاہر کرنا اور طرح طرح کی ایسی باتیں کرنا جس سے اس کا دل بہلا رہے، انسانیت کے عین مطابق ہے اور جو ان چیزوں سے دور رہے اور صرف صحت کے اوقات میں اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ملاقات کرے تو سمجھ لو کہ وہ انسان تو ہے مگر اس کے ندر انسانیت نہیں پائی جاتی ہے، اور وہ انسانیت سے کافی دور ہے اب ذیل میں اس تعلق سے حدیث ذکر کی جاتی ہے۔

”عن علی قال سمعت رسول الله ﷺ یقول مامن مسلم یعود غدوۃ الا صلّی علیه سبعون الف ملک حتی یمسی وان عادہ عشیة الا صلی علیه سبعون الف ملک حتی یصبح و کان له خریف في الجنّة“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے سنا کہ جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی صبح کے وقت میں عیادت کرتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت ومغفرت کی دعاء کرتے ہیں اور جو شام کے وقت عیادت کرتا ہے اس کے لیے ستر ہزار فرشتے صبح تک دعاء مغفرت کرتے ہیں اور اس کے لیے جنت میں ایک باغ ہے۔

حقوق الزوجین:۔ آج کل عام شکایت ہے کہ زن وشوہر میں نا اتفاقی ہے مرد کو عورت سے شکایت ہے تو عورت کو مرد سے، ہر ایک دوسرے کے لیے پال جان ہے، اور جب اتفاق نہ ہو تو نتائج کافی خراب ظاہر ہوتے ہیں، ہماری نا اتفاقی دنیا کے علاوہ دین کی بھی بربادی کا سبب ہوتی ہے، اور اس نا اتفاقی کا اثر یہیں تک باقی نہیں رہتا بلکہ اولاد پر بھی پڑتا ہے، اولاد کے دل میں نہ باپ کی اہمیت ہوتی ہے نہ ماں کی عزت، اس نا اتفاقی کا بڑا سبب یہ ہے کہ طرفین میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھتے اور رواداری سے کام نہیں لیتے مرد چاہتا ہے کہ عورت کو باندی سے بھی بدتر بنا کر رکھے اور عورت چاہتی ہے کہ مرد میرا غلام رہے، جو میں چاہوں وہ ہونا چاہئے خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ جب ایسے خیالات فاسدہ طرفین میں پیدا ہوں گے تو کیوں کر نبھ سکے گی۔ دن رات کی لڑائی اور ہر ایک کی عادات واخلاق میں برائی اور گھر کی بربادی اس کا نتیجہ ہے۔ قرآن شریف میں جس طرح یہ حکم آیا ہے کہ ”الرجال قوامون علی النساء“ جس سے مردوں کی عظمت ظاہر ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ عوتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اچھی معاشرت کرو، مرد کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کے ذمہ عورت کے کیا حقوق ہیں، انہیں ادا کرے اور عورت شوہر کے حقوق پر نظر رکھے اور پوری کرے ایسا نہ ہو کہ ہر ایک اپنے حقوق کے پورا کرنے کا مطالبہ کریں اور دوسرے کے حقوق سے سروکار نہ رکھے اور یہی فساد کی جڑ ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی بے جا باتوں پر کوئی خاص دھیان نہ دے اور اگر کسی وقت کسی طرف سے زیادتی ہو جائے تو فساد پر آمادہ ہونے کے بجائے نرمی سے کام لے کیوں کہ ایسی صورت میں ضد پیدا ہو جاتی ہے اور سلجھی ہوئی بات بگڑ جاتی ہے، بیوی کو چاہئے کہ اپنے شوہر کی مکمل خیر خواہی کرے، اس کی فرماں برداری میں کسی طرح کی کسر باقی نہ رکھے اور اس کی امانت میں خیانت نہ کرے، ان تمام لوگوں کی طرح اللہ تعالی نے ہم پر استاد، شاگرد، بادشاہ اور عوام، حاکم ومحکوم اور امام ومقتدی وغیرہ کے حقوق بھی مقرر کئے ہیں۔

☆☆☆

☆ مقالہ نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے طالب علم ہیں

تیرے قدموں میں شجاعت نے قسم کھائی ہے
یاد آئے گی تری یاد کی ہر محفل میں
عزم وہمت کے مریضوں سے یہ کہہ دے کوئی
جان آ جائے گی شبیر کو رکھ لو دل میں

(علامہ ارشد القادری)

علامت عشق کی آخر کو ظاہر ہو کے رہتی ہے
جبیں سے رنگ سے پژمردگی سے چشم گریاں سے

کرم کی رحم کی امداد کی ہے آس ارشد کو
خدا سے مصطفےٰ سے غوث سے احمد رضا خاں سے

(علامہ ارشد القادری)

قادیانیت
تعارف وتجزیہ

مولانا محمد فیض الدین نظامی☆

اللہ تعالیٰ نے اس نیلگوں آسمان کے نیچے اور فرش گیتی کے اوپر بے شمار مخلوقات بسا کر ایجاد و اختراع کا ایسا نمونہ پیش فرمایا جو اس کی قدرت کاملہ کا نہ صرف مظہر ہے بلکہ اس کی وحدانیت والوہیت کی بین دلیل بھی، ان بے شمار مخلوقات میں ایک انسان بھی ہے جسے اس نے اشرف المخلوقات کا لقب عطا فرما کر اس کو عزت و عظمت سے مشرف فرمایا نیز اس کی رشد و ہدایت کے لئے یکے بعد دیگرے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام ورسولان عظام بھیجے چنانچہ اس سلسلے کی آخری کڑی حضور پر نور خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ کی ذات مبارکہ و مقدسہ ہے جس پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا یعنی آپ کے بعد کبھی اور کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا حتی کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

قرآن وحدیث، اجماع امت واقوال صحابہ اور ارشادات ائمہ سے یہ بات پایہ ثبوت بلکہ ثبوت کے اعلیٰ وارفع درجے تک پہنچ چکی ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ تاہم ارشاد نبوی کے مطابق آپ ﷺ کے بعد کم از کم تیس افراد ایسے ضرور پیدا ہوں گے جو نبوت ورسالت کا جھوٹا دعویٰ کریں گے اور خلق خدا کو راہ راست سے پھیر کر ان کا ایمان لوٹنے کا کام کریں گے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کے پیارے محبوب دانائے غیوب ﷺ کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو کر رہیگی، چنانچہ اب تک چند ایسے دشمنان خدا ورسول پیدا ہو کر جہنم رسید بھی ہو چکے ہیں جنہوں نے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت ورسالت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور اپنے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے کفر وارتداد اور سرمایہ ایمان واعمال کی بربادی کے باعث ہوئے، ان ملعون ومعتوب کافروں میں سے ایک مرزا غلام احمد قادیانی بھی ہے جس کے قائم کردہ مذہب باطل کو دنیا "قادیانیت" کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔

ہم اپنے اس مختصر سے مقالے کے اندر اس مذہب باطل کا تعارف نیز قدرے تجزیہ بھی پیش کریں گے جس کے تناظر میں اس شیطانی مذہب کے فاسد خیالات، باطل عقائد ونظریات اور اس کے صحیح خدوخال حقائق کے اجالے میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے تا کہ اس کے حقیقی اغراض ومقاصد اور اصل تصویر سے واقفیت ہو۔

قادیانیت کے بانی کی پیدائش:۔ پنجاب میں (پاکستان امرتسر سے شمال مشرق میں ریلوے لائن پر ایک پرانا قصبہ ہے جس کا نام بٹالہ ہے جو ضلع گورداس پور کی تحصیل ہے۔ قصبہ بٹالہ سے گیارہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ "قادیان" ہے جہاں مرزا غلام احمد نامی دشمن خدورسول کی پیدائش ہوئی جس نے آگے چل کر "قادیانیت" کی بنیاد ڈالی۔ ان کے والد کا نام غلام مرتضی اور والدہ کا نام چراغ بی بی تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی تاریخ پیدائش کے تعلق سے مختلف روایتیں ملتی ہیں مگر ان سب میں راجح وہ ہے جو ان کی کتاب "تریاق القلوب" سے معلوم ہوئی ہے اس کے مطابق مرزا صاحب ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے۔

تعلیم:۔ مرزا صاحب جب تحصیل علم کی عمر کو پہنچے تو انہوں نے قرآن کریم اور بعض فارسی کتابوں کو اپنے گھر پر ہی مولوی فضل الٰہی سے پڑھنا شروع کیا پھر دس سال کی عمر میں عربی زبان سیکھنا شروع کی، اور جب سترہ سال کی عمر ہوئی تو آپ نے ایک استاد سے رابطہ قائم کیا جس سے انہوں نے صرف ونحو، منطق وفلسفہ اور ابتدائی عربی کی تعلیم لی اور ساتھ ہی طب کی تعلیم والد سے لیتے رہے جہاں تک دینی علوم وفنون کا تعلق ہے تو آپ نے کسی سے دینی علوم نہیں سیکھے صرف شوقیہ طور سے از خود ان کا مطالعہ کرتے رہے۔

قادیانیت کا پس منظر:۔ علمی اور تاریخی حیثیت سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ قادیانیت فرنگی سیاست کے بطن سے وجود میں آئی

صورت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے ربع اول میں ہندوستان میں جہاد
کی تحریک چل چکی تھا اس سے مسلمانوں میں جہاد اور قربانی کی آگ بھڑک
اٹھی تھی ان کے سینوں میں اسلامی شجاعت اور حوصلہ مندی موجزن ہونے
لگی تھی اور ہزاروں کی تعداد میں اس تحریک کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو
گئے تھے جس کی سرگرمیاں برطانوی حکومت کے لیے پریشانی اور تشویش کا
باعث تھیں اور ادھر سوڈان میں بھی جہاد کا نعرہ بلند ہو چکا تھا جس سے
سوڈان میں برطانیہ اقتدار تزلزل میں آگیا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ چنگاری
اگر بھڑک اٹھی تو پھر قابو میں نہیں آئے گی اور پھر افغانیوں کی تحریک اتحاد
اسلامی کو اس نے پھیلنے اور مسلمانوں میں مقبول ہوتے دیکھا۔ اس نے
سب خطرات کو محسوس کیا، اس نے مسلمانوں کے مزاج کو سمجھ لیا۔ لہذا
مسلمانوں پر قابو پانے کی واحد شکل یہ ہے کہ ان کے عقائد ونظریات پر اور
ان کے دینی مزاج ونفسیات پر قابو پایا جائے مسلمانوں کے مزاج میں در خود
حاصل کرنے کے لئے دین کے سوا کوئی ذریعہ نہیں اس مقصد کے لیے برطا
نوی حکومت نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں ہی میں سے کسی شخص کو ایک بہت
اونچے دینی منصب کے نام سے ابھارا جائے کہ مسلمان عقیدت کے ساتھ
اس کے گرد جمع ہو جائیں اور انہیں حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کا ایسا
سبق پڑھائے کہ پھر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہ رہے یہ حربہ تھا
جو برطانوی حکومت نے اختیار کیا کیونکہ مسلمانوں کا مزاج بدلنے کے لئے
کوئی حربہ اس سے زیادہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی جو ذہنی انتشار کا مریض تھا اور بڑی شدت
سے اپنے دل میں یہ خواہش رکھتا تھا کہ وہ ایک نئے دین کا بانی بنے، اس
کے کچھ متبعین اور مومنین ہوں اور تاریخ میں اس کا ویسا ہی نام اور مقام ہو
جیسا جناب رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ انگریزوں کو اس کام کے لئے
موزوں شخص نظر آیا جو ان کے اغراض ومقاصد کے لئے مسلمانوں
میں کام کر لے۔ چنانچہ اس نے بڑی تیزی سے کام شروع کیا، پہلے
منصب تجدید کا دعویٰ کیا پھر ترقی کر کے امام مہدی بن گیا، کچھ دن اور
گزرے تو مسیح موعود ہونے کی بشارت دیدی اور آخر کار نبوت کا تخت بچھا
دیا اور مسلمانوں میں فتنہ وفساد برپا کرنے کا شوق اتنا بڑھا کہ الوہیت
تک کا دعویٰ کر بیٹھا۔

عقائد ونظریات:۔ مرزا غلام احمد قادیانی شروع میں افکار
ونظریات اور عقائد واعتقاد کے تعلق سے بالکل عامۃ المسلمین کی طرح
ہی تھے چنانچہ وہ "ختم نبوت" کے وہی معنی لیتے تھے جس پر پوری امت
کا اتفاق ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور آپ
علیہ السلام کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے یعنی آپ نے نبوت کے
دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند فرما دیا چنانچہ مرزا صاحب اپنی کتاب
"ازالہ اوھام" میں لکھتے ہیں۔

"قرآن کریم بعد خاتم النبیین کے کسی رسول کا آنا جائز نہیں رکھتا خواہ
وہ نیا رسول ہو یا پرانا ہو کیوں کہ رسول کو علم دین بتوسط جبرئیل علیہ السلام ملتا
ہے اور باب نزول جبرئیل بہ پیرایہ وحی رسالت مسدود ہے اور یہ بات خود
ممتنع ہے کہ رسول تو آئے مگر سلسلہ وحی رسالت نہ ہو" (ازالہ اوہام
ص:۷۶۱)

"ہر ایک دانا شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ صادق الوعد ہے اور
جو آیت خاتم النبیین میں وعدہ دیا گیا ہے اور جو حدیثوں میں بہ تصریح بیان کیا
گیا ہے کہ آپ جبرائیل علیہ السلام کو بعد وفات رسول ہمیشہ کے لئے وحی
نبوت لانے سے منع کیا گیا۔ یہ تمام باتیں سچ اور صحیح ہیں تو پھر کوئی شخص بہ
حیثیت رسالت ہمارے نبی کے بعد ہرگز نہیں آسکتا" (ازالہ اوہام
ص:۵۷۷)

اس کے علاوہ "حمامۃ البشری ص ۲۴ پر مرزا جی لکھتے ہیں۔"

کیا تو نہیں جانتا کہ پروردگار رحیم صاحب فضل نے ہمارے نبی کا بغیر
کسی استثنا کے خاتم النبیین نام رکھا اور ہمارے نبی نے اہل طلب کے
لئے اس کی تفسیر اپنے قول "لا نبی بعدی" میں واضح طور پر فرمادی اور اگر
ہم اپنے نبی کے بعد کسی نبی کا ظہور جائز قرار دیں تو گویا ہم باب وحی بند
ہو جانے کے بعد اس کا کھلنا جائز قرار دیں، اور یہ صحیح نہیں ہے، جیسا کہ
مسلمانوں پر ظاہر ہے، اور ہمارے نبی کے بعد کوئی نبی کیوں کر آسکتا
ہے دراں حالیکہ آپ کی وفات کے بعد وحی منقطع ہوگئی اور اللہ تعالیٰ
نے آپ پر نبیوں کا خاتمہ کر دیا۔

مزید برآں بڑے موکدانداز میں کتاب البریہ ص ۱۸۴ میں
لکھتے ہیں۔

''آں حضرت ﷺ نے بار بار فرمایا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور حدیث ''لا نبی بعدی'' ایسی مشہور تھی کہ کسی کو اس کی صحت میں کلام نہ تھا اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے آیت کریمہ و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ فی الحقیقت ہمارے نبی پر نبوت ختم ہو چکی ہے''۔

اوپر کے تمام مذکورہ اقتباسات سے جو عقیدہ مترشح ہے کیا اس سے کوئی بھی آدمی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایسا شخص جس کے یہ عقیدے ہوں اور جو خود قرآنی آیات اور حدیث سے استدلال کرتا ہو کہ نبوت کا دروازہ ہمشہ کے لئے بند ہو چکا ہے کبھی نبوت کا دعویٰ کریگا اور جمیع انبیاء ورسل کو گالیاں دیگا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آگے چل کر ختم نبوت کے منکرین کو کافر وکاذب بھی قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

''اے لوگو! دشمن قرآن نہ بنو اور خاتم النبیین کے بعد وحی نبوت کا نیا سلسلہ جاری نہ کرو اس خدا سے شرم کرو جس کے سامنے حاضر لیے جاؤ گے'' (آسمانی فیصلہ ص ۲۵ مطبوعہ ۱۸۹۱ء)

یہ تھے وہ اقتباسات جو مرزا صاحب خود اپنے قلم سے تحریر فرمائے ہیں جن سے ختم نبوت کے تعلق سے ایمانی اور خالص ایمانی عقیدے واعتقاد کا ترشح ہوتا ہے جن میں مرزا غلام احمد نے صاف اور واضح الفاظ میں نبی کریم ﷺ کو خاتم الانبیاء تسلیم کرتے ہوئے اس شخص کو کاذب وکافر قرار دیا ہے جو نبی کریم حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی کو نبی یا رسول مانتا ہے اور وہ بار بار اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اب اللہ کے آخری نبی ﷺ کے بعد کوئی اور رسول نہیں آئے گا اس کے خلاف آپ ﷺ کے بعد میں کسی کو نبی اور رسول مان کر کیسے اسلام سے خارج ہو سکتا ہوں اس واضح اقرار کے بعد کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ مرزا صاحب عقیدہ نبوت سے دور جا سکتے ہیں اور مستقل میں نبی ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں مگر اس کے بعد مرزا صاحب کے عقائد ونظریات میں جو تدریجا تبدیلی رونما ہوتی ہے اس کو ملاحظہ کیجئے۔

ختم نبوت کی نئی تفسیر:۔ جیسا کہ آیت قرآنی اور احادیث کی روشنی میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہیں اور آپ پر نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا اور جیسا کہ خود مرزا صاحب نے بھی اوپر کے اقتباسات وعبارات میں اقرار کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ آخری نبی ورسول ہیں ان کے بعد اور کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا یہی مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے اور تمام علمائے کے اسلام کی ختم نبوت کی متفقہ تفسیر بھی یہی ہے مگر مرزا صاحب اور ان کے متعین نے اس سے ہٹ کر ختم نبوت کی ایک نئی تفسیر اختیار کی ہے جو خود حضور ﷺ ان کے صحابہ کرام کی تفسیر سے مختلف ہے صحابہ کرام نے ہر اس شخص سے جنگ کی جس نے حضور کے بعد دعوائے نبوت کیا، پھر یہی تفسیر بعد کے تمام مسلمانوں نے کی جس کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے درمیان کبھی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کیا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو لیکن قادیانی اور ان کے ماننے والوں نے ختم نبوت کی یہ نرالی تفسیر کی کہ نبی ﷺ ''نبیوں کی مہر'' ہیں اور اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ حضور کے بعد اب جو بھی نبی آئے گا اس کی نبوت آپ ﷺ کی مہر تصدیق لگ کر مصدقہ ہوگی۔

اس کے ثبوت میں قادیانی لٹریچر کی بکثرت عبارتیں موجود ہیں۔ مگر یہاں پر چند حوالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

''خاتم النبیین کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی مہر کے بغیر کسی کی نبوت تصدیق نہیں ہو سکتی، جب مہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہو جاتا ہے اسی طرح آں حضرت کی مہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو وہ صحیح نہیں'' (ملفوظات احمد یہ مرتبہ منظور الٰہی قادیانی حصہ پنجم ص ۲۹۰)

''ہمیں اس سے انکار نہیں کہ رسول کریم ﷺ خاتم النبیین ہیں مگر ختم نبوت کے معنی وہ نہیں جو ''احسان'' کا سواد اعظم سمجھتا ہے اور جو رسول کریم ﷺ کی شان اعلیٰ وارفع کے سراسر خلاف ہے کہ آپ ﷺ نے نبوت عظمیٰ اسے اپنی امت کو محروم کر دیا بلکہ یہ ہیں کہ آپ نبیوں کی مہر ہیں۔ اب وہی نبی ہوگا جس کی آپ تصدیق کریں گے ... انہی معنوں میں ہم رسول کریم ﷺ کو خاتم النبیین سمجھتے ہیں'' (الفضل قادیان، مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء)

''خاتم مہر کو کہتے ہیں جب نبی کریم ﷺ مہر ہوئے تو اگر ان کی امت میں کسی قسم کا نبی نہیں ہوگا تو وہ مہر کس طرح ہوئے یا مہر کس پر لگے گی؟ (الفضل قادیان) تفسیر کا یہ اختلاف صرف ایک لفظ کی تاویل وتفسیر تک ہی محدود نہ رہا بلکہ قادیانیوں نے آگے بڑھ کر صاف صاف

اعلان کردیا کہ نبی ﷺ کے بعد ایک نہیں ہزاروں نبی آسکتے ہیں۔ یہ بات بھی ان کے اپنے واضح بیانات سے ثابت ہے جن میں صرف چند کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

''یہ بات بالکل روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہے'' (حقیقۃ النبوت ۲۲۸ مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد قادیان)

''انہوں نے (یعنی مسلمانوں نے) یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا کے خزانے ختم ہوگئے ان کا یہ سمجھنا خدا تعالیٰ کی قدرت کو ہی نہ سمجھنے سے ہے، ورنہ ایک نبی کیا میں تو کہتا ہوں ہزاروں نبی ہوں گے'' (انوار خلافت، ص ۲۶ مصنفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب) اگر میری گردن کے دونوں طرف تلوار رکھ دی جائے اور مجھ سے کہا جائے کہ تم یہ کہو کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو میں اسے ضرور کہوں گا کہ تو جھوٹا ہے کذاب ہے، آپ کے بعد نبی آسکتے ہیں اور ضرور آسکتے ہیں'' (انوار خلافت ص ۶۵)

ان عبارتوں کو پڑھنے کے بعد کیا کوئی یہ یقین کرسکتا ہے؟ کہ یہ اقوال اسی شخص کے ہیں، یہ عقائد ونظریات اسی کے ہیں جو کبھی ختم نبوت کے منکر اور آپ ﷺ کے بعد کسی مدعی نبوت ورسالت کو کاذب وکافر قرار دیتا تھا علاوہ ازیں قادیانی نے ان عبارتوں سے نہ صرف نبوت ورسالت کے دروازے کھولے بلکہ ایک نہیں ہزاروں نبی کی آمد کو امکان کے دائرے میں لا کھڑا کیا بلکہ ختم نبوت کی نئی تفسیر سے اسی نے اپنے فاسد وباطل اغراض ومقاصد کو بروئے کار لانے کی ناپاک اور منظم کوشش کی ہے چنانچہ وہ اسی کے بعد ایک قدم ترقی کرکے منصب تجدید وولایت کا اعلان کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

مثل مسیح بننے کی کوشش:۔ مثل مسیح ہونے کے تعلق سے مرزا صاحب کے خیالات ملاحظہ کیجئے:

''اور مصنف کو اس بات کا بھی علم دیا گیا ہے کہ وہ مجدد وقت ہے اور روحانی طور پر اس کے کمالات مسیح ابن مریم کے کمالات سے مشابہ ہیں اور ایک کو دوسرے سے بہ شدت مناسبت اور مشابہت ہے'' (مجموعہ اشتہارات ص:۲۴ ج اول)

''جس غلبہ کاملہ دین اسلام کا وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہ مسیح کے ذریعے ظہور میں آئے گا اور جب مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے اسلام جمیع آفاق واقطار میں پھیل جائے گا لیکن اس عاجز پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ خاکسار اپنی غربت اور انکسار اور توکل اور ایثار اور آیات اور انوار کی رو سے مسیح کی پہلی زندگی کا نمونہ ہے اور اس عاجز کی فطرت اور مسیح کی فطرت باہم نہایت ہی متشابہ واقع ہوئی ہے گویا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے یا ایک ہی درخت کے دو پھل ہیں اور بہ حدے اتحاد ہے کہ نظر کشفی میں نہایت ہی باریک امتیاز ہے'' (مجموعہ اشتہارات ص: ۲۲۱ جلد ا)۔

مثل مسیح ہونے کا دعویٰ:۔ اب تک تو مرزا صاحب نے مسیح علیہ السلام کے مثل بننے کی کوشش کی تھی لیکن آگے چل کر مثلیت کا دعوی بھی کررہے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

''مجھے ابن مریم ہونے کا دعوی نہیں اور نہ ہی میں تناسخ کا قائل ہوں بلکہ مجھے تو فقط مثل مسیح ہونے کا دعویٰ ہے۔ جس طرح محدثیت نبوت سے مشابہ ہے ویسے ہی میری روحانی حالت مسیح ابن مریم کی روحانی حالت سے اشد درجہ کی مشابہت رکھتی ہے'' (مجموعہ اشتہارات ص:۲۳۱ جلد ا)

''اس عاجز نے مثل مسیح ہونے کا دعوی کیا ہے جس کو کم فہم لوگ مسیح موعود خیال کر بیٹھے ہیں یہ کوئی نیا دعوی نہیں جو آج میرے منہ سے سنا گیا ہو بلکہ یہ وہی پرانا الہام جو میں نے خدا تعالیٰ سے پاکر براہین احمدیہ کے کئی مقامات پر بہ تصریح درج کردیا تھا جس کے شائع کرنے پر سات سال سے بھی کچھ زیادہ عرصہ گذر گیا ہوگا۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں مسیح ابن مریم ہوں۔ جو شخص یہ الزام میرے پر لگائے وہ سراسر مفتری اور کذاب۔ بلکہ میری طرف سے عرصہ سات آٹھ سال سے برابر یہی شائع ہو رہا ہے کہ مثل مسیح ہوں یعنی حضرت عیسی علیہ السلام کے بعض روحانی خواص طبع اور عادت اور اخلاق وغیرہ کے خدائے تعالیٰ نے میری فطرت میں بھی رکھے ہیں'' (ازالہ اوہام ص ۱۹۰ جلد:۳ مطبوعہ ۱۸۹۱ء)

''یہ بات سچ ہے کہ اللہ جل شانہ کی وحی اور الہام سے میں نے مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں اسی الہام کی بناء پر اپنے تئیں وہ موعود مثیل سمجھتا ہوں جس کو لوگ غلط فہمی کی وجہ سے مسیح موعود کہتے ہیں، مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ میرے سوا کوئی اور مثیل بھی آنے والا ہو۔'' (مجموعہ اشتہارات ص: ۲۷۶ جلد ا)

ناظرین کرام غور فرمائیں مندجہ بالا بیانات میں مرزا صاحب نے اپنے آپ کو مثیل مسیح ہونے کا دعوی کیا ہے اور اس بات کا شدت سے انکار کیا ہے کہ وہ عیسی ابن مریم ہیں، بلکہ ایسا سمجھنے اور کہنے والے کو مفتری اور کذاب بتایا ہے۔ نہ معلوم وہ کیا ضرورت اور مجبوری تھی کہ اپنے آپ کو محض مثیل مسیح ظاہر کرتا شخص پھر مسیح بن مریم کا داعوے دار بن کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں:

مسیحیت کا دعویٰ:۔ ''مگر جب وقت آ گیا تو وہ اسرار مجھے سمجھایا گیا تب میں نے معلوم کیا میرے اس دعویٰ مسیح موعود ہونے میں کوئی نئی بات نہیں۔ یہ وہی دعویٰ ہے جو براہین احمدیہ میں بار بار بالتصریح لکھا جا چکا ہے'' (کشتی نوح ص ۴۷ مطبوعہ ۱۹۰۲ء)

''اور یہی عیسی ہے جس کا انتظار تھا اور الہامی عبارتوں میں مریم اور عیسی سے میں ہی مراد ہوں میری نسبت ہی کہا گیا ہے کہ اس کو نشان بنا دیں گے اور نیز کہا گیا کہ یہ وہی عیسی بن مریم ہے جو آنے والا تھا جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔ یہی حق ہے اور آنے والا یہی ہے اور شک محض نافہمی سے ہے۔'' (کشتی نوح ص ۴۸)

''سوچو کہ خدا جانتا تھا کہ اس نقطہ پر علم ہونے سے یہ دلیل ضعیف ہو جائے گی اس لیے اس نے براہین احمدیہ کے تیسرے حصہ میں میرا نام مریم رکھا پھر جیسا کہ براہین احمدیہ سے ظاہر ہے دو برس تک صفت مریمیت میں، میں نے پرورش پائی اور پردہ میں نشو ونما پاتا رہا۔ پھر مریم کی طرح عیسی کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر مہینہ کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں بذریعہ اس الہام کے جو سب سے آخر براہین احمدیہ حصہ چہارم ص: ۵۵۶ میں درج ہے، مجھے مریم سے عیسی بنایا گیا۔ بس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا اور خدا نے براہین احمدیہ کے وقت میں اس سرخفی کی مجھے خبر نہ دی۔'' (کشتی نوح ص ۹۷)

''ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت جو ظہور موعود کا وقت ہے کسی نے بجز اس عاجز کے دعویٰ نہیں کیا کہ میں مسیح موعود ہوں بلکہ اس مدت تیرہ سو برس میں کبھی کسی مسلمان کی طرف سے ایسا دعویٰ نہیں ہوا کہ میں مسیح موعود ہوں، یقیناً سمجھو کہ نازل ہونے والا ابن مریم یہی ہے جس نے عیسیٰ بن مریم کی طرح اپنے زمانے میں کسی ایسے شخص والا روحانی نہ پایا او اس کی روحانی پیدائش کا موجب ٹھہرتا تب خدا تعالیٰ خود اس کا متولی ہوا اور تربیت کی، کنار میں لیا اور اس بندہ کا نام ابن مریم رکھا پس امکانی طور پر ہی عیسیٰ ابن مریم ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوا۔ کیا تم ثابت کر سکتے ہو کیا تم ثبوت دے سکتے ہو کہ تمہارے سلاسل اربع میں سے کسی سلسلے میں داخل ہے، پھر یہ اگر ابن مریم نہیں تو کون ہے'' (ازالہ اوہام ص: ۶۵۶ ج ۳)

عین محمد ہونے کا دعویٰ:۔ آپ نے دیکھا کہ مرزا صاحب کس طرح درجہ بدرجہ اپنے موقف میں غیر معمولی تبدیلی لاتے ہوئے ولایت سے لے کر نبوت تک پھر نبوت سے مسیحیت تک کا دعویٰ کر بیٹھے اور اس پر کس طرح کی بے تکی باتیں کیں مگر ان کی فحش گوئی اور کفر وارتداد کا ناپاک سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ آگے چل کر وہ خود کے عین محمد ﷺ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں پھر ایک قدم ترقی کر کے آپ ﷺ سے بھی افضل واعلی ہونے کا ضمنی دعوی کرتے ہیں۔ پھر ایک قدم ترقی کر کے آپ ﷺ سے بھی افضل واعلی ہونے کا ضمنی دعوی کرتے ہیں۔ آپ بھی ان کے نحش کلمات سنیے اور حیرت وتعجب سے ان کی خیالی اڑان کا مشاہدہ کیجئے۔

''ادھر بچہ پیدا ہوا اور اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے اور شروع ہی میں اس کو خدا اور رسول پاک کا نام سنایا جاتا ہے بعینہ یہ بات میرے ساتھ ہوئی۔ میں ابھی احمدیت میں بطور بچہ کے ہی تھا جو میرے کان میں یہ آواز پڑی کہ مسیح موعود'' محمد است عین محمد است''۔ (اخبار الفضل قادیان مورخہ ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۱۳ء)

''میں اس سے بالکل بے بہرہ تھا کہ مسیح موعود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ منم محمد واحمد مجتبی باشد۔ پھر میں اس مشکل سے بے علم تھا کہ خدا کا ہر برگزیدہ نبی اپنے آپ کو بزور محمد ﷺ کہتا ہے اور بڑے زور سے دعوی کرتا ہے کہ میں بروزی طور یہ وہی نبی خاتم الانبیاء ہوں۔''

''پھر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اولوالعزم نبی حضرت مسیح موعود کو ماننے سے خدا کے نزدیک صحابہ کی جماعت میں داخل ہو گیا ہوں حالانکہ وہ خدا کا نبی الہامی الفاظ میں کہہ چکا تھا کہ جو میری جماعت میں شامل ہوا در اصل میرے سردار خیر المرسلین ﷺ کے صحابہ میں داخل ہوا۔'' (روحانی خزائن ص ۲۵۸ جلد ۱۶ از مرزا غلام احمد قادیانی)

مرزا غلام احمد رسول اللہ سے بھی افضل:۔ مرزائیوں کا عقیدہ فاسدہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو نہ صرف انبیاء بلکہ سید المرسلین ﷺ پہ بھی فضیلت حاصل ہے۔ مرزا غلام احمد صاحب اپنی کتاب ذکر الہٰی صفحہ ۱۹ پر لکھتے ہیں:

''پس میرا ایمان ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس قدر رسول کریم ﷺ کے نقش قدم پر چلے کہ نبی ہو گئے لیکن کیا استاد اور شاگرد کا ایک مرتبہ ہوسکتا ہے، گو شاگرد علم کے لحاظ سے استاد کے برابر بھی ہو جائے تاہم استاد کے سامنے زانوے ادب خم کر کے ہی بیٹھے گا۔ یہی نسبت آں حضرت ﷺ اور حضرت مسیح موعود میں ہے۔'' (تقریر میاں محمد خلیفہ، قادیانی اخبار الحکم ۱۸/اپریل ۱۹۱۴ء) ''اسلام ہلال کی طرح شروع ہوا در مقدر تھا انجام کار آخر زمانہ میں بدر ہو جاتے خدا تعالیٰ کے حکم سے۔ بس خدا تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ اسلام اس صدی میں بدر کی شکل اختیار کرے جو شمار کی رو سے بدر کے مشابہ ہو، (یعنی چودھویں صدی) بس ان ہی معنوں کی طرف اشارہ ہے خدا تعالیٰ کے اس قول میں کہ '' لقد نصر کم اللہ ببدر ''۔'' آں حضرت ﷺ کی بعثت اول میں آپ کے منکروں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا لیکن ان کی بعثت ثانی میں آپ کے منکروں کو داخل اسلام سمجھنا یہ آں حضرت ﷺ کی ہتک اور آیات اللہ سے استہزا ہے حالانکہ خطبہ الہامیہ میں مسیح موعود نے آں حضرت ﷺ کی بعثت اول اور ثانی کی باہمی نسبت کو ہلال اور بدر کی نسبت تعبیر فرمایا ہے۔'' (اخبار الفضل قادیان ج:۳ ص ۱۰ جولائی ۱۹۱۵ء)

مشہور قادیانی شاعر قاضی اکمل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی شان میں ان کی موجودگی میں پڑھے اور مرزا صاحب نے ان اشعار کو پسند فرمایا۔

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

گویا مرزا غلام احمد قادیانی نہ صرف ہو بہو محمد مصطفےٰ ﷺ ہیں بلکہ اپنی شان کے اعتبار سے محمد مصطفےٰ ﷺ سے بڑھ کر ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

الہامات مرزا:۔ قرآن مجید کے اصول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو اسی قوم کی زبان میں وحی بھیجی جس قوم کی طرف وہ نبی بنا کر بھیجا گیا جس کی دلیل قرآن کی یہ آیت کریمہ ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم . قرآن مجید کے اس صاف اصول کے خلاف مرزا صاحب کو مختلف زبانوں میں الہام ہوئے حق تو یہ تھا کہ مرزا صاحب کو پنجابی زبان میں وحی ہوتی کیونکہ وہ پنجاب کے تھے لیکن پنجابی زبان اس شرف سے محروم رہی۔ یہ کتنی غیر معقول بات ہے کہ نبی تو پنجابی ہو اور اس کو الہام کسی دوسری زبان میں ہو۔

چنانچہ مرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں۔'' یہ بات غیر معقول اور بیہودہ ہے کہ انسان کی اصل زبان تو کوئی ہو اور الہام اس کو کسی اور زبان میں ہو جس کو وہ سمجھ بھی نہیں سکتا کیونکہ اس میں تکلیف مالا یطاق ہے اور اسے الہام سے فائدہ کیا ہوا جو انسانی سمجھ سے بالاتر ہے۔'' (چشمہ موقت ص ۲۰۹ روحانی خزائن ص ۲۱۸ ج ۲۳) مرزا صاحب کا دعویٰ ہے کہ میری وحی اور الہامات قرآن پاک کی طرح ہیں لیکن اگر آپ مرزا صاحب کے الہامات کا سرسری جائزہ لیں گے تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ مرزا صاحب کے کتنے ہی الہامات ایسے ہیں جن کو وہ خود بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں'' زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض الہامات مجھے ان زبانوں میں بھی ہوتے ہیں جن سے مجھے کچھ واقفیت نہیں جیسے انگریزی سنسکرت یا عبرانی وغیرہ۔'' (نزل مسیح ص ۵۷۔ روحانی خزائن ص ۴۳۵ ج ۱۸)

غور فرمایئے مرزا صاحب جس زبان کو خود نہیں جانتے اس زبان کے الہام کو کیا سمجھتے اور دوسروں کو کیا سمجھاتے ہوں گے؟

یہی بات نہیں مرزا صاحب غیر زبانوں کے الہامات کو نہ سمجھ سکتے ہوں بلکہ بہت سے اردو اور عربی الہامات ایسے بھی ہیں جن کو مرزا صاحب بھی نہ سمجھ سکتے تھے جس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں!

''پیٹ پھٹ گیا'' دن کے وقت الہام ہوا ہے معلوم نہیں یہ کس کے متعلق ہے۔ (البشریٰ ص ۱۱۹ جلد دوم)

''لاہور میں ایک بے شرم'' (کون؟ معلوم نہیں) (لایعنی بات) (البشریٰ ص ۱۰۷ جلد دوم) بہت سے گیت الہامات ۱۰۸۔ ۲۷۰۔۱۴۰۔۲۰۔۲۷۰۔۲۶۰۲۰۔۲۔۲۲۸۔۲۳۔۱۰۔۱۱۔۱۔۲۔۲۷۲۔ وغیرہ

وغیرہ۔(البشریٰ ص ۱۷ جلد ۲ مجموعہ الہامات مرزا غلام احمد) ''ربنا عاج'' ہما رارب عاجی ہے۔ عاجی کے معنی ابھی تک معلوم نہیں ہوسکے۔(البشریٰ ص ۱ جلد اول۔تذکرہ ص ۱۰۲ طبع ۳) ''غثم ،غثم ، غثم'' (البشریٰ ص ۵۰ جلد دوم تذکرہ ص ۳۱۹)

اب آپ ہی انصاف ودیانت سے بتایئے کہ کیا کسی نبی کی نبوت کے لیے یہی الہامات ہوتے ہیں جن پر کسی نبوت کی بنیاد رکھی جائے مگر کیا بتایئے یہ تو صرف قادیانی نبوت کی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں۔

تاویلات مرزا:۔مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کی پہلی اینٹ ہی تاویل پر رکھی۔ حضرت ﷺ کے خاتم النبیین ہونے میں ذرہ برابر شک نہیں جس کا واحد مطلب یہ ہے کہ آپ آخری نبی ہیں قرآن مجید کا سیاق وسباق ہی بتا رہا ہے احادیث مبارکہ اور صحابہ کرام کے اجماع سے بھی یہی ثابت ہے کہ آں حضرت ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں تمام امت مسلمہ کا بھی اسی پر اجماع ہے اور عربی لغت کا مفہوم بھی اسی کی صراحت کرتا ہے لیکن مرزا صاحب خاتم کا معنی مہر لیتے ہیں۔مرزا صاحب تاویل کرنے میں بڑے ماہر استاد تھے موقع بموقع اپنا موقف بدلتے رہے جیسا کہ آپ نے گذشتہ اوراق میں ملاحظہ فرمایا یہی حال ان کی امت کا بھی ہے آیات قرآنیہ کا جیسا مطلب چاہا نکال لیا، جس حدیث کو چاہا قبول کر لیا اور جس کو چاہا رد کر دیا۔ ذیل میں ہم چند عجیب وغریب تاویلات کا ذکر کریں گے۔

مرزا صاحب حضرت عیسی علیہ اسلام کے آسمان پر اٹھا کے جانے کے قائل بھی ہیں اور ان کی وفات کے بھی اور فرماتے ہیں کہ جس عیسی بن مریم کا تم انتظار کرتے ہو جس کی خبر احادیث نے دی ہے وہ یہی عاجز (غلام احمد قادیانی) ہے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول اور دجال کے خروج کی بے شمار حدیثیں وارد ہوئیں جو مرزا صاحب پر منطبق نہیں ہوتیں۔ان کو اپنے پر منطبق کرنے کے لیے بے دھڑک تاویل کر ڈالی جو آج تک کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آئی۔فرماتے ہیں کہ: ''نزول مسیح سے مراد ان کا آسمان سے اترنا نہیں بلکہ مرزا صاحب کا اپنے گاؤں قادیان میں پیدا ہونا مراد ہے۔'' حدیث میں مسیح علیہ السلام کا دمشق کے سفید مشرقی منارہ سے مراد وہ منارہ ہے جو مرزا صاحب کی سکونتی جگہ قادیان کے مشرقی کنارہ پہ واقع ہے'' اور جسے مرزا صاحب نے خود اپنے نزول کے بعد بنوایا تھا۔حدیث میں دجال جس دجال کا ذکر آیا ہے اس سے مراد شیطان اور عیسائی قومیں ہیں'' (تاویل مرزا صاحب) حدیث میں دجال کے جس گدھے کا ذکر ہے اس سے مراد 'ریل گاڑی ہے' جس پر سوار ہو کر مرزا صاحب لاہور جایا کرتے تھے اور مرنے کے بعد آپ کی لاش کو دجال کے اس گدھے پر لاد کر لایا گیا تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نازل ہونے کے بعد دجال سے قتال کریں گے اور اس کو مقام لُد پر قتل کریں گے۔مرزا جی فرماتے ہیں کہ: لُد سے مراد لدھیانہ ہے اور دجال کے قتل سے مراد لیکھ رام کا قتل ہے'' نیز حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت عیسی علیہ السلام آسمان سے اتریں گے تو وہ دو زرد چادریں پہنے ہوں گے مرزا صاحب نے اسکی تاویل اس طرح فرمائی کہ ''مسیح موعود دو زرد چادروں میں اترے گا ایک چادر بدن کے اوپر کے حصے میں ہوگی دوسری چادر بدن کے نیچے کے حصے میں ہوگی،سو میں نے کہا اس طرف اشارہ تھا کہ مسیح موعود دو بیماریوں کے ساتھ ظاہر ہوگا، تعبیر کے علم میں زرد کپڑے سے مراد بیماری ہے، اور وہ دونوں بیماریاں مجھ میں ہیں یعنی ایک سر کی بیماری (مراق مالیخولیا) دوسری کثرت پیشاب اور دستوں کی بیماری''

کسی نبی کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے دعوے اور پیشن گوئیاں سچ ہوں مگر مرزا صاحب کی تو بات ہی کچھ اور ہے کہ ان کے دعوے جھوٹ کے پلندے ثابت ہوئے اور پیشین گوئیاں بھی۔ علاوہ ازیں وہ ایسے ایسے امراض میں مبتلا تھے جن کے ساتھ قطعاً کوئی نبی مبتلا نہیں ہوسکتا۔ان کی زندگی کے آخری ایام مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ساتھ مباہلہ میں گزرے جس میں انہوں نے خود کی اور مولانا کی بھی موت کی مدت مقرر فرمائی تھی اور اسی پر اپنے حق وباطل ہونے کی بنیاد رکھی،مرزا صاحب تو اپنی مقرر کردہ مدت میں چل بسے مگر مولانا ثناء اللہ امرتسری اس کے بعد بھی عرصۂ دراز تک زندہ رہے۔

☆☆☆

☆ مقالہ نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے طالب علم ہیں

ھندو ازم: تعارف وتجزیہ

مولانا محمد عرفان عالم نظامی ☆

دنیا کے جن قدیم خطوں میں پہلے پہل انسانی تہذیب وتمدن پروان چڑھ رہا تھا ان میں سے ہندوستان کا بھی علاقہ شامل تھا۔ ملک ہندوستان کے تمام اقوام ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور مجوسی لفظ ہندوستانی میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن لفظ ہندو کا اطلاق صرف برہمن، ویش اور شدر جیسی خاص قوم ہی پر ہوتا ہے۔

ہندو مذہب کی تعریف:۔ ہندو دھرم سارے مذاہب کے عقائد و افکار اور وشواسوں کے مجموعے کا نام ہے۔ جیسا کہ پنڈت گنگا ناتھ جھا ایم۔اے (کچھ ہندومت کے بارے میں، صفحہ نمبر ۴۷) میں فرماتے ہیں: ''ہندو مذہب کا خاصۂ امتیازی اس کی ہمہ گیری ہے یعنی اس کے تحت میں تقریباً ہر قسم کے عقاید شامل ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب اپنا ایک مخصوص نظام معتقدات رکھتے ہیں جن کے کسی جزء سے انکار کرنا اس مذہب سے خارج ہو جانا ہے۔ لیکن ہندوؤں کے یہاں کوئی ضابطۂ معتقدات نہیں۔ ہر وہ شخص جو وحی والہام کا قائل ہے ہندو ہے۔ عام اس سے کہ وہ دنیا کے کسی کتاب کو بھی الہامی سمجھے''

لفظ ہندو کا معنی اور اس کی تحقیق:۔ لفظ ''ہندو'' یہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی سیاہ کے ہیں۔ عام طور پر فارسی کا ہاء سنسکرت میں حرف سین سے اور سنسکرت کا حرف سین فارسی میں ہاء سے بدل جاتا ہے جیسے ہفتہ، سپتہ یا سوریہ اور ہوریہ یا سندھو اور ہندو یا سوما اور ہوما یا ماس یا دس اور دہ وغیرہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ سنسکرت زبان میں سمندر یا دریا کو سندھو اس لئے کہتے ہیں کہ عظیم الشان جھیل یا دریا کا پانی سیاہ نظر آتا ہے۔

لفظ ہندو کا تاریخی پس منظر:۔ لفظ ہندو ایک غیر ملکی لفظ ہے اور یہ ان کی کسی بھی مذہبی کتاب میں کہیں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ آٹھویں صدی ہجری میں ایک گروہ کے لیے تنتر گرنتھ میں استعمال کیا گیا تھا، زمانے کے نشیب وفراز کے سبب ہزاروں سال سے اس کا اطلاق ہندو مذہب کے ان اقوام پر ہونے لگا مثلاً برہمن، ویش، چھتری اور شدر اور اب تک ہو رہا ہے، ماضی قریب میں ہندو مذہب کا ایک جدید فرقہ وجود آیا جس کا بانی ''پنڈت دیانند سرسوتی ہے'' انہوں نے ہندو کی جگہ اپنے آپ کو آریہ کہلوانا پسند کیا، چونکہ اصطلاح مؤرخین میں ہندو، اور لفظ آریہ دونوں مترادف ہے یعنی وہ لوگ جو کسی قدیم زمانے میں شمال یا شمال ومغرب کی جانب سے ہندوستان میں آکر اس کے باشندوں کو قتل یا پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہو کر خود ہندوستان پر قابض اور متصرف ہو گئے اور یہی لوگ ہندو کہلاتے ہیں اور انھوں نے ہی ہندوستان کو سارے عالم میں ایک نامور ملک بنا دیا، جب ایرانیوں نے پنجاب کا ایک حصہ فتح کر لیا تو انہوں نے قدیم ہندوستانیوں کو ہندو کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا اور صدیوں تک اپنے آپ کو ہندو کہلانے سے گریز کرتا رہا، لیکن ایرانی، خراسانی اور بابلی ان کو از راہ طنز اور پتہ ہندو کا باشندہ بن جانے کے اعتبار سے بھی ہندو ہی کے لفظ سے یاد کرتے رہے اور جب متعدد جماعتیں اسی طرح شمالی ومغربی ملک سے فاتحانہ انداز میں ہندوستان آتی رہیں اور ہندوستان میں پہلے سے موجود آریوں سے گھل مل گئیں، اس طرح پنجاب وسندھ کا علاقہ پورے طور پر ایران کا ایک حصہ بن گیا تو عام طور پر ہندوستان کے رہنے والوں پر لفظ ہندو استعمال ہونے لگا اور اس کے بعد والوں نے بخوشی خود کو ہندو کہنا شروع کر دیا اور اب تو ہندو کہلانے پر فخر محسوس کرنے کو کہا جا رہا ہے جیسا کہ لالہ ہردیال نے انگلستان میں منعقد ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا سینہ ''ہندو'' کہلانے پر از راہ فخر ابھر جانا چاہیے (کچھ ہندومت کے بارے میں)

اقتصادی حالت:۔ ویدوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ہندو

مذہب کی اقتصادی حالت کاشتکاری اور بیلوں اور گایوں کی رکھوالی پر منحصر تھی اور اسی شوق زراعت نے اس قوم کو دنیا کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا اور یہی وجہ ہے کہ رگ وید میں جا بجا کاشتکاری کے ذکر ملتے ہیں۔ کہیں پر کسانوں کو ہل کے ''پھال'' درست کرنے کو کہا جا رہا ہے تو کہیں بیجوں کے خراب نہ ہونے کی التجا برہسپتی سے کی جا رہی ہے جیسا کہ (کچھ ہندومت کے بارے میں صفحہ ۱۲ میں)

ذکر ہے کہ یجر وید، ۱۲ ادھیائے منترا ۷ میں ہے کہ ''اے کسانو! تم اناج وغیرہ بونے کے لیے زمین کو پھاڑنے والا جو ''پھال'' ہے اور اس پھال کو مضبوط کرنے کے لیے اس کے پیچھے جو لکڑی کی خوبصورت پٹی لگی ہوئی ہے اس سے اناج پیدا کرنے والی زمین کو پھاڑو، اسی طرح تم اپنے رتھوں کو چلاؤ اور اپنی حفاظت کرو'' دوسری جگہ اسی وید اور اسی ادھیائے میں ہے کہ ''اے انسانو! تم ہلوں کو جوئے میں لگا کر کھیتی کی خاطر زمین کو اچھی طرح جوتو، اس کو اچھی طرح جوت کر اس میں اناج وغیرہ بوؤ جو محنت کرنے والے کاشتکار ہیں ان کو چاہئے کہ بیلوں کے ذریعہ ہل میں پھال لگا کر زمین کو جوتیں'' ان دونوں اقتباسات سے ان کے اقتصادی حالت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندو دھرم کا ابتدائی اقتصاد کھیتی باڑی پر منحصر تھا۔

اجتماعی حالت:۔ عہد ماضی سے ہی ہندو معاشرہ میں آپس میں حقارت ونفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور علمی بخل تو انتہائی درجے پر رقص کر رہا تھا جیسا کہ مولوی ابو الجلال صاحب ندوی (کچھ ہندومت کے بارے میں صفحہ ۲۵) میں فرماتے ہیں، ''برہمنوں کا علمی بخل مشہور ہے؛ وہ نہ صرف ملیچھوں اور راکشسوں سے اپنے علوم کو چھپاتے تھے بلکہ اگر ویدوں کے پاک اشلوک شدروں کے کانوں میں پڑ جائیں تو مذہباً ان میں سیسہ پلا دینے کا حکم تھا'' معاشرے میں ہر ایک قبیلے کی حیثیت الگ الگ تھی اور ہر ایک کے کام جدا جدا اور پرستش کے لئے بت بھی بٹے ہوئے تھے چنانچہ برہمن کی حیثیت معاشرے میں منھ کی طرح اور چھتری کی حیثیت سونڈ کی طرح ویش کی حیثیت پیٹ کی طرح اور شدروں کو پیر کی طرح سمجھا جاتا تھا اور اس کے ساتھ حیوانوں اور جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا جیسا کہ (کچھ ہندومت کے بارے میں صفحہ ۵) پر ہے ''شدر قوموں میں عموماً ہندوستان کے قدیم باشندے شامل ہیں جن میں سے ایک بڑے حصے کو ہندوؤں نے اپنی خدمت گزاری کے لئے ضروری سمجھ کر کچھ ادنی درجہ کی رعایتیں دیدی ہیں مثلاً کہاروں کو برتن اور کھانے کی چیزیں چھونے کی اجازت ہے اسی طرح حجاموں کو کچھ رعایات حاصل ہیں'' بلکہ عہد قریب میں چماروں، بھنگیوں اور کنجڑوں کو ہندو میں شامل بھی نہیں سمجھا جاتا تھا تو چہ جائے کہ ان کو مندروں میں پوجا کرنے کی اجازت ملتی چونکہ ہندوں کے درمیان اچھوت اور نچلے طبقے کو سماج میں دوسرے اقوام کے ساری حقوق دینے کی تحریک زوروں پر چلی ہوئی ہے تب سے اسے بھی ہندو میں شامل گردانا جا رہا ہے، اور اسی طرح معاشرے میں ان کے کام بھی آپس میں بٹے ہوئے ہیں برہمن اس کیلئے صرف چھ کام ہیں (۱) پڑھنا (۲) پڑھانا (۳) یگیہ کرنا (۴) قربانی کرانا (۵) دان دینا (۶) دان لینا، چھتری ان کے حق میں یہ چار کام ہیں، پڑھنا، دان دینا، لوگوں کی حفاظت کرنا اور یگیہ کرانا، ویش ان کے ذمے پانچ کام ہیں، کرشی کرنا، دان دینا، مویشی پالنا، پڑھنا اور سود پر روپیہ اٹھانا، شدر ان کے ذمہ صرف ایک ہی کام ہے اور وہ یہ ہے سب کی خدمت گزاری کرنا، اور یہ اپنی ان بٹواروں پر سختی سے پابند تھے کہ اگر کوئی شدر جس کا کام خدمت کرنا وید کے پاک اسلوک سن لے تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا دینے کا مذہبی حکم تھا، برہمن کی مکمل طور پر اجارہ داری تھی، اور مذہبی روایت کے نفاذ و تنسیخ کا سہرہ انہیں کے سر تھا یہی وجہ تھی کہ ہندو دھرم میں الگ الگ فرقے جنم لئے بقول ڈاکٹر رضی احمد کمال۔

ہندومت کی ایک بڑی خصوصیت، جو اسکی مقبولیت اور نشوونما کا بڑا سبب بنی وہ اس کی مختلف روایتوں کو اپنے افکار ورسومات میں سمو لینے کی صلاحیت تھی اس کے برخلاف برہمنی مت پر مکمل طور پر برہمنوں کی اجارہ داری تھی۔ سماج کے درمیانی اور نچلے طبقے نہ تو اس سے براہ راست استفادہ کر سکتے تھے اور نہ ہی برہمنی مت کو ان کی مذہبی ضرورتوں سے کوئی دلچسپی تھی''

اور اسی طرح ان کے معاشرے میں ناموں کے الفاظ بھی بٹے ہوئے تھے او وقت پیدائش سے ہی اس کے کچھ ایسے نام رکھے جاتے، جو اس کی ذات کی عکاسی کرتا، مثلاً برھمن کے نام ہوتے، منگل واچک

شرا، چھتری کے نام رکھے جاتے، بل وا چک سنگھ (طاقت والا) اور ویش اپنے نام رکھتے دھن وا چک اور گیتا اگروال دلت اور شدروں کے عموماً کالی داس (سیاہ غلام) جیسے نام ہوتے اور یہ تقسیم صرف ناموں اور کاموں تک محدود نہ تھی بلکہ روزمرہ کے ہر پیش آنے والے چیزوں میں بھی پایا جاتی تھی مثلاً سمتوں جانوروں پرندوں میں سے ہر ایک کا مرجے اور منزلت کے اعتبار سے اختصاص ہوتا اتر دیشا برہمن کے لئے تو جنوب شدر کے لئے پورب چھتری کے لئے تو مغرب دلت کے لئے ہوتا تھا اسی طرح چھتری کے لئے گھوڑا تو برہمن کے لئے گائے ہوتی بل ویش کے لئے تو کتا اور سور شدر کے لئے تھا پرندوں میں ہنس برہمن کے لئے تو باز چھتری کے لئے تھا کبوتر ویش کے لئے تو کوا گدھ شدر کا نصیبہ تھا الغرض ساری چیزوں میں اپنی من مانی اور مرضی کے اعتبار سے تقسیمیں ہوتی تھیں جس سے سماج کے نحیف و ناتواں کا کوئی سہارا اور آرام کی زندگی گزارنے کا حق میسر نہ تھا۔

ہندو ادب:۔ ہندوازم ہندوستان کا ایک قدیم مذہب ہے لہٰذا اس قدیم مذہبی روایات کو دو حصے میں بانٹا جاسکتا ہے برہمنی مت اور ہندومت۔

برہمنی مت کا مطلب یہ ہے کہ وہ قدیم روایات و ادب جو آریوں کے ہندوستان میں آمد کے بعد ظہور پذیر ہوا یعنی (تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح) سے لے کر ہندوستان میں جین مذہب اور بدھ مذہب کے عام اشاعت تک رہا یعنی (تقریباً ۴۰۰ قبل مسیح) اور اس مذہبی روایت کو وید مت اور ویدک ادب سے بھی پکارا جاتا ہے اور اس میں برہمن کو کلیدی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ برہمنوں کی وہ ذات ہے جس کی بنا پر اس کی ہندوستان میں نشونما ہوئی ہے برہمنوں نے آریائی مذہبی روایت کی پاسداری کرکے اس میں اپنا اثر بنائے رکھا گرچہ برہمنی روایات میں گاہ بگاہے تبدیلیاں ہوتی رہیں پھر بھی اس میں اپنا ویدک رنگ جانے نہ دیا اور برہمنیت میں جو کچھ بھی ادب وجود میں آیا وہ سارا کے سارا ویدک ادب میں شامل ہے برہمنی مت اور ہندومت میں وید کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اسے ''شرتی'' یعنی الہامی ادب کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ مذہبی حقائق کسی انسان کی تخلیق نہیں ہیں اور اس کے انکار کرنے والے کو ''ناستک'' یعنی کافر کہا جاتا ہے جیسا کہ (کچھ ہندومت کے بارے میں صفحہ ۲۷) میں ابوالجلال ندوی رقم طراز ہیں آریہ سماجیوں کے علاوہ سناتن دھرم کے پنڈتوں کا خیال ہے کہ ایشور نے، انسانی شکل میں سب سے پہلے برہماجی کے اندر ظہور فر مایا'' برہماجی کے مکھ (منھ) سے چار شبد (لفظ) یہی چار شبد چار وید ہیں''

پھر ویدک ادب کی کئی قسمیں کی جاتی ہے۔ گرچہ تمام ویدوں کو ادب مقدس ''شرتی'' ہونے کا درجہ حاصل ہے پھر بھی وید مقدس کو مختلف بنیادوں پر کئی قسموں میں بانٹا جاتا ہے ایک تقسیم زمانہ تصنیف کے اعتبار سے کیا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر رضی احمد کمال اپنی کتاب ''ہندوستانی مذاہب'' کے اندر صفحہ ۱۲ میں فرماتے ہیں ''ایک تقسیم ویدک ادب کی اس کے حصوں کے زمانہ تصنیف اور ان کے موضوع کی بنیاد پر کی گئی ہے، جو قدیم آریائی دیوی دیوتاؤں کی شان میں کہے گئے بھجن اور گیتوں کا مجموعہ ہے، اور اس کے بعد والے ویدک ادب کو برہمن کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ تصانیف زیادہ تر مذہبی رسومات، آداب زندگی اور قربانی وغیرہ سے متعلق ہیں برہمن تصانیف کے آخری دور میں ویدک ادب کی ایک تیسری قسم کی ابتدا ملتی ہے، جسے آرنکا کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ اپنے موضوع اور مذہبی فکر کے لحاظ سے پہلی دونوں قسموں سے مختلف ہے ویدک ادب کی چوتھی قسم کو ''اپنشد'' کہا جاتا ہے اور یہ ویدانت کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کیوں کہ یہ ویدک ادب کا آخری حصہ ہے یعنی اس پر ویدک کا انت ہوتا ہے اسی لئے اس کو ویدانت کہتے ہیں''

ویدک ادب کی ایک دوسری تقسیم جو کافی مشہور و معروف ہے اور وہ یہ ہیں (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجر وید (۴) اتھر وید۔

رگ وید یہ ہندوازم کی سب سے پرانی کتاب ہے اور یہ رزمیہ اشعار میں مربوط ہے اور اس کی قدامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ فن تحریر کا ایجاد رگ وید کے وجود کے صدیوں بعد ہوا ہے۔

رگ وید کے زمانے کی تعین میں کافی اختلاف ہے ہاسک نے اس کی شرح ۷۰۰ ق م لکھی لیکن تاریخ صحیح تعین نہ ہوسکا ہے کسی نے ۵۰۰۰ ، ۷ ، تو کسی نے ۵۰۰۰۰، ۱۸۰۰۰، ۶۵۰۰، ۴۷۰۰، ۳۰۰۰، ۲۵۰۰، ۱۵۰۰ اور کسی نے ۱۰۰۰ سال قبل مسیح بتایا ہے لیکن مؤرخین اور سنسکرت دانوں کے اقوال میں غور و فکر کرنے سے رگ وید کو

۱۵۰۰ سے ۱۰۰۰۰ قبل مسیح کی تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ مولوی بدرالحسن کچھ ہندومت کے بارے میں، صفحہ ۱۱ میں فرماتے ہیں۔

''سب سے زیادہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کا زمانہ ۵۰۰ ق م کے قریب ختم ہوا، اور رگ وید دس حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ۲ سے ۷ تک کے حصے کو تو قدیم سمجھا جاتا ہے لیکن آٹھویں حصے کی زیادہ حیثیت نہیں ہے اور نواں، دسواں، اور پہلا حصہ یہ بہت بعد کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان تینوں حصوں میں خصوصاً دسویں حصے میں فلسفیانہ مضامین ہیں جو اوروں میں نہیں ہے۔

رگ وید میں ۱۰ منڈل ۱۰۲۸ گیت ہے اور یہ برہمنی مت کے لیے ایک اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔

سام وید اس میں زیادہ تر رگ وید ہی کے بھجن ہیں جو قربانی کے لئے مختص ہیں اور اس میں ۱۵۴۹ وید منتر ہیں۔

یجر وید میں بھی کچھ اضافے کے ساتھ رگ وید ہی کے گیت شامل ہے اور اس کا زمانہ رگ وید کے بعد کا ہے اور اس میں ۴۰ ادھیائے ہیں۔

اتھر وید یہ ویدک ادب اپنی نوعیت اور مضامین کے لحاظ سے تینوں سے جداگانہ حیثیت کا مل ہے اور یہ سب سے بعد کی تصنیف ہے اسی وجہ سے اس کو بہت دنوں تک وید میں شامل نہیں مانا گیا کیونکہ اس کے اندر انسانی رجحانات معلوم ہوتے ہیں اور یہ اس دور میں تصنیف ہوا جب آریوں نے محکوم قوم کو اپنے مذہب وتمدن سے ملانے کے لیے ان کے رسوم مذہبی ومعاشرتی کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

اتھر وید میں ۵۸۴۱ منتر اور بعض کے نزدیک ۱۳۱۷ منتر اور تقریباً ۶۰۰ پدھ ہیں۔

سمرتی ادب:۔ اپنشد ادب کے بعد کی تصانیف جس کو برہمن مت کی مقدس کتابیں تو کہی جاتی ہیں جیسے مہابھارت، رامائن وغیرہ لیکن اسے ادب شرتی نہیں مانا جاتا کیونکہ یہ وید میں شامل نہیں ہے اور یہ انسانوں کی تخلیق سمجھی جاتی ہے الغرض اپنشد کے ساتھ ہی ویدک کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو ادب تصنیف ہوا عظمت ووقار میں وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو ویدک ادب یعنی ''شرتی'' کو ہے اس مختصر سے جائزے سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس مذہبی روایت میں ایک تدریجی ارتقاء ہے جو ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۰۰ قبل مسیح تک زمانہ رہا اور اس ہزار سالہ فکری سفر میں ایک مخصوص قسم کا ادب وجود میں آیا جو بعد میں ہندو روایتوں کے گوناگوں مظاہر کی بنیاد ٹھہرا۔

۵۰۰ قبل مسیح کے قریب ویدک ادب کا دور ختم ہونے سے لے کر ۴۰۰ عیسوی تک کے دور کو رزمیہ دور سمرتی ادب دور کہا جاتا ہے یہ دور اپنی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی خصوصیات کے اعتبار سے ویدک دور سے نرالا نظر آتا ہے اور اس سے آریائی سماج اور بدلی ہوئی برہمن روایات کا وجود ملتا ہے جانکاری کے لیے رزمیہ نظموں سے مربوط مہابھارت اور رمائن کا مطالعہ بیش قیمتی موتی ثابت ہوگا۔

مہابھارت:۔ یہ مختلف قسم کی تصنیف ہے جو سنسکرت میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ طویل نظم اپنے دور کی بھرپور منظر کشی کرتا ہے اس نظم کا مرکزی قصہ راجا بھرت کے اخلاق کوروں اور پانڈوں کے درمیان تخت نشین کی جنگ کے متعلق ہے اس کے علاوہ اس کتاب میں بہت سی غیر ضروری روایات قصے اور واقعات بھی موجود ہے۔ یہ نظم قدیم ہندوستان کی معلومات کا ایک دستاویز ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مرکزی واقعہ میں بھی زیادتی ہوتی رہی اور ہندوستان کے بہت سے رائج قصوں کو بھی اس میں جگہ ملتی رہی اس طرح یہ ایک لاکھ اشعار کا مجموعہ بن گیا۔

رامائن:۔ رامائن بھی ایک منظوم کتاب ہے جس میں رام چندرجی اور ان سے متعلق لوگوں کے بارے میں ایک مربوط قصہ ہے۔ مہابھارت کے مقابلے میں رامائن ایک ترقی یافتہ جدید معاشرے کی عکاسی کرتی ہے بقول ڈاکٹر رضی احمد کمال۔ ''مہابھارت کے مقابلے میں یہ زیادہ ترقی یافتہ، مہذب اور بااخلاق معاشرہ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ رامائن کے مرکزی واقعات مہابھارت کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عام طور پر رامائن کو مہابھارت کے مقابلے میں زیادہ قدیم تصور کیا جاتا ہے''

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے، رامائن اور مہابھارت ہندو ادب کے قدیم زبردست شاہکار ہیں اور غیر معتبر ہیں جیسا کہ سبطین احمد صاحب بدایوں (کچھ ہندومت کے بارے میں صفحہ ۹۴) میں لکھتے ہیں۔

''رامائن اور مہابھارت ہند کے ادب قدیم کے دو زبردست شاہکار

ہیں، بہت سے دماغ ان کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو چکے ہیں مگر وہ نقاد جو تاریخی تحقیق کے مقصد سے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہمیشہ مایوس رہے ہیں نہ تو اب تک ان کا زمانہ تصنیف معین کیا جاسکا ہے نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے بیانات میں کہاں تک اصلیت موجود ہے اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں بعد میں آنے والوں کی تحریف سے محفوظ نہیں رہی ہیں"۔

اور اس پر بس نہیں ہے کہ اس کی اصلیت کا پتا نہ چل سکا ہے بلکہ اس کتاب کے ہیرو رام چندر جی جس کے بارے میں ہندو کا عقیدہ ہے کہ یہ ایشور کا اوتار ہے اسے مؤرخوں نے بادشاہ مصر خیال کیا ہے اور اس کو مصری قصہ قرار دیا ہے جیسا کہ موصوف (صفحہ ۹۵ پر) رقم طراز ہوتے ہیں۔

"مورخ کا قلم جذبات کا احترام کیوں کرے کتاب زیر بحث رامائن کے افسانے کو ایک مصری فرعون کا قصہ بتاتی ہے، یہ نسبت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے، کہاں مصر اور کہاں ہندوستان کا یہ فصیل بندر منہ پھر تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بعد مکانی اور بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس نسبت کو سن کر پہلے تو لبوں پر تبسم پیدا ہوتا ہے، جو کسی مجذوب یا دیوانہ کی باتوں پر آیا کرتا ہے، لیکن مطالعہ کے بعد استہزاء استعجاب سے بدل جاتا ہے" البتہ مہابھارت اور رامائن اس وقت، سب سے قدیم اور اہم ماخذ ہیں جن میں ہندومت کے اہم فرقوں مثلاً وشنومت، شیومت اور شکتی مت کے علاوہ دیگر بہت سے دیوی اور دیوتاؤں کے واضح اور بھرپور تذکرے ملتے ہیں۔

مہابھارت ہی کا ایک مشہور معروف حصہ جو بھگوت گیتا کے نام سے جانا جاتا ہے، جو شری کرشن کے بیان کے پیرائے میں لکھی گئی ہے، یوں تو گیتا کو الہامی درجہ حاصل نہیں ہے مگر عملی اعتبار سے اس کو ویدوں سے کم تسلیم نہیں کیا جاتا ہے ویدک دور کے برعکس، جس میں کائنات کی فطری قوتوں سے متعلق مختلف دیوی دیوتا اہمیت رکھتے ہیں جیسے مولوی بدرالحسن (کچھ ہندومت کے بارے میں) کچھ یوں فرماتے ہیں۔

"رگ وید کے گیتوں میں مختلف دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے، معمولی دیوتاؤں کو چھوڑ کر رگ وید میں تقریباً ۳۳ دیوتاؤں کا ذکر ہے... ان میں سے پہلا دیوتا دیاؤس ہے... آسمان بھی ایک دیوتا ہو گیا... وارن پہلے تو آسمان تھا پھر آسمان کا دیوتا بن گیا اور اس طرح وہ جملہ کرشمہ ہائے قدرت میں جلوہ گر نظر آنے لگا" لیکن مہابھارت میں اور رامائن میں کچھ نئے دیوی، دیوتا مذہبی زندگی پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے برہما، شیو، وشنو اور ایک دیوی ماں بہت ہی اہمیت رکھتے ہیں۔

برہما، وشنو اور شیو کو، ترمورتی، کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، برہما اور وشنو گرچہ ویدک ادب میں مذکور ہیں لیکن رزمیہ دور میں ان کی حیثیت میں نمایاں طور پر تبدیلی ہوئی ہے، جہاں پر ویدک ادب میں برہما کو سب سے عظیم اوتار کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے وہیں پر مہابھارت اور رامائن میں اس کی حیثیت صرف ایک خالق کائنات کی ہے وشنو اور شیو کے مقابلے میں برہما اپنا مقام لگاتار کھوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ عوام کے مرکز عقیدت اور مذہبی عظمت کے اصل حق دار وشنو اور شیو جی بن کر رہ جاتے ہیں۔

ترمورتی کے تصور میں اگر برہما خالق کائنات ہے تو وشنو کے سر پر کائنات کی بقا اور پرورش کی ذمہ داری ہے۔ شیو اپنے صفات میں وشنو سے کافی مختلف ہے، وشنو کی شخصیت میں اگر جمال کا پہلو غالب ہے تو شیو، الوہی طاقت کے قہر و جلال کا مجسمہ ہے وشنو اگر اپنی ہمدردانہ صفات سے دلوں کی تسلی کا باعث بنتا ہے تو شیو اپنی بے نیازی اور جلال سے دلوں کو دہلا کر لوگوں کے سروں کو اپنے آگے خم کرا لیتا ہے۔

ہندومت:- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رزمیہ نظموں کے ابھرتے ہوئے دیوتا، وشنو، شیو اور دیوی ماں نے ہندومت کے عظیم ترین دیوتاؤں کی حیثیت حاصل کر لی، اور برہما جی پس منظر میں چلے گئے۔

عہد وسطی کی تاریخ دراصل انہیں دیوتاؤں سے وابستہ فرقوں کی نشو و نما کی داستان ہے۔ اسی لئے رزمیہ نظموں کے بعد کے ابھرنے والے مذہب کو نیا ہندومت، یا فرقہ بندیوں کا "ہندومت" کہا جاتا ہے۔ اور ویدک یا برہمنی مت رسومات میں قربانی کو جو مرکزیت حاصل تھی وہ نئے ہندومت میں ختم ہو گیا بلکہ وشنومت نے تو اس کی زبردست طریقے سے مخالفت کی اور اس کی جگہ پوجا نے مرکزی مقام حاصل کر لیا۔ نئے ہندومت میں ایک خاص بات تھی جو اس کی قبولیت کا ذریعہ بنا، اور وہ یہ ہے کہ مختلف روایتوں کے افکار و نظریات کو اپنے اندر جگہ دینے کی صلاحیت تھی، اس کے برعکس "برہمنی مت" اس کا تعلق سماج

کے اعلی طبقوں سے تھا، اوراس میں برہمنوں کی مکمل طور پر اجارہ داری تھی اوراس نچلے طبقے والے نہ تو براہ راست مستفید ہو سکتے تھے اور نہ ہی برہمنی مت کو ان کے مذہبی احساسات سے کوئی دلچسپی تھی جین اور بدھ دھرم نے جب ہندوستان میں تبلیغ واشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے اپنا مرکز ان طبقوں کو بنایا جن کی سماج میں کوئی حیثیت ووقعت نہ تھی جنہیں برہمنی مت ذلیل وکمتر خیال کرتا تھا۔ لہذا گوتم بدھ نے جب مساوات کا نعرہ بلند کیا، حقیر وناتواں کو گلے لگانا شروع کیا تو لوگ جوق درجوق ان کے چرنوں میں پناہ ڈھونڈ نے لگے اور مختصر سے عرصے میں بدھ مذہب ہندوستانیوں کا اپنا پسندیدہ اور ہر دلعزیز مذہب بن گیا، ویدک دھرم ایک بے نور چراغ بن گیا تھا، بدھ اور جین مذہب سے محصور برہمنی مت آخر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہندوستان میں مقبولیت اب اسی حالت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ اس کی بقاد نشو ونما ایک عوامی شکل اختیار کرلے۔

ہندومت میں شمولیت کے لیے کسی طرح کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی ہر کوئی ہندومت میں بلا چوں وچرا داخل ہو سکتا تھا چاہے وہ سماج کے جس طبقے اور ذات کی جس نوعیت سے بھی تعلق رکھتا ہو، جب کہ برہمنی مت کا تعلق براہ راست سماج اور نچلے طبقے سے تھا اور اس طرح ہندومت میں تمام طبقات کے لوگ شامل ہونے لگے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندومت کا ارتقاء برہمنی مت کے عوامی رنگ اختیار کرنے کی ہی کوشش کا نتیجہ تھا۔

ہندومت کے فرقوں پر ایک نظر:۔ ہندومت کا عوامی رنگ اختیار کرنے کے ساتھ ہی ہندومت عہد وسطی تک پوری طرح فرقوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور یہ تقسیم اچانک نہیں تھی، بلکہ رزمیہ نظموں کے عہد سے ہی اس کی شروعات اور تخم ریزی ہو چکی تھی، برہما، وشنو اور مہیش جنہیں ترمورتی کہا جاتا ہے کہ ساتھ ساتھ ایک دیوی ماں بھی منظر عام پر آ کر غیر معمولی مقبولیت کی حامل بنیں، جب کہ برہما عوام کے دلوں کو مسخر کرنے مین پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ تمام کے ناموں پر ہندومت میں ایک ایک فرقہ منصہ شہود پر آیا جیسا کہ ڈاکٹر رضی احمد کمال (ہندوستانی مذاہب، ایک مطالعہ صفحہ ۹) میں فرماتے ہیں "سوائے برہما کے مندرجہ بالا سبھی دیوتاؤں کے نام پر ہندومت میں فرقے وجود میں آئے"۔

شیومت:۔ شیو، کو ہندوستان کے قدیم ترین اوتاروں میں خیال کیا جاتا ہے، اور ویدک ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آریہ اپنے ساتھ ہندوستان میں ایک ایسے دیوتا کا تصور لے کر آئے تھے جس کی خصوصیات ہندوستانی دیوتا سے میل کھاتی ہے جو "رُدر" کے نام سے مشہور تھا جیسا کہ مولوی بدر الحسن (کچھ ہندومت کے بارے میں، صفحہ ۱۶ میں) لکھتے ہیں "ان کے علاوہ شیو بھی اس وقت بڑا دیوتا شمار کیا جاتا تھا، اس وقت اس کا نام "رُدرتھا" زمانے کے نہوض وانحطاط کے ساتھ ساتھ آریوں اور ہندوستان کے قدیم باشندوں نے محسوس کیا کہ "رُدر" اور شیو ایک ہی ذات کے دو نام ہیں شیو کے پرستاروں نے 'پران' کی تصنیف کے وقت شیو اور شیومت کے افکار ونظریات میں چار چاند لگا دیا، اور پران میں اس کی مہابھارت کے متضاد صفت بیان کی جیسا کہ ڈاکٹر رضی احمد کمال (ہندوستانی مذاہب، ایک مطالعہ صفحہ ۲۴) میں لکھتے ہیں۔

"ایک طرف وہ ترمورتی، میں کائنات کو فنا کرنے والا، اس کی بربادی کا ذمہ دار دیوتا تصور کیا جاتا ہے دوسری طرف متعدد تذکروں میں اس کی پاکیزگی، تقدس اور ذاتی حسن وجمال کی قسم کھائی گئی ہے، اسے اپنے بھگتوں کی مرادیں پوری کرنے والا سمجھا جاتا ہے، ایک طرف اس کو جلال وغضب سے بھرا ہوا دیوتا مانا جاتا ہے تو دوسری طرف اسے ایک نرم مزاج دیوتا بھی سمجھا گیا ہے، جسے خوش کرنے کے لیے تلسی کے چند پتوں کا نذرانہ ہی کافی ہے" شیو کے مختلف صفات سے متصف ہونے کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ہندومت میں اس کی آٹھ مستند صورتیں ہیں اور ہر ایک کی پرستش مختلف اوقات اور مختلف قبائل میں ہوتی ہے۔

ویشنومت:۔ ابتدائی ویدک ادب میں وشنو ایک کمتر درجے کا دیوتا رہتا ہے مگر ویدعہد کے آخر تک وہ خدائے مطلق کا مقام حاصل کر لیتا ہے، وشنو کو سب سے زیادہ اس وقت شہرت ملی جب اسے کرشن واسودیو کی شخصیت سے ملا دیا۔ اور اس عرف ویشنومت کو کرشن پرستی کا مذہب بن کر خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا دسویں صدی عیسوی اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان جنوبی ہند میں ویشنومت کے ایسے مفکرین پیدا ہوئے جن کے ذریعہ ویشنومت کو کافی فروغ ملا جس میں رامائن آچاریہ اور مادھو اچاریہ بہت مشہور ہیں، چودہویں صدی میں

راما نند اور ان کے شاگردوں سے متعلق سنتوں نے جیسے روی داس، کبیر داس، تلسی داس، میرابائی اور نام دیو نے ویشنوں مت کو ہندومت کا غالب ترین فرقہ بنادیا۔

دیوی مت:۔ شیو کی طرح ہندوستان کے قدیم عقائد میں دیوی کا بھی تصور تھا کیونکہ ہندوستانی تہذیب کے آثار کی کھدائی میں شیو کی مورتی کے ساتھ ایک دیوی کی بھی مورتی ملی تھی، جن کو دیوی صورت میں حقیقت الٰہیہ کا مظہر تصور کیا جاتا تھا، اور مہابھارت میں دیوی کا تذکرہ درگا کی حیثیت سے ملتا ہے دیوی ماں حقیقت اعلیٰ کے مظہر کی حیثیت سے کالی اور درگا کی حیثیتوں میں زیادہ پوجی جاتی ہے، مختصر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ موجودہ ہندؤں کا اب ویدوں اور مذہبی کتابوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہے کسی کی کرامت، شرافت، چمک، دمک دیکھ کر سجدہ ریز ہوجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندؤں کے تینتیس کرور معبود اسی وقت تھے جب تینتیس کرور ہندو بھی نہ تھے۔

بندے نہیں ہیں جتنے اتنے خدا ہیں ان کے
کس کس خدا کے واسطے سجدہ کرے کوئی

ہندوں کے اوتار:۔ اوتار کا لغوی معنی اترنا ہے اور اصطلاح میں ایشور کا خود کسی صورت میں زمین پر پیدا ہونے کا نام ہے بقول بھگوان داس (کچھ ہندومت کے بارے میں) ''خدا اپنے تئیں دنیا کے سامنے وقتاً فوقتاً مختلف قالبوں میں پیش کیا کرتا ہے''

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ایشور خود جنم نہیں لیتا بلکہ کسی مہاتما کو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرماتا ہے۔

اوتاروں کی ضرورت:۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان اوتاروں کی خود بخود آمد نہیں ہوتی ہے بلکہ اسی وقت ہوتی ہے، جب دنیا میں ان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ اوتار مختلف مقاصد کے پورا کرنے کے لیے مختلف حیثیات ومختلف مدارج وقوت کے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور یہ اوتار جس طرح نیکی کے ہوتے ہیں اسی طرح بدی کے بھی ہوتے ہیں مثلاً رام چندر نیکی کے اوتار تھے اور راون بدی کا تھا جب کسی علاقہ میں قانون شکنی اور بدامنی حد سے زائد ہوجاتی ہے تو وہاں قیام امن کے لیے خاص طور پر انتظام کرنا ہوتا ہے، اور تعزیری پولس وغیرہ زائد بھیجنی پڑتی ہے، اسی طرح جب دنیا میں بد اخلاقی حد سے تجاوز کرجاتی ہے تو اس کی اصلاح کے لیے خدا اپنے صفات میں سے کسی ایک صفت کو جسم انسان میں منتقل کرکے ہدایت کے لیے ارسال کرتا ہے اور وہی شخص اوتار کہلاتا ہے، بقول بالکش بترہ البرجی (ہندوؤں کے اوتار، دیباچہ): اگرچہ پرماتما اجنما اور امر ہے مگر یہ بات اس کو نہیں روک سکتی کیونکہ وہ پرکرتی کا مالک اور خالق کل ہے علاوہ ازیں بھکتوں کی زبردست پرارتھنا کہ بھگوان درشن دیجیے پرماتما کو مجبور کرتی ہے کہ کسی شکل کو قبول کرلے کیوں کہ بغیر اس کے وہ مدعا کسی طور پر پورا نہیں ہوسکتا، عالم الغیب اور قادر مطلق ہوتے ہوئے دنیا کی خرابیاں دور کرنے کے لیے وہ ایسے طریقے اختیار کرتا ہے''۔

عقائد ہندوازم:۔ وید کلام الٰہی ہے، اس کا منکر ناستک ہے، ہندو آواگون (تناسخ) کا قائل ہے، روح مرتی ہے، جو اچھے کام کرتے ہیں وہ اگلے جنم میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اور جو برے کام کرتے ہیں وہ کوا، کتا، سور پیدا ہوتے ہیں، جنت ودوزخ کا بھی تصور ہے، جہنم اٹھاسی ہزار ہیں، عالم تین ہیں، سفرلوک، ناگالوک، پاتال لوک (اعلیٰ اوسط، اسفل) گوشت کھانا واجب ہے جو نہیں کھاتا ہے وہ ۲۱ جنم تک جانور پیدا ہوگا، وہ نرک میں جائے گا، اس کے سارے اعمال برباد کردیے جائیں گے۔

ہندو دھرم میں عقیدۂ توحید:۔ گرونانک کا نظریہ ہے کہ خدا ایک ہے ازلی ہے، ابدی ہے ویکا نند نے کا کہا خدا بغیر شکل کے ہے، کبیر داس نے کہا: کرتا، بھرتا، سہرتا، خدا کے لیے تہو خوبیاں میں وہی خالق، پروردگار، موت کا مالک اس کی خدائی میں کوئی شریک نہیں۔

اور آخر میں ہندو مفکرین اور مذہبی علماء کے ایک طویل مدتی قبول شدہ اجماع کے ذریعہ تسلیم کرلیا گیا قول ''کہ انسانی زندگی کے یہ چار مقاصد انسان زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں'' پیش خدمت ہے:

(۱) دھرم اصولوں پر مبنی انفرادی اور اجتماعی زندگی

(۲) ارتھ (دولت اور طاقت کا حصول)

(۳) موکش (کرم اور آواگون کے پھندے سے نجات اور ابدی مسرت کا حصول) ان میں سے آخری یعنی موکش کو زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین ہونے کا درجہ حاصل ہے۔☆☆☆

☆ مقالہ نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے طالب علم ہیں

امام احمد رضا بحیثیت مفسر

مولانا محمد شمیم احمد نظامی☆

اس خاکدان گیتی پر نہ جانے کتنے بندگان خداتشریف لائے اور قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا ان میں سے کتنوں کو تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا اور ان کے کارنامے وخدمات کو سنہرے الفاظ میں یاد کیا جب کہ دوسری طرف بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو تاریخ نے پس پشت ڈال دیا اور ان کا نام ونشان تک نہ رہا۔ عصر حاضر میں ایسی ہی ایک تاریخی اور انقلابی شخصیت ہماری نگاہوں سے گزری جو یکتائے روزگار تھی۔ جن کی خدمات امت مسلمہ کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ جس کو دنیائے اہل سنت وجماعت احمد رضا کے نام سے جانتی ہے۔

تفسیر کا لغوی معنی: تفسیر کے موضوع پر لکھی گئی ایک اہم کتاب "الاتقان" ہے جو علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی گراں قدر اور مشہور تصنیف ہے۔ اس میں تفسیر کا لغوی معنی "کشف وبیان" بتلایا گیا ہے اور اس کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں علماء ومحققین اسلام کے متعدد اقوال پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً امام ماتریدی نے تفسیر کی تعریف یہ فرمائی ہے۔

اصطلاحی تعریف: اس بات کا یقین کہ لفظ سے یہی مراد ہے۔ اور اس بات کی اللہ کے لئے گواہی بھی کہ اس لفظ سے اس کی یہی مراد ہے ۔ پھر اگر اس معنی مراد کے لئے کوئی دلیل قطعی مل جائے تو وہ تفسیر صحیح ہے ورنہ تفسیر بالرای ہے، جو ممنوع ہے (الاتقان فی علوم القرآن جلد دوم ص ۱۲۱)

(۲) ابو طالب ثعلبی تفسیر کی اس طرح تعریف کرتے ہیں ۔ وضع لفظ کا بیان حقیقتاً یا مجازاً ہو جیسے صراط کی تفسیر طریق (راستہ) اور صیب کی مطر (بارش) سے کی جائے (الاتقان فی علوم القرآن جلد دوم ص ۲۲۱)

(۳) امام احمد اصبہانی نے تفسیر کی یوں تعریف فرمائی ہے۔ عرف علماء میں کشف معانی قرآن اور بیان مراد کو کہتے ہیں (الاتقان فی علوم قرآن جزء دوم ص ۲۲۲)

(۴) ایک گروہ علماء کے نزدیک تفسیر کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔ آیات کے نزول، ان کے حالات وواقعات اور اسباب نزول، نیز ترتیب مکی ومدنی، محکم ومتشابہ، ناسخ ومنسوخ، خاص وعام، مطلق ومقید، مجمل ومفسر، حلال وحرام، وعد و وعید، امر ونہی اور نصائح اور امثال کا علم ۔ (الاتقان جزء دوم ۲۲۲)

ان تعریفات کا خلاصہ یہ ہوگا کہ علم تفسیر: ایسے معانی ومطالب کا بقدر طاقت بشری اظہار وبیان ہے جو اللہ رب العزت کے مراد کی طرف رہنمائی کرے۔

مفسر کے لیے چار شرطیں ہیں: ۔ علامہ محمد حسین الذہبی صاحب "التفسیر والمفسرون" فرماتے ہیں۔ مفسر کے لیے چار شرطیں ہیں۔ أولا: أن تكون الترجمة على شريطة التفسير، لايعول عليها إلا إذا كانت مستمدة من الأحاديث النبوية، وعلوم اللغة العربية، والأصول المقررة في الشريعة الإسلامية، فلا بد للمترجم من اعتماده في استحضار معنى الأصل على تفسير عربي مستمد من ذلک، أما إذا استقل برأيه في استحضار معنى القرآن أو اعتمد على تفسير ليس مستمداً من تلك الأصول، فلا تجوز ترجمته ولا يعتد بها، كما لايعتد بالتفسير إذا لم يكن مستمداً من تلك المناهل.

ترجمہ: پہلی شرط یہ ہے کہ ترجمہ تفسیر کی شرط پر ہو، مترجم صرف اسی ترجمہ پر اعتماد کرے جو احادیث نبویہ اور علوم لغت عربیہ اور شریعت اسلامیہ کے مقرر کردہ اصولوں سے ماخوذ ہو۔ مترجم کا اعتماد اصل معنی کے استحضار میں ایسی عربی تفسیر پر ضروری ہے جو اس سے ماخوذ ہو، رہا یہ معاملہ کہ جب قرآن کے معنی کے استحضار میں اپنی رائے میں مستقل ہے یا اس نے ایسی تفسیر پر اعتماد کیا ہے جو ان اصولوں سے ماخوذ نہیں، تو اس کا ترجمہ جائز نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کو ترجمہ شمار کیا جائے گا اسی طرح اس کی

تفسیر کو شمار نہیں کیا جائے گا جو ان اصول سے اخذ نہیں۔

ثانیا:أن یکون المترجم بعیداً عن المیل إلی عقیدة زائفة تخالف ماجاء به القرآن، وهذا شرط في المفسر أیضا، فإنه لو مال واحد منهما إلی عقیدة فاسدة لتسلطت علی تکفیره، فإذا بالمفسر وقد فسر طبقا لهواه، وإذا بالمترجم وقد ترجم وفقا لمیوله، وکلاهما یبعد بذلک عن القرآن وهداه.

ترجمہ: دوسری شرط یہ ہے کہ مترجم کھوٹے عقیدے کی طرف رجحان رکھنے سے دور ہو جو عقیدہ اس کی مخالفت کرے جس کو قرآن نے پیش کیا ہے۔ اور یہی شرط مفسر میں بھی ہے، کیونکہ اگر دونوں میں سے کوئی ایک فاسد عقیدے کی طرف مائل ہو گیا تو اس کی فکر پر فاسد عقیدہ غالب آجائے گا۔ پھر تو مفسر اپنی خواہش کے مطابق تفسیر کرے گا اور مترجم اپنے رجحان کے مطابق ترجمہ کرے گا، اور اس وجہ سے دونوں قرآن اور اس کی ہدایت سے دور رہیں گے۔

ثالثا:أن یکون المترجم عالما باللغتین: المترجم منها والمترجم إلیها، خبیرا بأسرارهما، یعلم جهة الوضع والأسلوب والدلالة لکل منهما.

ترجمہ: تیسری شرط یہ ہے کہ مترجم دونوں زبانوں کا عالم ہو جس سے ترجمہ کر رہا ہے اور جس کی طرف ترجمہ کر رہا ہے، دونوں زبان کے اسرار و رموز کا جاننے والا ہو، ان میں سے ہر ایک کے لئے دلالت و اسلوب اور وضع کی جہت کو جانتا ہو۔

رابعا:أن یکتب القرآن أولا، ثم یؤتی بعده بتفسیره، ثم یتبع هذا بترجمته التفسیریة حتی لایتوهم متوهم أن هذه الترجمة ترجمة حرفیة للقرآن.

هذه هي الشروط التي یجب مراعاتها لمن یرید أن یفسر القرآن بغیر لغته تفسیرا یسلم من کل نقد یوجه، وعیب یلتمس (المدخل المنیر ص ۱۴۱ إلی النهایة)

ترجمہ: چوتھی شرط یہ ہے کہ پہلے قرآن لکھا جائے، پھر اس کے بعد اس کی تفسیر لائی جائے، پھر ترجمہ تفسیر یہ کو اس کے تابع کرے تا کہ کوئی وہم کرنے والا یہ وہم نہ کرے کہ یہ ترجمہ قرآن کا ترجمہ حرفیہ ہے۔ یہ ایسی شروط ہیں جن کی رعایت کرنا اس شخص کے لئے ضروری ہے جو قرآن کی تفسیر اس کی زبان کے علاوہ میں کرنا چاہے ایسی تفسیر جو ہر نقد سے محفوظ رہے، اور ہر عیب سے پاک رہے۔

مذکورہ بالا شرائط اربعہ مفسر کے لیے ضروری ہیں۔ اور علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ ''الاتقان في علوم القرآن'' میں مفسر کے شرائط و آداب تحریر فرمائے ہیں۔ فرماتے ہیں ایک جماعت علماء کے نزدیک قرآن حکیم کی تفسیر اسی عالم دین کے لیے جائز ہوگی جو مندرجہ ذیل پندرہ علوم وفنون میں ماہر ہو۔

(۱) علم لغت (۲) علم نحو (۳) علم صرف (۴) علم اشتقاق (۵) علم معانی (۶) علم بیان (۷) علم بدیع (۸) علم قرأت (۹) اصول دین (۱۰) اصول فقہ (۱۱) اسباب نزول و قصص (۱۲) ناسخ و منسوخ (۱۳) قرآن کے مجمل اور مبہم کو بیان کرنے والی احادیث (۱۴) فقہ (۱۵) علم وہبی۔

فاضل بریلوی ان تمام علوم وفنون وشرائط کے جامع تھے اور فن تفسیر میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ آیئے ان کی کچھ شہرۂ آفاق تصانیف فی التفسیر کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ جن میں کنزالایمان کو عوام وخواص میں مقبولیت حاصل ہے اور مسلم امت بالخصوص اہل سنت و جماعت کے لیے عظیم نعمت ہے۔

کنزالایمان کا مطالعہ:۔ کنزالایمان مطالعہ تین طرح سے کریں گے (۱) ترجمہ میں قرآن شریف کے نصوص و مضمرات کی رعایت (۲) ترجمہ میں اختصار اور جامعیت (۳) شگفتہ زبان'' ترجمہ میں قرآن شریف کے نصوص و مضمرات کی رعایت'' کے رخ سے ہم کنزالایمان کا ایک علمی اور فکری جائزہ لیں۔ اسی عنوان پر نمونے کے طور پر چند مقامات کی نشاندہی کریں گے۔ اسی کے ساتھ کنزالایمان کا دوسرے تراجم کے ساتھ ایک تقابلی خاکہ پیش کریں گے تا کہ کنزالایمان کے فاضل مترجم کی فکری بصیرت، فن تفسیر میں رسوخ، ذہنی استحضار اور قرآن شریف کے نصوص و مضمرات اور اسلوب بیان پر ان کا گہرا مطالعہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

پہلا مقام: سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶ ملاحظہ فرمائیں۔ مولیٰ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''إن الذین کفروا سواء علیهم أ أنذرتهم أم لم تنذرهم لایؤمنون''۔

اس آیت کریمہ کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی نے یوں کیا ہے۔
'' بے شک جو کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کو ڈرایئے یا نہ

ڈرایئے وہ ایمان نہ لائیں گے" مولانا فتح جالندھری نے ترجمہ یوں کیا ہے۔" جولوگ کافر ہیں انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے وہ ایمان نہیں لانے کے"

نوٹ: ان دونوں ترجموں کا حاصل یہ ہے کہ کافروں تک کلمۂ حق کی دعوت پہنچائی جائے یا نہ پہنچائی جائے وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ان ترجموں پر کوئی بھی دشمن اسلام دوطرح کا اعتراض کرسکتا ہے۔اول :جب کافروں کے لیے نصیحت وانذار بالکل بے نتیجہ ہے تو پھر اسلام میں ایک تبلیغی نظام کا کیا مقصد ہے؟اور جب وہ حسب فرمان خداوندی ایمان ہی نہیں لائیں گے تو کافروں میں تبلیغ ودعوت کی اب کیا ضرورت ہے؟

دوسرا مقام: تحویل قبلہ کے سلسلے میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۳ ملاحظہ کریں۔

"وما جعلنا القبلة التي كنت عليها إلا لنعلم من يتبع الرسول ممن ينقلب على عقبيه".

ترجمہ اشرف علی تھانوی:

"اور جس (سمت) قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس لیے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹ جاتا ہے"

ترجمہ محمود الحسن: "اور نہیں کیا تھا مقرر ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع رہے گا رسول کا اور کون پھر جائے گا الٹے پاؤں"

ان دونوں ترجموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو معاذ اللہ مستقبل کا علم نہیں ہے۔کیونکہ ان ترجموں سے نہایت صراحت کے ساتھ یہ مفہوم نکلتا ہے کہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے سے پہلے خدا کو علم نہیں تھا کہ قبلہ بنا دیئے جانے کے بعد کون رسول کی پیروی کرے گا اور کون منحرف ہو جائے گا۔حالانکہ یہ سب کا عقیدہ ہے کہ عالم الغیب ہونے کی حیثیت سے اسے ہر ایسی شی اور بات کا علم ہے جو اب تک واقع نہیں ہوئی ہے۔ اور اسی کا نام علم غیب ہے۔

اعتراض: مذکورہ بالا دونوں ترجموں پر یہ اعتراض اس لیے وارد ہوتا ہے کہ یہ مترجمین حضرات نے لِنَعْلَمَ کا ترجمہ کرتے ہوئے اس نکتے کی طرف توجہ نہیں دی کہ خدا کے لیے کسی واقعہ کا علم اس کے واقع ہونے پر موقوف نہیں ہے۔پیروی کرنے والوں اور منحرف ہونے والوں کا علم اسے اس وقت بھی تھا جب کہ بیت المقدس قبلہ نہیں بنا تھا۔

اب آیئے امام احمد رضا فاضل بریلوی کا ایمان افروز ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔اور غور فرمایئے کہ خدا کے عالم الغیب ہونے کی صفت کو انہوں نے کس طرح ملحوظ رکھا ہے۔موصوف کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

"اے محبوب! تم پہلے جس قبلے پر تھے وہ اسی لیے ہم نے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے"

کتنا انصاف پسند ترجمہ ہے۔صرف ایک لفظ نے ترجمہ کو کتنا مؤدب اور باشرع بنا دیا۔اس ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ علم تو خدا کو پہلے ہی سے تھا کہ قبلہ بن جانے کے بعد کون حضور ﷺ کی اتباع کرے گا اور کون الٹے پاؤں پھر جائے گا۔لیکن قبلہ بن جانے کے بعد وہ دیکھنا بھی چاہتا ہے کہ کون تابعداری کرتا ہے اور کون منحرف ہوتا ہے۔یوں بھی کسی واقعہ کو دیکھنے کا مفہوم، واقعہ کے واقع ہونے پر ہی صادق آتا ہے لیکن کسی واقعہ کے ساتھ علم کا تعلق اس کے واقع ہونے سے پہلے بھی ہو سکتا ہے۔

دوسرا رخ:۔ واضح رہے کہ ہم کنز الایمان کا مطالعہ تین اعتبار سے کر رہے ہیں۔جس میں ایک جہت سے ہم نے مطالعہ کیا۔اب دوسرا رخ "ترجمہ میں اختصار و جامعیت" پیش خدمت ہے۔

اس سلسلے میں کنز الایمان سے ہم کچھ آیتوں کو پیش کریں گے جن میں امام احمد رضا فاضل بریلوی کے ترجمہ کے ساتھ مولانا تھانوی کے ترجمے کا بھی ایک تقابلی خاکہ پیش کریں گے تا کہ آپ اس آئینے میں امام احمد رضا کے خداداد ہنر کا جلوہ دیکھ سکیں۔

آیت (۱) " أولئک هم الخسرون " بقرہ/۲۷ تعداد حروف (۱۶)

ترجمہ ترجمۂ رضویہ: وہی نقصان میں ہیں۔تعداد حروف (۱۴)

ترجمۂ تھانویہ! پس یہی لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں۔تعداد حروف (۳۱)

آیت (۲) "وأولئک هم المهتدون" بقرہ/۱۵۷ تعداد حروف (۱۷)

ترجمہ رضویہ۔ اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔ تعداد حروف (۱۷)

ترجمہ تھانویہ۔ اور یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت تک رسائی ہوگئی۔

آیت (۳) "یـٰایها الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰة" بقرہ/۱۵۳ تعداد حروف (۳۸)

ترجمہ رضویہ۔ اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ تعداد حروف (۳۱)

ترجمہ تھانویہ۔ اے ایمان والو صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو۔ تعداد حروف (۳۱)

آیت (۴) "واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب" بقرہ/۲۱۲ تعداد حروف (۲۴)

ترجمۂ رضویہ۔ اور خدا جسے چاہے بے گنتی دے۔ تعداد حروف (۲۱)

ترجمۂ تھانویہ۔ اور رزق تو اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں بے اندازہ دیتے ہیں۔ تعداد حروف (۴۵)

آیت (۵) "واللہ یهدي من یشاء إلی صراط مستقیم" بقرہ/۲۱۳ تعداد حروف (۲۹)

ترجمہ رضویہ۔ اور اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھائے۔ تعداد حروف (۲۳)

ترجمہ تھانویہ۔ اور اللہ جس کو چاہتے ہیں راہ راست بتاتے ہیں۔ تعداد حروف (۳۵)

آیت (۶) "من ذا الذي یقرض اللہ قرضاً حسنا" بقرہ/۲۴۵ تعداد حروف (۲۴)

ترجمہ رضویہ۔ ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسن دے۔ تعداد حروف (۲۳)

ترجمہ تھانویہ۔ کون شخص ہے ایسا جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا۔ تعداد حروف (۴۶)

آیت (۷) "یـٰایها الذین آمنوا أنفقوا من طیبٰت ماکسبتم" بقرہ/۲۶۷ تعداد حروف (۳۷)

ترجمہ رضویہ۔ اے ایمان والوں اپنی پاک کمائیوں میں سے کچھ دو۔ تعداد حروف (۳۲)

ترجمہ تھانویہ۔ اے ایمان والو نیک کام میں خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے۔ تعداد حروف (۵۲)

آیت (۸) "ومن یؤت الحکمة فقد أوتي خیرا کثیرا" بقرہ/۲۶۹ تعداد حروف (۲۷)۔

ترجمہ رضویہ۔ جسے حکمت ملی اسے بہت بھلائی ملی۔ تعداد حروف (۲۴)

ترجمہ تھانویہ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔ تعداد حروف (۵۲)

آیت (۹) "قل فاتوا بالتوراة فاتلوها إن کنتم صادقین" آل عمران/۹۳۔ تعداد حروف (۳۴)

ترجمہ رضویہ۔ تم فرماؤ توریت لا کر پڑھو اگر تم سچے ہو تعداد حروف (۲۸)

ترجمہ تھانویہ۔ فرمادیجئے کہ پھر توریت لاؤ پھر اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ تعداد حروف (۴۱)

آیت (۱۰) "ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم من النساء إلا ماقد سلف" نساء/۲۲ تعداد حروف (۳۹)

ترجمہ رضویہ۔ اور باپ دادا کی منکوحہ سے نکاح نہ کرو جو گذرا گذرا۔ تعداد حروف (۴۳)

ترجمہ تھانویہ۔ اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ دادا نانا نے نکاح کیا ہو مگر جو بات گذر گئی گذر گئی۔ تعداد حروف (۷۸)

تیسرا رخ:۔ عزیز قاری! اختصار و جامعیت کے اعتبار سے بھی آپ نے فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیا اور تعبیر و زبان پر امام احمد رضا کو کتنی بے محابا قدرت ہے کہ کہیں کہیں عربی عبارت سے بھی اس کا اردو ترجمہ مختصر ہوگیا ہے اور تعبیر کا کمال ہے مفہوم کی وضاحت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

جب کہ تھانوی صاحب کا ترجمہ حشو و زوائد اور تعبیر کے بہت سے ونقائص پر مشتمل ہے۔ اب شگفتہ زبان کی حیثیت سے محاسن

کنزالایمان کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں (۱) سورۂ یونس آیت نمبر۲۴ ''حتی إذا أخذت الأرض زخرفها و ازینت وظن أهلها أنهم قدرون عليها أتها أمرنا.

ترجمہ۔ یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگار لے لیا اور خوب آراستہ ہوگئی اور اس کے مالک سمجھے کہ ہمارے بس میں آگئی تو اس پر ہمارا حکم اترا۔

(۲) إذا الشمس كورت وإذا النجوم انكدرت وإذا الجبال سُيّرت، وإذا العشارُ عطلت، وإذا الوحوش حُشرت، وإذا لبحار سجرت وإذا النفوس زجرت (سورۂ تکویر) ترجمہ: جب دھوپ لپیٹی جائے۔ اور جب ستارے جھڑنے لگیں۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں۔ اور جب حاملہ اونٹنیاں چھوٹی پھریں۔ اور جب وحشی جانور جمع کئے جائیں۔ اور جب قبریں کریدی جائیں۔

(۳) سورہ غاشیہ کی چند آیتیں وجوه يومئذ ناعمة لسعيها راضية في جنة عالية لاتسمع فيها لاغية فيها عين جارية فيها سرر مرفوعة وأكواب موضوعة ونمارق مصفوفة وزرابي مبثوثة ترجمہ۔ کتنے ہی چہرے اس دن عیش میں ہوں گے۔ اپنی کوشش پر راضی۔ ایسی بلند باغ میں کہ کوئی بیہودہ بات نہ سنیں۔ اس میں چشمہ رواں ہے۔ اس میں اونچے اونچے تخت ہیں۔ اور چنے ہوئے کوزے۔ اور برابر بچھے ہوئے قالین اور پھیلی ہوئی چاندنیاں۔ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا امام احمد رضا کی خوبصورت اور شائستہ زبان کا یہ رنگ پورے کنزالایمان میں پھیلا ہوا ہے۔ عزیز قاری! کنزالایمان کے سرسری مطالعہ کے بعد اب ہم ملاحظہ کریں کہ کنزالایمان کے ترجمہ میں عظمت رسالت کا احترام کس درجہ ملحوظ ہے تاکہ امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی ترجمہ نگاری ذہن میں راسخ ہو جائے۔ اس سلسلے میں بھی ہم کچھ مثالیں پیش کریں گے تاکہ امام احمد رضا کی مفسرانہ زندگی مزید واضح ہو جائے گی۔

عظمت رسالت کا احترام:۔ (۱) وما محمد إلا رسول قد خلت من قبله الرسل أفإن مات أو قتل انقلبتم على أعقابكم (سورۂ آل عمران آیت ۱۴۴)

اس آیت کریمہ کا مختلف مترجمین نے جو ترجمہ کیا ہے اسے ملاحظہ فرمائیں۔

اور محمد ﷺ تو ایک رسول ہے۔ ہو چکے اس سے پہلے بہت رسول پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں (محمود الحسن دیو بندی) اور محمد ﷺ تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں۔ بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں تو پھر الٹے پاؤں پھر جاؤ؟ (فتح محمد جالندھری)

اور محمد نرے رسول ہی تو ہیں۔ آپ سے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جاویں تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے (اشرف علی تھانوی)

محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (ابوالاعلیٰ مودودی)

اب دامن ادب کو تھامے ہوئے امام احمد رضا فاضل بریلوی کا یہ ایمان افروز ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

اور محمد تو ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول ہو چکے تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں تو تم الٹے پاؤں پھرو گے۔ (کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن)

وضاحت:۔ ترجمہ کے ان حصوں پر توجہ فرمائیں ''اور محمد تو ایک رسول ہیں'' ''وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں'' آپ کو واضح طور پر سمجھ میں آئے گا کہ اس کے اندر صحت ترجمہ بھی ہے اور حسن ادب بھی۔

حضرت علامہ مولانا بدرالدین قادری کہتے ہیں۔ ''دور حاضر میں اردو کے شائع شدہ ترجموں میں صرف ایک ترجمہ ''کنزالایمان'' ہے جو قرآن کا صحیح ترجمان ہونے کے ساتھ (۱) تفاسیر معتبر قدیمہ کے مطابق ہے (۲) اہل تفویض کے مسلک اسلم کا عکاسی ہے (۳) اصحاب تاویل کے مذہب سالم کا مؤید ہے (۴) زبان کی روانی اور سلاست میں بے مثل ہے (۵) قرآن حکیم کے اصل منشا و مراد کو بتاتا ہے (۷) آیات ربانی کے اندر خطاب کو پہچنواتا ہے (۸) قرآن کے مخصوص محاوروں کی

نا ندہی کرتا ہے (۹) قادر مطلق کی ردائے عزت وجلال میں نقص وعیب کا دھبہ لگانے والوں کے لئے شمشیر براں (۱۰) حضرت انبیاء کی عظمت وحرمت کا محافظ ونگہبان ہے (۱۱) عامۂ مسلمین کے لئے بامحاورہ اردو میں سادہ ترجمہ ہے (۱۲) لیکن علماء ومشائخ کے لئے حقائق ومعارف کا امنڈتا سمندر ہے۔

بس اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن حکیم قادر مطلق جل جلالہ کا مقدس کلام ہے اور کنزالایمان اس مذہب ترجمان ہے۔اور کیوں نہ ہو کہ یہ ترجمہ اس کا ہے جو عظمت مصطفے علیہ التحیۃ والثناء کا علمبردار ہے۔تائید ربانی کا سرمایہ دار، انوار ربانی کا حامل، حقائق قرآن کا ماہر دقائق قرآن کا عارف ہے۔(سوانح اعلیٰ حضرت طبع سوم ص ۳۰۰)

حضرت فاضل بریلوی کے ترجمہ قرآن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حضرت علامہ غلام رسول سعیدی استاذ جامعہ نعیمیہ لاہور لکھتے ہیں۔''اس ترجمہ میں اردو، عربی کے اسلوب میں رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور فصاحت بیان کے آئینہ میں اعجاز قرآن کا عکس نظر آتا ہے۔اس ترجمہ میں علم کلام کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھا کر عبارت کے سلیس فقروں میں رکھ دی گئی ہیں۔

ذات وصفات، جبر وقدر اور نبوت ورسالت کے نازک مسائل کو جس عمدگی اور اختصار کے ساتھ ترجمہ کی سحر کاری سے سہل کیا ہے۔امام رازی اگر اسے دیکھ پاتے تو بے اختیار آفریں کہتے۔ابن عطاء وجبائی کے سامنے یہ ترجمہ ہوتا تو مشاہد اعتزال سے توبہ کر لیتے خامۂ تصوف سے جس طرح اعلیٰ حضرت نے آیات کے بطن کو ترجمہ میں ڈھالا ہے غزالی ہوتے تو دیکھ کر وجد کرتے، ابن عربی شاد کام ہوتے اور سہروردی دعائیں دیتے۔ ترجمہ کے ضمن میں جو فقہی نگینے لائے ہیں اگر امام اعظم پر پیش کیے جاتے تو یقیناً مرحبا کہتے۔اور اگر ابن عابدین اور سید طحطاوی کے سامنے یہ فقہی آبگینے ہوتے تو اعلیٰ حضرت سے تلمذ آرزو کرتے۔قرآن مجید کے علوم وفنون، اس کی فصاحت وبلاغت اور اس کی تاویل وتفسیر پر جو شخص نگاہ رکھتا ہو وہ جب اس ترجمہ کو پڑھے گا تو یقیناً سوچے گا کہ اگر قرآن مجید اردو میں اترتا ہوتا تو یہ عبارت اسی کے قریب تر ہوتی۔اور جو فصاحت زبان سے آشنا ہو اسے کہنا پڑے گا کہ اسی ترجمہ میں زبان وبیان کی بلاغت اعجاز کی سرحدوں کو چھوتی معلوم ہوتی ہے۔'' (محاسن کنزالایمان طبع ششم مرکزی مجلس لاہور۔)

معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی ترجمہ نگاری وتاویل پر کتنی دسترس حاصل تھا۔اب ہم اپنی بحث کے آخری مرحلے میں کنزالایمان کے بعد دیگر کتب پیش کرتے ہیں جو اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ نے مختلف حواشی وتفسیر کی شکل میں امت محمدیہ کو عطا کیں۔

کتب اعلیٰ حضرت:۔

(۱) سورۃ الضحیٰ کی بعض آیات کی تفسیر ۸۰ جزء میں تحریر فرمائی۔ (حیات اعلیٰ حضرت)

(۲) الزلال الأ نقی من بحر سفینۃ الأ تقی

(۳) تا ٔمل الراح فی فرق الریح والریاح

(۴) انوار الحلم فی معانی میعاد استجیب کلم

(۵) الصمصام علی مشکک فی آیۃ علوم الأ رحام

(۶) انباء الحی ان کتابہ المصون تبیانا لکل شی

حواشی:

(۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی شریف (عربی)

(۲) حاشیہ عنایت القاضی (عربی)

(۳) حاشیہ معالم التنزیل (عربی)

(۴) حاشیہ الاتقان فی علوم القرآن (عربی)

(۵) حاشیہ الدر المنثور (عربی)

(۶) حاشیہ تفسیر خازن (عربی)

مذکورہ بالا کتب وحواشی اور امام احمد رضا فاضل بریلوی سے علمی کارناموں سے ان کی مفسرانہ زندگی نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

ماخذ ومراجع:

(۱) الاتقان فی علوم القرآن (جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ) (۲) التفسیر والمفسرون (للعلامہ محمد حسین الذھبی) (۳) (محاسن کنزالایمان طبع ششم مرکزی مجلس لاہور۔بحوالہ معارف کنزالایمان) (۴) سوانح اعلیٰ حضرت (۵) معارف کنزالایمان (۶) حیات اعلیٰ حضرت (علامہ ظفر الدین بہاری)

☆☆☆

☆ مقالہ نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے طالب علم ہیں

امام احمد رضا

بحیثیت محدث

مولانا محمد عارف نظامی☆

کائناتِ ارضی کبھی اہل علم اور اہل کمال سے خالی نہیں رہی ارسطو، افلاطون، سقراط، ابن سینا جیسے لوگ جنم لیتے رہے جن کے ذکر سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں جو تہذیب انسانی اور اخلاق پر بایں طور اثر انداز ہوئے کہ آج تک ان کے نقوش سے تاریخ کے صفحات فروزاں ہیں۔

انہیں جیسا چودہویں صدی ہجری کے ایسے پرفتن دور میں جس میں حق کی سربلندی، اسلام وسنت کی حفاظت وصیانت کے لیے مجدد ومحدث ومفتی کی ضرورت تھی برصغیر ہند سے تاریخ کی سطح پر ایک ایسا نام مطلع انوار بن کر ابھرا جو علماء، فقہاء، حکماء، فلاسفہ، اور متکلمین کی بزم حکمت ودانائی اور ان کی فہرست میں اپنا بلند، نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کر لے گیا۔

آپ کے قلم سیال رقم سے مصطفےٰ جان رحمت ﷺ کے علوم پر ایسے شہہ پارے وگوہر ہائے آبدار سامنے آئے جس نے حرمین شریفین کے جلیل القدر علماء ومشائخ کو انگشت بدندان اور حیرت زدہ کردیا۔ آپ چودہویں صدی کے مجدد بھی ہوئے۔ صحیح حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"ألا! إن الله يبعث لهذه الأمة على راس كل مائة من يجدد لها" کو بیشک اللہ تعالیٰ اس امت کے پر سو سال میں ایسا شخص بھیجے گا جو اس کے لیے تجدید کرتے جو امت کو بھولے احکام شرعیہ یاد دلائے جو سنتوں کو زندہ کرے اور یہ سب کچھ اعلیٰ حضرت نے کیا مسائل کو بھی سلجھایا، سنتوں کو بھی زندہ کیا اور بھولے احکام شرعیہ بھی یاد دلائے۔ آپ نے سیکڑوں کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کتاب العطايا النبوية فى الفتاوى الرضوية کے نام سے بارہ ضخیم جلدوں میں ہے۔

اور جہاں یہ آپ کے فقیہہ ہونے کی دلیل ہے وہیں پر فتاوی رضویہ میں شامل احادیث کریمہ کی مجموعی تعداد (۳۵۹۱) آپ کے محدث ہونے کی دلیل ہے اور یہ ہی نہیں کیونکہ جب ہم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی ہمہ جہت شخصیت کو دیکھتے ہیں تو فن حدیث، طرق حدیث، علل حدیث اور اسماء الرجال میں بے مثال نظر آتے ہیں۔

اور یہ سب اللہ رب العزت کی طرف سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثال قوت حافظہ عطا فرمائی یہی وجہ ہے کہ زور مطالعہ اور یاد داشت کا یہ عالم تھا کہ جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گزر گئی وہ ذہن میں محفوظ ہوگئی اور زندگی بھر نہیں بھولتے تھے اسی وجہ سے جب کسی مسئلہ کا حوالہ دیتے تو ورق گردانی کرنی نہیں پڑتی تھی بلکہ ایک مرتبہ کا مطالعہ اس کے صفحہ وغیرہ کے حوالہ دریافت کرتا تو امام احمد رضا فرماتے کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر فلاں سطر پہ ہے جب کتاب کھولی جاتی تو وہیں ملتا یہ سب خداداد صلاحیت کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ہر فن مولی ہیں اور ہر موڑ پر کام کیا ہے اور علم حدیث میں آپ کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مشابہہ علماء کے جم غفیر کو بھی آپ کا محدثانہ مقام مسلم تھا اور آپ نے علم حدیث کے تعلق سے بہت بڑا کام انجام دیا اور "بلغوا عنی ولو آیة" کا مصداق ٹھہرے۔

تعریف حدیث اور مطلب:۔ حضور ﷺ کے قول، فعل، عمل اور تقریر کو حدیث کہا جاتا ہے قول کا مطلب یہ ہے کہ سرکار علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے کچھ فرمایا ہو وہ حدیث قولی ہے۔

فعل کا مطلب یہ ہے کہ سرکار علیہ السلام نے اپنے اعضاء مبارکہ سے کچھ کیا ہو اس کو حدیث فعلی کہا جاتا ہے۔

اور تقریر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے کچھ کھایا کیا اور حضور ﷺ نے اس کو نہ روکا ہو وہ حدیث تقریری ہے۔

احادیث کریمہ کی اصطلاحات واسانید ونقد رجال اور دیگر متعلقات پر آپ کی گہری نظر تھی اور الفاظ ومفاہیم ہر ایک پر عالمانہ اور محققانہ کلام فرماتے تھے اور پھر صحیح نتائج تک ان کی محدثانہ بصیرت براہ راست رہنمائی کیا کرتی تھی۔

جیسا کہ آپ نے اپنے ایک رسالہ میں تحقیق پیش کی "حاجز البحرین الواقی عن جمع الصلاتین" (۱۳۱۳ھ) دو نمازوں کو جمع کرنے کا شرعی حکم)

آپ نے اس رسالہ میں وہ تحقیق پیش کی ہے کہ فن اسماء الرجال میں مہارت تامہ رکھنے والوں کی حدیث دانی کا بخیہ ادھیڑ دیا۔

دراصل اس مسئلے میں غیر مقلدین کے ہندی امام میاں نذیر حسین دہلوی معیار الحق میں ائمہ مالکیہ اور شافعیہ سے استفادہ کرتے ہوئے مذہب حنفی کی تردید میں تفصیلی کلام کیا تھا۔

تو امام احمد رضا بریلوی نے اس رسالہ میں اس پر سخت تنقید کی اور اس کے ہر ایک شبہے کا جواب اتنے مضبوط و مدلل حوالوں سے دیا ہے کہ مخالفین اس کی حدیث دانی کے دعوے کے باوجود آج تک اس کا جواب دینے کی ہمت نہیں کر سکے۔

میاں نذیر حسین دہلوی کے خلاف موقف جو حدیث نکلی تو اس کے راوی کو انہوں نے کسی نہ کسی اعتبار سے متہم قرار دیا پھر کذاب کہا یا وضاع لکھا۔

امام احمد رضا بریلوی جو فن اسماء الرجال میں مہارت تامہ رکھتے ہیں ان کا ایسا تعاقب فرمایا کہ ان کی حدیث دانی کا بخیہ ادھیڑ دیا مثلا امام نسائی حضرت نافع سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک سفر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ تھا وہ تیزی کے ساتھ سفر کر رہے شفق غروب ہونے والی تھی کہ اتر کر نماز مغرب ادا کی پھر عشاء کی تکبیر اس وقت کہی جب شفق غروب ہو چکی تھی۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حقیقۃ دو نمازیں ایک وقت میں جمع نہیں کیں بلکہ صورۃً اور عملاً جمع کیں، یہ بات میاں صاحب کے موقف کے خلاف تھی اس لیے انہوں نے اس پر اعتراض کر دیا کہ امام نسائی کی روایت میں ایک راوی ولید بن قاسم ہیں اور ان سے روایت میں خطا سرزد ہوئی تھی تقریب میں صدوق ہے۔

اس اعتراض پر امام احمد رضا نے متعدد وجوہ سے گرفت فرمائی۔

(۱) یہ تحریف ہے امام نسائی نے ولید کا فقط نام ذکر کیا تھا، میاں نذیر حسین صاحب نے ازراہ چالا کی اسی نام اور اسی طبقے کا ایک راوی متعین کر لیا جو امام نسائی کے راویوں میں سے ہے اور جس پر کسی قدر تنقید بھی کی گئی ہے حالانکہ یہ راوی ولید بن قاسم نہیں بلکہ ولید بن مسلم ہیں جو صحیح مسلم کے رجال اور ائمہ ثقات اور حفاظ اعلام میں سے ہیں۔

ہاں وہ تدلیس کرتے ہیں لیکن اس کا کیا نقصان کہ اس جگہ وہ صاف حدثنی نافع فرما رہے ہیں۔

(۲) اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ ابن قاسم ہی ہیں تاہم وہ مستحق رد نہیں، امام احمد نے ان کی توثیق کی ہے کہ ان سے روایت کی محدثین کو ان سے حدیث لکھنے کا حکم دیا، ابن عدی نے کہا جب وہ کسی ثقہ سے روایت کریں تو ان میں کوئی عیب نہیں ہے۔

(۳) صحیح بخاری و مسلم میں کتنے راوی وہ ہیں جن کے بارے میں تقریب میں فرمایا صدوق یخطی کیا آپ قسم کھا بیٹھے ہیں کہ صحیحین کی روایت کو بھی رد کر دو گے؟

پھر امام احمد رضا بریلوی نے حاشیہ میں قلم برداشتہ صحیحین کے ۱۳۱ر ایسے راویوں کے نام گنوائے دیئے جن کے بارے میں اسماء الرجال کی کتابوں میں انطأ یا کثیر الخطا کے الفاظ وارد ہیں

(۴) حسان بن حسان بن بصری صحیح بخاری کے راوی ہیں ان کے بارے میں تقریب میں ہے صدوق یخطی۔

ان کے بعد حسان بن واسطی کے بارے میں لکھا، ابن مندہ نے انہیں وہم کی بناء پر حسان بصری سمجھ لیا حالانکہ حسان واسطی ضعیف ہیں دیکھئے پہلے حسان بصری کو صدوق یخطی کہنے کے باوجود واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ ضعیف نہیں ہیں۔ اسی طرح امام نسائی نے فرمایا تھا اخبرنا اسمعیل بن مسعود عن خالد عن شعبہ۔

ملا جی نے دھڑک حکم لگا دیا کہ اس سے مراد خالد بن مخلد رافضی ہے۔ اس کے جواب میں امام احمد رضا نے پندرہ حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ یہاں پر خالد سے مراد خالد بن حارث ہے نہ کہ خالد بن مخلد

رافضی ایک محققانہ رسالہ حدیث واصول حدیث اور اسماء الرجال کے علوم ومعارف کا بہتا ہوا سمندر ہے جسے پڑھ کر ارباب علم وفن انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور مذہب حنفی کی حقانیت آفتاب نیمروز سے زیادہ تاباں اور روشن ہو جاتی ہے اور اس رسالۂ مبارکہ میں ۱۶۰ حدیثیں شامل تحقیق ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ ایسی حدیث کے فاو واؤ وغیرہ سے استدلال نہیں کمافی حجۃ اللہ البالغۃ۔

واقول وبحول اللہ اصول۔

(۵) مهاجره کو ظرف افعال ثلثہ کہنا محض ادعائے بے دلیل ہے فاتعقیب چاہتی ہے اتحاد زمانہ نہیں چاہتی۔ نہیں بلکہ تعدد واجب کرتی ہے کہ تعقیب بے تعدد معقول نہیں۔

(۶) ظرفیت ثلثہ فا سے ثابت؟ یا خارج ہے؟ اول بداهۃ باطل کماعلمت برتقدیر ثانی حدیث فالغومحض ہے کہ عصر فی الهاجرۃ اسی قدر سے ثابت۔ پھر باوصف لغویت اسی کی طرف اسناد کہ بمقتضائے فا یہ معنی ہوئے اور عجیب تر۔

(۷) صحیح مسلم وغیرہ میں ملاحظہ ہو۔ فلما کان یوم الترویۃ توجھوا الی منیٰ فاھلّوا بالحج ورکب رسول اللہ ﷺ فصلیٰ بھا الظھر والعصر والمغرب والعشاء والفجر۔ جب نوین ذی الحجہ ہوئی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حج کا احرام باندھ کر منی کو چلے اور حضور پرنور ﷺ سوار ہوئے تو منیٰ میں ظہر وعصر ومغرب وعشا اور فجر پانچوں نمازیں پڑھیں

وہی فاوہی ترتیب، وہی عطف، وہی ترکیب اب یہاں بھی کہہ دینا کہ سوار ہوتے ہی معاً بے مہلت پانچوں نمازیں ایک ہی وقت میں پڑھ لیں جو معنی صلی الظہر والعصر الخ کے یہاں ہیں وہی وہاں اور یہ قطعاً محاورۂ عامہ شائعہ ہے کہ اصلاً مفید وصل صلوات نہیں ہوتا۔

(۸) کلام متناقض ہے کہ اول کلام میں حکم وصل سے عصر کا فصل ''خلاف ظہر'' مانا یہ دلیل صحت ہے آخر میں کیوں کر جائز کہا یہ دلیل فساد۔

(۹) تاویل کے لیے قطعیت مانع ضروری جاننا عجیب جہل ہے کہا اگر اسی حدیث کے ظاہر سے ایک معنی متبادر ہو اور دوسری حدیث صحیح اس کے خلاف میں صریح، تو حدیث اول کو اس کے خلاف پر حمل واجب ہے کہ بے مانع قطعی ظاہر سے عدول کیوں کر ہو الخ۔ مقتبس۔ ''حاجز البحرین الواقی عن جمع الصلاتین''، ''منیر العین فی حکم تقبیل الابھامین میں صحت کی وضاحت فرمائی اور اسی میں حدیث کے کچھ مراتب وطرق بیان فرماتے ہیں۔

کسی حدیث کی سند میں راوی کا مجہول ہونا اگر اثر کرتا ہے تو صرف اس قدر کہ اسے ضعیف کہا جائے نہ کہ باطل وموضوع۔

اسی طرح سند کا منقطع ہونا مستلزم وضع نہیں، ہمارے ائمہ کرام اور جمہور علماء کے نزدیک تو انقطاع سے صحت وحجیت ہی میں کچھ خلل نہیں آتا۔

حسن حدیث میں راوی بالکل مبہم ہو وہ بھی موضوع نہیں کہ یہ صرف مورث ضعف ہے نہ کہ موجب وضع۔

ضعف راویان کے باعث حدیث کو موضوع کہہ دینا ظلم وجزاف ہے۔

راوی ایسا غافل ہو کہ حدیث میں دوسرے کی تلقین قبول کرے اس کی حدیث بھی موضوع نہیں، مثلاً راوی کی اپنی مرویات میں ایسی غفلت کہ دوسرے کی تلقین قبول کرے یعنی دوسرا جو بتادے کہ تو نے یہ سنا تھا وہی مان لے

کسی راوی پر غفلت کا طعن فسق سے بدتر اور جہالت سے چار درجہ زیادہ سخت ہے۔

پھر امام احمد رضا نخبۃ الفکر کے حوالے سے اسباب طعن کی دس قسمیں بیان فرماتے ہیں۔

کذب، تہمت، کثرت غلط، غفلت، فسق، مخالفت ثقات، جہالت، بدعت، سوء حفظ اور تصریح فرمائی کہ ہر پہلا دوسرے سے سخت تر ہے۔

منکر الحدیث کی حدیث بھی موضوع نہیں۔

متروک کی حدیث بھی موضوع نہیں کہ ضعیفوں میں سب سے بدتر درجہ متروک ہے جس کے بعد صرف متہم بالوضع یا کذاب دجال کا مرتبہ ہے۔

پھر موضوعیت کس طرح ثابت ہوتی ہے اس سلسلے میں امام احمد رضا صاحب نے فرمایا۔

قرآن عظیم، یا سنت متواترہ، یا اجماعی قطعی قطعیات الدلالۃ، یا عقل صریح، حسن صریح، یا تاریخ یقینی کے ایسا مخالف کہ تاویل و تطبیق کا احتمال نہ رہے، یا معنی شنیع وقبیح ہوں جن کا صدور حضور پر نور ﷺ سے منقول نہ ہو جیسے معاذ اللہ کسی فساد یا ظلم یا عبث یا سفہ یا مدح باطل یا ذم حق پر مشتمل ہونا یا ایک جماعت جس کا عدد حد تواتر کو پہنچے اور ان میں احتمال کذب یا ایک دوسرے کی تقلید کا نہ رہے اس کے کذب وبطلان پر گواہی مستندا الی الحس دے، یا خبر کسی ایسے امر کی ہو کہ اگر واقع ہوتا تو اس کی نقل وخبر مشہور و مستفیض ہو جاتی، مگر اس روایت کے سوا اس کا پتہ نہیں۔

یا کسی حقیر فعل کی مدحت اور اس پر وعدہ و بشارت یا صغیر امر کی مذمت اور اس پہ وعید وتہدید میں لمبے چوڑے مبالغ ہوں جنہیں کلام معجز نظام نبوت سے مشابہت نہ رہے۔ یہ صورتیں تو صریح ظہور ووضوح وضع کی ہیں۔

(۱۱) یا یوں حکم وضع کیا جاتا ہے کہ لفظ رکیک وسخیف ہوں جنہیں سمع دفع اور طبع منع کرے اور ناقل مدعی ہو کہ یہ بعینہا الفاظ کریمہ حضور افصح العرب ﷺ ہیں یا وہ محل ہی نقل بالمعنی کا نہ ہو۔

(۱۲) یا ناقل رافضی حضرات اہل بیت کرام علی سیدھم وعلیہم الصلاۃ والسلام کے فضائل میں وہ باتیں روایت کرلے جو اس کے غیر ثابت نہ ہوں۔ جیسے لحمک لحمی ودمک دمی (تیرا گوشت میرا خون میرا خون)۔

(۱۳) یا قرائن حالیہ گواہی دے رہے ہوں کہ یہ روایت اس شخص نے کسی طمع سے یا غضب وغیرھما کے باعث ابھی گڑھ کر پیش کردی ہے جیسے سبق میں حدیث زیادت جناح اور حدیث ذم معلمین اطفال۔

(۱۴) یا تمام کتب وتصانیف اسلامیہ میں استقرائے تام کیا جائے اور اس کا کہیں پتہ نہ چلے یہ صرف اجلۂ حفاظ ائمہ شان کا کام تھا جس کی لیاقت صدہا سال سے معدوم۔

(۱۵) یا راوی خود اقرار وضع کردے خواہ صراحۃً خواہ ایسی بات کہے جو بمنزلۂ اقرار ہو مثلاً ایک شیخ بلا واسطہ بدعوی سماع روایت کرے پھر اس کی تاریخ وفات وہ بتائے کہ اس کا اس سے سننا معقول نہ ہو۔

موضوعیت حدیث کے ثبوت کی یہ تمام صورتیں رقم کرنے کے بعد امام احمد رضا فرماتے ہیں کہ

یہ پندرہ باتیں ہیں شاید اس جمع وتلخیص کے ساتھ سطور کے سوا نہ ملیں۔ جو حدیث ان پندرہ دلائل سے منزہ ہو محدث اگر اس پر حکم وضع کرے تو اس سے نفس حدیث پر حکم لازم نہیں بلکہ صرف اس سند پر عائد ہوگا جو اس وقت اس کے پیش نظر ہے۔

بالجملہ اس قدر پر اجماع محققین ہے کہ حدیث جب ان دلائل وقرائن قطعیہ وغالبہ سے خالی ہو اور اس کا مدار کسی متہم بالکذب پر نہ ہو تو ہرگز کسی طرح اسے موضوع کہنا ممکن نہیں۔

حدیث اگر متعدد طریقوں سے روایت کی جائے اور وہ سب ضعف رکھے ہوں تو ضعیف ضعیف مل کر بھی قوت حاصل کرلیتے ہیں بلکہ اگر ضعف غایت شدت وقوت پر نہ ہو تو جبر نقصان ہو کر حدیث درجۂ حسن تک پہنچتی اور مثل صحیح خود احکام حلال میں حجت ہو جاتی ہے۔

حصول قوت کے لیے کچھ بہت سے ہی طرق کی حاجت نہیں صرف دو بھی مل کر قوت پا جاتے ہیں۔

اہل علم کے عمل کر لینے سے بھی حدیث قوت پاتی ہے اگرچہ سند ضعیف ہو۔ جن باتوں کا ثبوت حدیث سے پایا جائے وہ تین قسم ہیں۔

۱۔ عقائد میں حدیث آحاد اگرچہ صحیح ہو کافی نہیں۔ کہ یہ اصول عقائد اسلامیہ ہیں جن میں خاص یقین درکار اور یہ حدیث آحاد کا افادہ نہیں بلکہ اس کے لیے حدیث متواتر ومشہور کافی نہیں۔ ثبوت احکام کے لیے حدیث کا صحیح لذاتہ یا حسن لذاتہ خواہ لغیرہ ہو ہونا ضروری ہے

۳۔ فضائل ومناقب میں بالاتفاق علماء حدیث ضعیف مقبول کافی ہے۔ یعنی فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔

اس عظیم وجلیل رسالے میں علم حدیث واصول سے متعلق امام احمد رضا فاضل بریلوی نے جو تحقیقات بازغہ حوالۂ قلم کی ہیں وہ یقیناً

انہیں کا حصہ ہیں۔اور بڑے سائز کے ۱۰۷ صفحات پر پھیلا ہوا یہ گرانقدر رسالہ امام احمد رضا فاضل بریلوی کی حذاقت فی الحدیث کا واضح ثبوت ہے اس رسالہ مبارکہ میں سترا احادیث کریمہ زیر بحث ہیں۔

اور آپ کا ایک رسالہ ہے ''الفضل الموھبی فی معنی اذاصح الحدیث فھو مذھبی'' حدیث صحیح مجتہد کب اور کن حالات میں عمل نہیں کرتا۔

اس رسالہ میں تو بہت تفصیل ہے لیکن قلت اوراق کی فکر دامن گیر ہے ہم اس میں ایک بات بیان کرتے ہیں

''بارہا حدیث صحیح ہوتی ہے اور امام مجتہد اس پر عمل نہیں فرماتا'' قول اعلیٰ حضرت۔

''اس کی سترہ صورتیں بیان کی ہیں اور ثابت کرکے دیکھا دیا کہ کیوں عمل نہیں فرمایا۔ مذکورہ رسالہ میں ملاحظہ فرمائیں

اگر کوئی حدیث مجتہد نے ایسی پائی جس پر براہ تاویل یا کسی دوسرے سبب سے اس پر عمل نہ کیا تو وہ حدیث اس کا مذہب نہ قرار پائے گی کیونکہ وہ اس کے خلاف عمل کرچکا ہے اور مجرد صحت اثری صحت عملی کو مستلزم نہیں۔

کوئی ایسی حدیث جس پر مجتہد نے عمل نہ کیا بزعم خود اسے مذہب مجتہد کے خلاف پا کر یہ دعوی کردینا کہ یہی اس کا مذہب ہوسکتا ہے اس بارے میں تحقیقی نقطہ نظر سے دو امور ایسے ہیں جن کے پائے جانے کے بعد ہی مجتہد کا مسلک سابق چھوڑ کر اس حدیث کے مطابق ہونے کا حکم دیا جاسکتا ہے

لیکن ہم یہیں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام: ۔علم حدیث او راسماء رجال حدیث میں فاضل بریلوی کی وسعت علم اور آپ کی تحقیق وتنقید کے یہ چند نمونے دیکھیں جو ہم نے اس میں پیش کئے ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی کی تحقیق جیسے حدیث میں اسی طرح ہر فن میں پائی جاتی ہے۔

امام احمد رضا کی ذات ستودہ صفات سے علوم وحقائق کے اتنے سوتے پھوٹے جن سے شعور وادراک اور فکر وآگہی کے ہر شعبے سیراب ہوئے منقولات ومعقولات میں ایسے حیرتناک اور عدیم المثال کارنامے انجام دیئے کہ جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔علماء محققین، فقہاء ومحدثین کے لیے وہ کعبۂ آرزو تو تھے ہی دور جدید کے دانشوروں فلاسفہ اور سائنسدانوں کے لیے ان کے پیکر عملی کا معقولاتی پہلو کم حیرتناک نہیں۔ اپنی تصنیفات میں نظریہ کشش ثقل، نظریہ حرکت زمین پر فاضلانہ ومحققانہ بحث کرتے ہوئے بھی اپنا موقف ومدعا ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔وجدان پکار اٹھتا ہے کہ وہ نابغۂ روزگار وجود علم وفن کی ہمہ گیریت میں ایک جہان حیرت ہیں۔

☆☆☆

☆مقالہ نگار جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے طالب علم ہیں

قطعہ

چراغِ طیبہ کی روشنی میں جو ایک شب بھی گزار آئے
وہ دل کو روشن بنا کے اٹھے وہ اپنی قسمت سنوار آئے
کچھ ایسی پی ہے شرابِ الفت وہیں کھڑے ہیں خبر نہیں ہے
نہ در ہوا بند میکدے کا نہ ہوش میں بادہ خوار آئے

(علامہ ارشد القادری)

القرآن ومنهج الدعوة

الاخ محمدعرفان المرادآبادي☆

إنّ القرآن الكريم كتاب مبين، قد أنزله الله تعالى علىٰ نبيه محمد ﷺ هدىً للناس وشفاءً ورحمةً للمؤمنين كما قال في كتابه العزيز: ﴿ وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين - سورة بني إسرائيل / ٨٢ ﴾ والقرآن الكريم كلام الله تعالىٰ وصفة من صفاته وجميع صفات الله تعالىٰ أزلي وأبدي لذا إنه أزلي وأبدي ويبقى دائماً.

والقرآن الكريم نظام الحياة الكامل وهو يهدي الناس إلىٰ الصراط المستقيم، ويدعوهم إلى الله ورسوله ﷺ، ويأمرهم بالمعروف، وينهاهم عن الفواحش والمنكرات. لا ريب فيه أنه منزّل من الله تعالىٰ ولا شك في تعليماته ومن يشك فيه وفي تعليماته وهدايته يكون في طبيعته اعوجاج، وفي عقله وفهمه نقص وعيب، وإن هذا الكتاب يجمع الهداية وقد ذكرت فيه نظرية الإنسان والكون ونظام الحياة وليس فيه إلا الهداية والعقائد التي قد ذكرت فيه أنهاحق.

ومن خصوصية القرآن الكريم لا يستطيع أحد أن يخلط فيه كلامه وأنه خالٍ عن كل نوع من أنواع الشك والعيب، وأنه ينطوي على الحقائق الثابتة والقطعيات الباهرة. واعلموا أنه هذا من عند الله كما ورد في القرآن: ﴿ وتفصيل الكتاب لاريب فيه من رب العالمين - يونس / ٣٧ ﴾.

أدلة على أنّ القرآن من عند الله: ويزعم بعض المستشرقين أنه من كلام محمدوقد تصدّى لدحض أقوالهم كثير من علماء المسلمين وفي هذا المقام أننا نكتفي ببعض الأدلة على أن القرآن الكريم منزّل من لدن ربّ العالمين، وأنه ليس من كلام البشر لأن أحدا من الإنسان أوالجن لا يقدرعلى أن يأتوا بمثل ما ورد في القرآن الكريم من آيات بينات تعرض ماضي البشرية وحاضرها.

كما قال الله تعالىٰ: ﴿ كتاب أنزلناه إليک لتخرج الناس من الظلمات إلى النور بإذن ربهم إلى صراط العزيزالحميد - إبراهيم / ١ ﴾.

وقال تعالىٰ في مقام آخر: إن هٰذا القرآن يهدي للتى هي أقوم ويبشرالمؤمنين الذين يعملون الصالحات أن لهم أجراً كبيراً - بني إسرائيل / ٩ ﴾.

نحن نعلم أن الآيتين المذكورتين تدلان على أن القرآن الكريم بشّر الناس بأنه يخرجهم من الظلمات إلى النور وأنه سوف يهديهم إلى الأقوم الأمثل الأعلىٰ في كل أمر.

ومن المعروف أن هاتين الآيتين نزلتا بمكة حيث واجهت دعوة الإسلام الضد والعناد من قريش، وكان عدد المسلمين قليلا في خالة ضعف وضيق ولا يسمح لبشرأن ينبأبمستقبل الحياة الذي وعدت به هاتان الآيتان وإن الله تعالى الذي يعلم الغيب ويقدر عليه، وهوالقادر على صنع هذا المستقبل الرائع.

وهنا ينشأ سؤال: هل تحقق هذاالمستقبل الذي بشرت به هاتان الآيتان؟ ومن المناسب أن نبحث عن

الإجابة عن هذا السؤال من أقوال شخصيات علمية ومن المناسب أيضا أن تكون هؤلاء على غير دين الإسلام ونقدم إليكم في هذا المجال قولين فحسب.

الأول : ماقاله الدكتور غوستاف لوبون في مؤلفه عن حضارة العرب إذ يقرر:

"كانت الأمم الإفريقية والآسويّة وقت ظهور محمد قد فقدت مُثلها العليا فلم يبق لحبّ الوطن وعبادة الآلهة أثر في نفوس أبنائها وكانت الأثرة كل ما في قلوب الناس ، وقد استطاع محمد أن يبدع مثلا عاليا قويا للشعوب العربية التي لاعهد لها بالمُثل العليا، وفي ذلك الإبداع تتجلى عظمة محمد ولم يلبث الإسلام أن يمنح الشعوب التي خضعت لسلطانه مصالح مختلفة قبل ذلك ، هذا الغرض هو عبادة الله والعمل بأوامره لتحقيق الحياة الفاضلة والمثل الأعلى من كل أمر".

الثاني: ماذكره الفيلسوف الاشتراكي اعصام روجيه جارودى الذي يقول:

لقد جاء محمد في أوّل قائمة الخالدين من عظماء العالم لأنه هو الإنسان الوحيد في التاريخ الذي نجح نجاحا مطلقا على المستويَين:الديني والدنيوي ، وتبدوهذه الحقيقة أوضح ما تكون للناس أربعة عشرقرنا على حياته ولا أعرف غايات أكثر سموًا على هذين المستويين مما جاء به من أجل ذلك أومن بأن محمدا هو أعظم الشخصيات أثرا في تأريخ البشر،فقد ثبت بهذا الكلام أن القرآن الكريم من عندالله تعالىٰ وليس من كلام محمد ﷺ.

القرآن شفاء ورحمة: لاريب فيه أن القرآن الكريم شافٍ للمشاكل الذهنية والعقلية والقلبية وعلاج للمصائب الأخلاقية والدينية ويداوي البلايا السياسية والاقتصادية والاجتماعية وأيضا أنه علاج الأمراض كلها وأنه يشفي الناس الذين يؤمنون بالله ورسوله ﷺ ويوم الآخرة ويعملون بأحكام الإسلام ويعتمدون على عقائده ومافيه من حكم .وإن الذين لايؤمنون بهذا الكتاب ويكفرون به إنهم لفي ضلال مبين ومأواهم جهنم.

والقرآن الكريم رحمة للذين ينظرونه بنظر الاحترام ويتلونه بالقلب والإيقان، وإن الذين يهتدون به ويتلونه بنظر الإيمان ربما يضل كثيرمن الناس به لأنهم لايتلونه بنظر الإيمان ماهو شفاء ورحمة للمؤمنين ولايزيد الظالمين إلاخسارا.

القرآن حيّر عقول الناس: القرآن الكريم معجزة من معجزات رب العالمين الذي أدهش أهل الدنيا بإعجازه وحججه ، وإنه تحدّى الكفار أن يأتوا بمثله فلم يأتوا بذلك ، والذي يدل على هذا الأصل أن ذلك مذكور في القرآن الكريم في مواضيع كثيرة كقوله تعالىٰ: ﴿وإن كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فأتوابسورة من مثله وادعوا شهداء كم من دون الله إن كنتم صادقين۔البقرة / ٢٣﴾.

وكقوله تعالى :﴿أم يقولون افتراه فأتوا بعشرسورمثله مفتريات وادعوا من استطعتم من دون الله إن كنتم صادقين۔ هود / ١٣﴾﴿فإن لم يستجيبوا لكم فاعلموا أنما أنزل بعلم الله وأن لا إله إلا فهل أنتم مسلمون ـ هود / ١٤﴾فجعل عجزهم عن الإتيان بمثله دليلا على أنه منه ، ودليلا على وحدانيته .ومن ذلك قوله تعالى:﴿قل لئن اجتمت الإنس والجن على أن يأتوا بمثل هذا القرآن لا يأتون بمثله ولوكان بعضهم لبعض ظهيرا۔بني إسرائيل /٨٨﴾ فقد ثبت بمابيّنّاه أنه تحدّاهم ولم يأتوا بمثله.

القرآن كلام معجز: ويجب أن يعلم بعده أن ترك إتيانهم بمثله كان عجزهم عنه والذي يدل على أنهم كانوا عاجزين عن الإتيان بمثل القرآن ولو بآية وأنه تحدّاهم

حتى طال التحدي وجعله دلالة صدقه وثبوته وتضمن أحكامه استباحة دمائهم وأموالهم وسبي ذريتهم فلو كانوا يقدرون على تكذيبه لفعلوا وتوصلوا إلى تخليص أنفسهم وأهلهم وأموالهم .ومن حكمه : بأمر قريب هو عادتهم في لسانهم ومألوف من خطابهم.

دعوة القرآن الكريم: إن القرآن الكريم يدعو الناس إلى الله ورسوله ﷺ وينهاهم عن الكذب والشر،ويدعو الناس إلى الخيروالصدق كقوله تعالى :﴿ كنتم خيرأمّة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله ـ آل عمران / ١١٠﴾.

إن الدعوة الإسلامية هي رسالة الأمة الإسلامية الناشئة الخالدة وهي مجدهاوشرفها وعطاء ها الأعظم للإنسانية جمعاء، وهٰذه هي الرسالة التي أخرج الله الأمة الإسلاميّة لها.

ومن المعلوم أن العالم الإسلامي اليوم في أشدحاجة إلى دعوة تصلح شؤونه بالكلم الطيب والأسلوب الأنيق والقدوة الصالحة كماأن العالم كله في أمسّ حاجة إلى الدعوة الإسلامية التي لن يرى النور ولن يستقيم أمره الفكري والعهدي ،الخلقي والاجتماعي إلّا بها:﴿ كتاب أنزلناه إليک لتخرج الناس من الظلمات إلى النور بإذن ربهم إلى صراط العزيز الحميد ـ آل عمران / ١١٠﴾.

تعريف الدعوة : إنها إبلاغ الناس برسالة سيدنا محمد ﷺ وتذكيرهم بها ببيان أحكامها ومنزلتها في دين الله بالحكمة والموعظة الحسنة اقتداء به ﷺ .

وجوب الدعوة إلى الله:قال تعالى : ﴿ ادع إلى سبيل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن إن ربک هو أعلم بمن ضلّ عن سبيله وهوأعلم بالمفسدين ـ النحل / ١٢٥﴾ولا شک أن هٰذه الآية تشير إلى ماكان لازماً للداعي أثناء دعوته وهو الحكمة والموعظة الحسنة والجدال بالتي هي أحسن .والحكمة : هي العلم لحقائق الأشياء على ما هي عليه والعمل بمقتضاها.

والموعظة الحسنة :هي المقالة المشتملة على الموعظة الحسنة التي يستحسنها السامع وتكون في نفسه حسنة بإعتبار انتفاع السامع بها.

والموعظة الحسنة التي تدخل في القلوب بر فق وتعمّق المشاعر بلطف لا بالزجروالتأنيب في غير موجب لا بفضح الأخطاء التي قد تقع عن جهل أو حسن نية ،فإن الرفق في الموعظة كثيرا ما يهدي القلوب الشاردة ، ويؤلف القلوب النافرة ويأتي بخير أكثر من الزجر والتأنيب أو التوبيخ ، فليس من الحكمة أن يخاطب الداعي الناسَ بماهو فوق عقولهم ويكثر عليهم حتى يملّوا لا سيّما النبيّ ﷺ قد أمر أن يخاطب الناس على قدر عقولهم.

وكذلک ليس من الحكمة أن يفرط الداعي في ترغيب أو ترهيب بل يوازن بينهما ويتوسط بين الإنذار والتبشير.

وليس من الحكمة أن يد عو الناس إلى الصبر وهو متعجل في حديثه وأن يدعو هم إلى الرفق وهو متغيظ في كلامه .

وهٰذه الوسائل استعملها الأنبياء والرسل أثناء دعوتهم ولذلک كا ن الأنبياء والرسل نماذج الدعوة في تأريخ البشرية فيجب على الداعي أن يطالع سيرة الأنبياء والرسل في القرآن الكريم بدقة وإمعان ويسيرعلى سيرالأنبياء في دعوة الناس إلى الله تعالىٰ .أدعوالله تعالىٰ أن يوفقنا توفيقا كاملا للحصول على العلوم الدينية والإسلامية وتبليغها. ☆☆

☆هومتعلم في جامعة حضرة نظام الدين أولياء

الإسلام يدعو إلى إطاعة الوالدين

الاخ محمدعرفان البريلوي☆

من الواضح أن الأديان توجد في عدد كبير ضخم في العالم اليوم ولكنها ما اهتمّت بحقوق الوالدين وعظمتهما أكثر من الإسلام ، حيث قدم الإسلام حقوقهما على الحقوق بأسرها التي تعود إلى المرأ كما أمر الله عزوجل عباده بالمعاملة الحسنة مع الأبوين وإطاعتهما بعد عبادته مباشرا بقوله تعالىٰ : ﴿ واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا و بالوالدين إحسانا ﴾وقال الله عز وجل في مقام آخر: ﴿ فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما واخفض لهما جناح الذل من الرحمة ﴾حيث أكد القرآن في أمكنة عديدة أن إطاعتهما واجبة على الإنسان ومقدمة على الواجبات بأسرها بعد عبادته عز وجل وقال النبي ﷺ في شأن الأمهات :(الجنة تحت أقدام الأمهات).

وعن معاوية بن جاهمة سلمى قال:(أتيت النبي ﷺ فقلت : يارسول الله ! إني كنت أردت الجهاد معك، ابتغي بذلك وجه الله والدار الآخرة قال: ويحك ! أ حيّة أمك؟ قلت: نعم، قال: ارجع فبرّها، ثم أتيته من الجانب الآخر فقلت: يارسول الله !إني كنت أردت الجهاد معك ابتغي بذلك وجه الله والدار الآخرة قال: ويحك! أ حيّة أمك ؟ قلت: نعم، يارسول الله ! ويحك ! الزم رِجلها فثَمّ الجنة).

فالآية المباركة والحديث النبوي الشريف تدلان على أنه من يرد أن تكون الجنة مثواه فعليه أن يخدم الأبوين ويعاملهما معاملة حسنة ولا يقل لهما اي كلمة تؤذيهما .ومن الصريح أن النبي ﷺ وأصحابه قد التزموا بذلك للغاية وعند اطلاعنا على صفحات التاريخ نرىٰ أن الصحابة قاموا بخدمة الأبوين وبذلوا أقصى مجهوداتهم بهذا الصدد ولم يعرضوا عن إطاعتهما طوال حياتهم كما تدل على ذلك قصة صحابي وهي أنه قد أتى النبيّ ﷺ أحد أصحابه وقال : قد ذهبت بأمي إلى بيت الله عز وجل سبع مرات حاملا على كواهلي فهل أديت حقها ؟ يارسول الله ﷺ ! فأجابه قائلا: لم تؤد حق وجع الذي تحملت أمك عند ما وضعتك .

ويجدر بي أن أقدم إليكم قصة أخرى لما لها من صلة وثيقة بهذا الموضوع وهي أنه كان عبد الله بن سلام مشرفا على الموت فجاء إليه النبي ﷺ مع أصحابه حينما أخبر بذلك قال له: قل:لا إله إلا الله محمد رسول الله ولكنه لم يقدر على نطقها فسئل النبي ﷺ أين أمه؟ فأجابه أحد أنها في مقام آخر فأرسل بلالا إليها ولكنها ماجاء ت ثم أرسل علي بن طالب ـ كرم الله وجهه الكريم- فقدمت طوعا وكرها معه فطالبها النبي ﷺ أن تصفح عن ابنه فرفضت وهي تقول : لا أصفحه عنه لأنه تركني وحيدة لزوجته ، فلما تأبى أن تعفو عنه فأمر أصحابه بجمع الحطب ثم قال : أحرقوا عبد الله بن سلام فاغرورقت عينها وعفت عنه وبعد ذلك نطق عبد الله بن سلام الكلمة وارتحل من الدنيا .

فهذه القصة صريحة في أن رضا الوالدين أمر مهم، ولايفلح الإنسان بدون ذلك لا في الدنيا ولا في الآخرة،

لمن يريد الفلاح ويطلب النجاح بدون إطاعتهما فقد يضيع عمره في طلب المحال ما في ذلک من ريب. وأرىٰ من الملائم لنا أن نلقي نظرة عابرة خاطفة على مجتمعنا الحاضر ليكشف الغطاء عن وجه الحقيقة ويتجلىٰ لنا الوضع الحقيقي لهٰذا العصر الراهن، فلكم إلمام تام بهٰذا الصدد أنه قد تغيرت الأحوال وازدادت في قلوب الناس رغبة في المال وتركوا العمل بأوامره عزوجل ونواهيه، فكثير من الناس لا يلتفتون إلى الأبوين ولا يقيمون لهما وزنا بل يؤذونهم ويعذبونهم ألوانا من العذاب، ولا يأخذونهم إلى المستشفى عند ماأصابهم المرض الشديد ولا يدعون الطبيب إليهم لمعالجتهم.

و إلىٰ جانب أنهم يبذلون وافر المال في معالجة أولادهم ولو أصابهم مرض خفيف ويغدقون المال في حوائج الأولاد بالرغم من أنهم لا يصرفون حظا قليلا منه في حوائج أبويهم، ومنهم من يترک أبويه علىٰ شانهما عند ما بلغ أحدهما أو كليهما الكبر ليتحملا المصائب والألام، ومنهم من يسبونهم ويشتمونهم، وبعضهم يتجاوزون الحد في الظلم عليهما إلىٰ حد أن يضربونهما وتارة تقتلونهم بعد أن وجدوا الفرصة. قصارى القول أن اعتداء الناس على الأبوين وجورهم عليهما في ازدياد من يوم لآخر رغم أن الله سبحانه وتعالىٰ أمرهم بإطاعتهما أكثر من مرة.

☆هومتعلم في جامعة حضرة نظام الدين أولياء

The Causes of Decline

☆Gulzar Ahmad Nizami

The sad situation which the world is passing through is known to all. Some people target for their barbarity and aggression any country which they want, but the Muslim world does nothing. They take the Muslims for an easy target. Palestine, Labnon, Afganistan and Iraq are the living examples. After all, what is the reason that the Muslim countries are too weak and powerless to do any thing? While it is only the second largest community in the world. After deep consideration, some causes for this sorry situation have surfaced.

First cause: *Lack of religious education:* The Muslims would never have faced such a critical time if they had been equipped with religious learning, which is incumbent, along with modern education which the time calls for. This lack of religious education has weakened their *Iman* (Faith). Consequently, they have left their Islamic identity and practice. They are aping un-Islamic culture and values. The Holy Quran says " And be not sluggish and neither be grieved, you are the very same who shall overcome If have faith".

It is crystal clear from the above verse that the condition for being superior and sovereign is Faith. It will be a glaring mistake to think of success without Faith. It should be noted that unless *Iman* is strong and complete, one would face troubles.

Second cause: *Mutual differences:* The Muslims all over the world are prey to the stark inequalities due to communal strife, insurgency and civil war; above all, the spark was ignited by religious factionalism. For instance, Iraq is being ripped apart by summi-shia conflict; Lebanon is dragged into civil war along religious lines; Sudan is struggling with tribal conflict; The genocide in Darfur is the result of mutual differences; Palestine witnesses the factional conflict between Hamas and Al-Fattah and so on.

Third cause: *The Muslims' senselessness;* History tells us that whenever a nation loses its sense, it is devastated. The Muslims across the world are labeled as terrorist and extremist and are killed as such. Islam, the peace loving religion, is being targeted, its teachings are being distorted and laughed at in the Media. Even the mosques

Many countries, in the world, are considered to be developed in the economic field due to industrialization. But Muslim countries lag behind others in this respect also.

Seventh cause: *Ignorance about the enemies:* The Muslims are not aware of the conspiracies hatched by their enemies all over the world. They play in their hands and some times, help them knowingly or unknowingly: It is a paradox that the estrange their Muslim brethren and befriend the non-Muslims. They do not try to maintain unity among themselves. This gives a gold opportunity to the anti-Muslim powers to serve their own ends.

☆Mr. Gulzar Ahmad is a final-year student at Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia 22-Zakir Nagar, Okhla, New Delhi-25. He belongs to Hazari Bagh in Jharkhand.

and the Islamic monuments are being demolished but the Muslim leaders are no less than passive spectators. They dare not utter even a single word against their opponents. Further more; it is surprising that a few of them dance to the tunes of the blasphemers.

Fourth cause: *The economic problem:*
The Muslim countries are extremely weak in the economic field. That is a hurdle to progress and a cause for the decline of the Muslim states.

Fifth cause: *Science and Technology:* Few skilled scientists are found and well-known science and technology institutes are seen in the Muslim countries. On the other hand, No country in the Muslim world had as many university as Japan alone.

Sixth cause: *No Industrialization:*

صبح کا وقت ہے آقا مری جھولی بھر دو
کٹ گئی رات یونہی دستِ طلب پھیلائے
ٹوٹ جائے غم و کلفت کی چٹانوں کا غرور
سبز گنبد سے اگر دل کی صدا ٹکرائے
آ گئے والیِ بطحا کی اماں میں ارشدؔ
کہہ دو آنا ہے تو اب پیکِ اجل آ جائے

(علامہ ارشد القادری)

HAZRAT KHWAJA GAREEB NAWAZ

☆ Naseem Akhtar Nizami

No doubt, India is the abode of *Aulia -e Karam* (Muslim saints), who served Islam in various ways. As a result of their efforts, Islam spread all over the country. Among them, the name of Khwaja Gareeb Nawaz (May his soul rest at peace!) is prominent and well-known in the Muslim world. It was he, who was followed by the people and they embraced Islam at his hand. He removed all the hurdles which tried to stop him from his mission in one way or the other. He gave a call to shun all the false and evil practices, preached by the religions, prevalent in India.

Hazrat Khwaja Gareeb Nawaz was born at Sagistan in Iran, in 534, A.H. to Gayath al Din and Mahe Noor with a silver spoon in his mouth. His real name was Muinuddin. The family was highly religious and completely devoted to Allah. His early schooling was done at home under his father's supervision in a short span of nine years, after learning the Holy Quran by heart; he was admitted to a madarsa for receiving education in Tafsir, Hadith and Fiquah. In a very short time, he got lots of knowledge by virtue of his intelligence and hard labour. At the tender age of fifteen years, his father passed away, leaving in patrimony, an orchard and a water-mill. For the sake of high religious education, he had to go away from his country to various cities where the great institutions were situated. Among his teachers, Maulana Ghyath al Din and Maulana Sharfuddin are the most famous ones. In 1187, he set out to Makka for paying a visit to the holy Kabah. As he was busy in worship and meditation, he heard a voice which said "we have chosen you and your prayers will be granted." From Makkah he proceeded to Madinah and he was enstrusted the dominion of India and was asked to go to Ajmer to remove the darkness of evils over there.

In accordance with the will of Allah, he reached Ajmer along with a large number of his devoted followers. In Ajmer, he stayed under the shadow of a tree away from the city. The men of Prithvi Raj chauhan, the king of the city, came to him and said, " The camels of the king are tied to this tree " "The camels will remain tied," was the answer. The next morning, having been tired of making the camels stand, they came to Khwaja to apologize for their rude behavior. They were forgiven by him who said that they (the camels) had already been ordered to stand up. The followers of the king also tried to prevent him from staying near the Anasagar lake and to harm him, but he took a handful of soil and threw it upon them after reciting the verse of "*Ayatul kurṣi*". He, upon whom this soil fell, was destroyed.

Seeing the success of the truth, the king became worried about his kingdom and contrived to crush the truth like Pharaoh. He thought that people were attracted towards him because of magic. The greatest magician, Jogi Jaipal, was invited to compete with him. He came along with about fifteen thousands companions for the competition. A large number of people were present on the spot to see the competition. When the competition began, Jogi Jaipal used all the arrows of him quiver but he did not succeed.

Then, finally he accepted his defeat and embraced Islam. Seeing their leader embrace Islam, the companions too entered the fold of Islam. They were followed by many others.

After serving Islam for forty years, the time came when he left for his heavenly abode and finally the sun of guidance set up after lighting up the hearts of millions of people to carry on his mission. He, will indeed, be remembered by the generations to come till the last day.

From the day when he breathed his last, thousands of people, irrespective of caste, and creed visit his shrine and pay homage to him every day. The anniversary of his *Urs* is also celebrated on the sixth day of Rajab ul- Murajjab, a month of the Islamic calendar.

☆ *Mr. Naseem Akhtar is a final-year student, at Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia 22-Zakir Nagar, Okhla, New Delhi-25. He belongs to Mau in Uttar Pradesh.*

علامہ ارشدالقادری چیریٹیزانٹرنیشنل کے زیر اہتمام

تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدقیق کے میدان میں ایک صحت مند انقلاب کی دھمک رئیس القلم تحقیقی مقابلۂ تصنیف

عناوین:۔ مطالعۂ سیرت

(مستشرقین کے افکار وخیالات کے پس منظر میں)

یا

(دور حاضر میں مسلمانوں کے رسم ورواج کا محاسبہ سیرت رسول کی روشنی میں)

پہلا انعام: برکاتی رئیس القلم ایوارڈ مبلغ گیارہ ہزارروپئے،ایک دیدہ زیب شیلڈ اور طباعت کتاب

دوسرا انعام: رضوی رئیس القلم ایوارڈ مبلغ پانچ ہزارروپئے اورایک دیدہ زیب شیلڈ

تیسرا انعام: عزیزی رئیس القلم ایوارڈ مبلغ تین ہزارروپئے اورایک دیدہ زیب شیلڈ

(۱) ہر سنی صحیح العقیدہ طالب علم، استاذ، دانشور اور مصنف حصہ لے سکتا ہے۔(۲) کتاب لکھ کر جمع کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ نومبر ۲۰۰۸ء ہوگی۔(۳) انعام یافتگان کو عرس قائد اہل سنت میں حاضر ہونا ہوگا۔ اسی موقع پر انہیں انعام دیا جائے گا نیز اسی موقع پر اول آنے والی کتاب کی رونمائی بھی کی جائے گی۔(۴) اس مقابلے کے حوالے سے جج صاحبان کا فیصلہ آخری ہوگا۔

تصنیف کے لیے ضابطہ:۔ (۱) کتاب کم از کم دوسو یا زیادہ سے زیادہ سوپچیس صفحات پر مشتمل ہونی چاہیے۔(۲) کتاب میں مستعمل ہونے والے مصادر ومراجع کو بالالتزام لکھا ہونا چاہئے۔(۳) پہلی بار لکھے جانے والے مصادر ومراجع کی تفصیلات یوں درج ہونی چاہیے۔ ہر صفحہ کے نیچے نمبر ڈال کر ماخذ کا نام لکھیں۔ اس کے بعد صاحب ماخذ کا نام۔ جلد نمبر (اگر کتاب کئی جلد پر مشتمل ہو)۔ صفحہ نمبر لکھیں۔ تاریخ اشاعت ماخذ درج نہ ہوتو (ت: غیر موجود) لکھیں اور اگر ایڈیشن نہ لکھا ہوا ہوتو (ط: غیر موجود) لکھیں۔ دارالاشاعت کا نام لکھیں۔ اور اگر مطبع کا نام لکھیں اور اگر مطبع کا نام درج نہ ہوتو (مط: غیر موجود) لکھیں۔

نوٹ: پہلی بار یہ ساری تفصیلات لکھیں، پھر دوبارہ اگر اسی مصادر یا مراجع کی ضرورت پڑے تو صرف کتاب کا نام، جلد اور صفحہ نمبر لکھیں۔(۴) کتاب کے ضمن میں مذکورہ شخص یا جگہ کا مختصر تعارف حاشیہ میں درج کریں۔(۵) کتاب کے اخیر میں سارے مصادر ومراجع کی اجتماعی فہرست ضرور لکھیں۔(۶) کتاب کے اخیر میں ایک فہرست بنام ''فہرست اماکن'' اور دوسری ''فہرست اشخاص'' کے نام سے ہونی چاہیے جس میں ان تمام افراد یا جگہوں کا ذکر ان کے صفحہ نمبر کے ساتھ ہو جو کتاب میں مذکور ہوا۔(۷) کتاب یا تو کمپیوٹر پر ٹائپ شدہ ہونی چاہیے یا صاف رسم الخط میں تحریر شدہ۔

کنوینر رئیس القلم تحقیقی مقابلۂ تصنیف

مدرسہ فیض العلوم دھتکیڈیہ جمشید پور جھارکھنڈ

فون: 0657-2228277

Hazrat Allama Arshadul Qadri & Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia

☆Mr. M. Sajjad Alam

Hazrat Allama Arshadul Qadri (May his soul rest at peace!), a prominent Sunni *Alim* (scholar), was a noted personality not only in India but abroad also for his unforgettable contributions in the field of spreading the true version of Islam, taught by the Holy Prophet (Peace be upon him!) and propagated by Imam Ahmad Raza (May Allah grant peace to his soul!). He possessed an epoch-making, credible and multi-faceted personality. He was an excellent writer, a stylist literary figure, a highly qualified *Munazir* (debater) and a world-renowned founder of many madrasas, mosques and organizations.

Birth and Family: He was born at "Syedpura", a small village at Balia in eastern Uttar Pradesh (India) in about 1925 and came of a religious and academic family. His father, Hazrat Maulana Abdul Lateef was a product of the widely known 'Madrasa Hanafiyah at Jaunpur, a Murid (spiritual disciple) of Shah Abdul Aleem Aasi of Ghazipur, (May his soul rest at peace!) and a true lover of Sarkar-i-Baghdad Hazrat Shaikh Abdul Qadir Jilani. In the same way, his grandfather, Hazrat Mulana Azeemullah Shah and tow of his cousines, Hazrat Maulana Ghulam Mohiyuddin and Hazrat Maulana Mohammad Yahya Alimi were accomplished *Alims* of their times.

Education and Upbringing: Hazrat Allama received his primary education at his house and learned the basic books form his father and grandfather (May their souls rest at peace!). Then, his elder brother, Shah Ghulam Aasi (May his soul rest at peace!), who was a great *Alim* adn Sufi took him to the widely famed Darul Uloom Ashrafia at Mubarakpur. Here, he enjoyed the kind patronage of Hazrat Hafiz-i-Millat Shah Abdul Aziz Moradabadi (May Allah grant peace to his soul!) who trained and nurtured him very affectionately. Hazrat

Allama stayed there for eight years and benefited himself spiritually and academically from the blessed company of Hazrat Hafiz-i-Millat. Thus, he grew up to be a world-renowned scholar. He passed out from Darul Uloom Ashrafia, Mubarakpur in 1944. Since then, he engaged himself in serving the religion and the *Jama'ah* (community) for about half a century.

Literary Works: Allah, the Exalted, had gifted Raisul Qalam Hazrat Allama Arshadul Qadri with many qualities. He was a teacher, writer, far-sighted thinker and great statesman. On one side, he taught at madrasas and produced hundreds of Ulama, on the other, he gave the community valuable books on burning issues. His writings were cogent, and his style, simple and easy to understand. In his writings, he demonstrates boldness, straightforwardness and temerity. Some of the books he wrote, are listed below:

Mohammadur Rasullah Qur'an Mein (2)*Tableeghi Jama'at* (3) *Zalzalah* (4) *Zer-o-Zabar* (5) *Anwaar-i-Ahmadi* (6) *Dil Ki Muraad* (7) *Jalwah-i-Haq* (8) *Shari'at* (9) *Lisaanul Firdaus* (10) *Misbaahul Qur'an* (Three Volumes) (11) *Naqsh-i-Khatam* (12) *Lalah Zaar* (13) *Tafseer-i-Surah-i-Fatiha* (14) *Khutbaat-i-Istiqbaaliyah* (15) *Tajilliyaat-i-Raza* (16) *Da'wat-i-Insaaf* (17) *Ta'zeerat-i-Qalam* (18) *Aik Walwalah Angez Khitaab* (19) *Shakhsiyaat* (20) *Hadith, Fiqh Aur Ijtihad ki Shar'ee Haisiyat* (21) *'Aini Mushadaat* (22) *Bazubaan-i-Hikaayat* (23) *Izhaar-i-'Aqeedat* (a collection of poems) (24) *Afkaar wa Khayaalaat* (a collection of articles) (25) *Sadaa-i-Qalam* (a collection of letters) (26) *Jama'at-i-Islami*

Organizational Contributions: Hazrat Allama was bestowed with organizational and managerial talents and expertise. These talents stood him in good stead and helped him even in areas, dry in resources. With his intelligent and strategic skills, he turned the desert into a blooming garden. He founded a madrasa here and a mosque there. He was always in the forefront in activities related to organizations and movements. In short, he discharged his duty in organizing and uniting the community (of Ahlus Sunnah) and earned name and fame for his organizational talents and skills. Thus, he founded many madrasas, mosques and educational, cultural and organizational centres both in India and abroad. A few of them are as follows:

Educational Institutes founded abroad by Hazrat Allama: (1) Jamia Madinatul Islam (Den Hague, Netherlands) (2) Islamic Missionary College (Bradford, Britain) (3) Darul Uloom Aleemia (Surinam, America)

Preaching Centres founded abroad by Hazrat Allama: (1) *World Islamic Mission*: This Mission was founded at Daar-i-Arqam in Makkah Mu'azzamah. The head office of this mission is in London. (2) *Da'wat-i-Islami*: This is an international Tableeghi (preaching) centre which was founded in Karachi. Hazrat Maulana Ilyas Qadri was appointed as the Ameer at Darul Uloom Amjadia.

Religious, Cultural and Organizational Institutes founded in India by Hazrat Allama: (1) Idaarah-i-Shar'iayh [Shar'ee Council] (Patna, Bihar) (2) All India Muslim Personal Law Conference (Siwan, Bihar) (3) All India Muslim United Front (Raipur, M. P.)

Educational Institutes founded in India by Hazrat Allama : (1) Madrasa Faizul Uloom (Jamshedpur, Jharkhand) (2) Darul Uloom Ziyaul Islam (Howrah, Bengal) (3) Darul Uloom Makhdoomiyah (Guhati, Assam) (4) Madrasa Madinatul Uloom (Mysore Road, Bangalore) (5) Madrasa Miftahul Uloom (Nalah Road, Orissa) (6) Madrasa Islami Markaz (Ranchi, Jharkhand) (7) Darul Uloom Gulshan-i-Baghdad (Hazari Bagh, Jharkhand) (8) Jamia Razviyah Ghausiya (Saharanpur, U. P.) (9) Madrasa Madinatur Rasool (Kodarma, Jharkhand) (10) Madrasa Mazhar-i-Hasanaat (Ramgadh, Jharkhand) (11) Falahi Markaz (Azaad Nagar, Jharkhand) (12) Madrasa Tanweerul Islam (Telco, Jharkhand) (13) Darul Uloom Rashidiyah Razviyah (Syedpura, Balia, U. P.) (14) Madrasa Azizul Islam (Jagsalai, Jharkhand) (15) Faizul Uloom Middle High School (Jawahar Nagar, Jharkhand) (16) Faizul Uloom High School (Dhatkideh, Jharkhand) (17) Madrasa Aziziah (New Rani Kodar, Jharkhand) (18) Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia (Zakir Nagar, New Delhi)

Mosques founded in India by Hazrat Allama: (1) Faizul Uloom Makkah Masjid (Jamshedpur, Jharkhand) (2) Noorani Masjid (Jamshedpur, Jharkhand) (3) Qadri Masjid (Telco, Jharkhand) (4) Masjid Miftahul Uloom (Rawar Kela, Orissa) (5) Masjid-i-Ghausiyah (Ranchi, Jharkhand) (6) Masjid-i-Ahl-i-Sunnat (Kodarma, Jharkhand) (7) Madinah Masjid

(Azad Nagar, Jharkhand) (8) Madina Masjid, (Musa Bani, Jharkhand)

Note: The list includes the mosques for which Hazrat Allama himself bought the plo[t] and got them built under his supervision and the mosques for which he had formed [a] committee of the locals and handed the responsibility of construction works to them.

National and International Conferences: The intellectual caliber and writing skil[ls] of Hazrat Allama were acknowledged by all. Therefore, he was invited to attend the nationa[l] and international conferences. His presence stood surety of the success of a conference. Th[e] names of a few conferences he attended as a delegate are as follows:

International Conferences attended by Hazrat Allama: (1) Mu'tamar-i-Jam'iya[t] wa Jam'aat (Tehran, Iran) (2) Mu'tamar al-Da'wah al-Islamiah al-Aalamiah (Tripoli, Libya) (3) Hijaz Conference (London, Britain) (4) Imam Ahmad Raza Conference (Karachi, Pakistan) (5) Mu'tamar-i-Muballigh-i-Azam Maulana Abdul Alim Siddiqi (Amsterdam, Netherlands) (6) Mu'tamar al-Alam al-Islami (Baghdad, Iraq) (7) World Milaad Conference (Karachi, Pakistan)

All India Conferences attended by Hazrat Allama: (1) All India Sunni Jamee'at Ulama Conference (Kanpur, U. P.) (2) All India Ta'eelimi Conference (Mubarakpur, U. P.) (3) Mufiti-i-Azam International Conference (Mumbai, M. R.) (4) All India Muslim Personal La[w] Conference [for arrest] (Lucknow, U. P.) (5) Kashmir Conference (Jamshedpur, Jharkhand)

Conferences convened in India by Hazrat Allama: (1) All Bihar Conferenc[e] (Siwan, Bihar) (2) All India Sunni Awqaaf Conference (Delhi) (3) All India Muslim Persona[l] Law Conference (Siwan, Bihar) (4) All India Sunni Conference (Delhi)

This is a brief biographical sketch of Hazrat Allama Arshadul Qadri. It is difficult t[o] mention all the contributions Hazrat Allama had made in the field of preaching an[d] propagating the teachings of Islam. However, the brief description of his contributions to the cause of the Ahle Sunnah makes it clear that he was a revolutionary, far-sighted, venturesome leader who was well aware of the vicissitudes of the age. He led the community (of Ahlus Sunnah) at the tumultuous time when the horizon looked dark and dreary. There was no ray of hope. People had gone to such extremes that the future was overcast with disappointment and

despair. At this crucial time, it was he who led the community to a better destination. Perhaps, Allama Iqbal had composed the following verse about people like him:

Although the wind is strong and violent,

The saintly person Whom Allah has granted royal dignity,

Is lighting up his lamp.

In short, a saintly man gave a new lease of life to and raised the intellectual standard of the community (of Ahlus Sunnah). He always tried to make us aware of his observations and experiences in Europe, America and the Islamic world. He cultivated and instilled in our hearts the love for the Holy Prophet (Peace be upon him!). Sometimes he went abroad to preach the universal message of Islam, sometimes he traveled from Kashmir to Kanyakumari for the same purpose. He became the voice (spokesperson) of the Ahlus Sunnah and echoed in the country and abroad. He burnt himself like a lamp and guided others.

SAD DEMISE: Alas! This sun set on 29th April, 2002. (*Inna Lillahi wa Inna Elaihi Raaji'oon*) But he has left behind indelible footprints for us. Extraordinary achievements make a place in the pages of history for themselves. One is compelled to praise them. They are like the musk which diffuse fragrance everywhere and benefits all. Today, Hazrat Allama is no more with us but the fragrance of his memory emanates from each of his memorable deeds. May Allah, the Exalted, give us a good substitute for him! Amen!

JAMIA HAZRAT NIZAMUDDIN AULIA

Hazrat Allama Arshadul Qadri has founded many madrasas throughout the country but Jamia Hazrat Nizamudddin Aulia is a unique madrasa of its kind. He took great pains to build it, exerted all his energies and surmounted all the difficulties created by the wrong religious groups to prevent him from accomplishing the mission he cherished for a long time.

This Jamia, situated in Delhi, is a unique institute, well reputed for its prominent characteristics. This institute was founded in 1989 by Allama Arshadul Qadri (May his soul rest at peace!). The academic session of the Jamia started on 22nd April, 1995. The Jamia has created a new chapter in the history of the Ahl-e-Sunnah and produced a team of the Ulama

who are well-equipped with the necessary talents to cope with the challenges of this modern age. They will also be supposed to play a prominent role in the promotion and propagation of Islam and Sunniyat.

Hazrat Allama Arshadul Qadri was a far-sighted thinker and a conscious leader with a sensitive heart. He always felt the needs of the community. He describes his bitter feelings in the following words: "This feeling, that we are losing our significance and importance in today's world, stings my heart like a thorn. The absence of Ulama who have mastery over international languages and are able to lead the modern world is a big problem for all of us. Due to the paucity of resources, we could not establish our contacts with the Arab world despite the fact that the majority in those countries are closer to us in terms of beliefs and cultural traditions. Had we strengthened our relations with the Arab countries, it would have opened up new avenues for exchange of knowledge, thoughts and mutual cooperation. This also would have provided our Ulama with opportunities to employ their talents. But it is lamentable that we took no notice of such a basic need. This is no less than a warning that, in the English speaking countries of Europe, the Ahlus Sunnah wal Jam'ah have several religious centres where they need such Ulama (Imams and teachers) as have mastery over English, a good understanding of religious education and teachings and the ability to influence the modernist minds. But it is regrettable that we paid a blind ear to this demand also and could not produce such Ulama, despite the acute need."

Hazrat Allama, further tells the tale of his sorrows and anxieties: "The Ulama who are passing out from our madrasas these days, have only three options- mosques, madrasas and stages (for delivering speeches). The less qualified join the mosques; the somewhat qualified go to the madrasas while the well qualified (who are the most conscious ones also) take up *taqreer* (delivering speeches) as their profession. By the virtue of their fame, this group (of speakers) enjoys recognition among the masses and possesses the necessary ability to think of and work for the community. But their lives are like running water. Due to constant journeys, they do not find time enough to lead a movement."

These were the factors that compelled Hazrat Allama Arshadul Qadri to set up Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia. Hazrat Allama says: "These are the factors which have pushed us towards decentralization. One will hardly find a community whose members, despite their numerical strength, are so insignificant. Under these circumstances, we have realized that we acutely need such Ulama as will be equipped with all the necessary qualifications of penmanship, language and mental strength. If we fail in preparing such individuals through ideological and linguistic training, we will cut ourselves off form the developed countries and gradually become a part of the lost pages of history. With this feeling, we have decided to set up a training centre, "Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia" in Delhi to make our community keep pace with the academic and professional demands of this modern age. We have acquired a plot at Zakir Nagar, a largely Muslim-populated locality near Jamia Millia Islamia and relying upon divine help, started the construction works of a five-storeyed building. Thanks to Allah, we completed the construction works within two years, with the financial help from our generous well-wishers. Since this was a unique work of its own kind, we ourselves had to chalk out the plans and design the syllabus and educational system with active cooperation from our colleagues."

This is a brief description of how Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia, came into being, in the words of the founder himself.

Nomenclature: Since this Jamia was founded at Zakir Nagar, a largely Muslim populated locality of Delhi which is believed to be the chaukhat (court) of twenty two khawjaș for Dawah works, it was named after Hazrat Nizamuddin Aulia (663-725 A. D.), one of the leading personalities who played a pivotal role in preaching and propagating Islam in India with the hope that it might become a centre for propagating and preaching Islam and remain active in promoting the teachings to which Hazrat Nizamuddin had devoted every moment of his life at a time when everywhere conspiracies are hatched to defame and distort its true face. Sultanul Mashaikh Hazrat Nizamuddin Aulia (May his soul rest at peace!) brought, to the fold of Islam, many people who were groping in the darkness of infidelity and ignorance. This is a

fact that the light of Islam which is visible in today's India is the result of the constant efforts these saintly personalities made in the field of promotion and propagation of Islamic teachings. By the virtue of his blessed company, many people who had gone astray, returned to the right path and many more embraced Islam. His teachings were for all. People from all religions and creeds respected him.

Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia: a need of time: Many madrasas in India are active in spreading and promoting Islamic arts and sciences. The needs of the society these products of the madrasas fulfill are known to all. This Muslim Ummah is also a Dawah Ummah (hence it deserved to be called the best community). However, it is a fact that these days they are negligent of this important aspect of an Islamic life that deals with dawah works and their sublime goals. Perhaps, this is the main reason why madrasas are producing neither *Du'aat* nor *Muballigheen* (preachers / missionaries). This has rendered the mission of *Dawah* and *Tableegh* weak and ineffective.

This is the background of how "Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia" was founded, keeping in view the highest goal of propagating the universal message of Islam throughout the world. The Jamia aims at teaching the students international languages such as Arabic and English and training them for leadership so that they may discharge the duty of propagating the Deen (Islam) along with *Dawah* and *Tableegh*, sincerity and dedication, beliefs and thoughts, piety and cleanliness, vision and insight among the non-Muslims and bring them closer to Islam.

Departments of Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia: Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia is a well organized movement. It has a comprehensive plan comprising curtains educational, cultural and training programmes. At present, this Jamia consists of two *Kulliyaat* (departments).

1. Kulliyatul Qur'an
2. Kulliyatul Adab wal Da'wah

Kulliyatul Qur'an: The Kulliyatul Qur'an consists of three departments: (a) The

Department of Hifz: This department was formed for the local students in particular and for the outer (external) students in general. At present, more than twenty students are studying in this department. The oral test for admission to this department is held in the second week of the month of Shawwal. (b) The Department of Tajweed and Qira'at: In this department, the students are drilled in the science of Tajweed (intonation and phonetics) of the Holy Qur'an. They are also taught the etiquettes and principles of reciting the Holy Qur'an so that they may recite it in the same tone as it has been ordered to be recited. (c) The Department of Nazira: This department has been formed specially for the children of the locality so that the old proverb "*Chiragh tale andhera*" (Darkness prevails at the lamp's base.) should not be repeated and people may get benefited more and more from this Jamia. Special attention is paid to teach the students how to recite the Holy Qur'an with correct *Makhaarij* (outlets for sounds of letters) and pronunciation.

Kulliyatul Adab wal Da'wah: This very department is the central one for which the Jamia was established. Hazrat Allama Arshadul Qadri writes in an Introductory Booklet of the Jamia:

"Today, the most difficult problem is to prepare well-qualified scholars to shoulder the serious responsibility of leading the Muslim community towards the right destination. Therefore, they are supposed and required to be well-equipped with extensive knowledge and right ideology and well-versed in different languages spoken throughout the world. We will not be able to create a place in the heart of the people unless and until we equip our young Ulama with resources necessary for propagating and preaching Islam."

In fact, this department was established with a view to eduate and train the graduates of traditional madrasas in modern education and familiarize them with the dynamics and methods of Da'wah works. The students of traditional madrasas do not have mastery on a particular subject or discipline as they have to read various subjects included in the Nizamia syllabus prescribed in those madrasas. Much attention is also not paid to Arabic and English languages and thus their students lag behind others in this field.

This Kulliyah has an excellent and comprehensive syllabus which consists of Islamic studies and Arabic and English literatures. Special arrangements have been made to teach the students how to read, write and speak in Arabic and English. They are also imparted education in the branches of classical and modern education. In addition to this, they are trained theoretically, practically and academically through cultural and co-curricular activities so that they may become conscious of discharging their duties and developing their creative skills.

This residential training centre, equivalent to the college standard, has been formed for the *Farigheen* Ulama (products) of the madrasas. They get admission to this Kulliyah through a written test and an interview. Preference is given to the intelligent and meritorious students.

The Ulama, Mashaikh and intellectuals who have visited the Jamia, have admired the educational system and expressed their hope that this institution is likely to bridge over the gap between the traditional madrasas and the modern academic institutes.

This deserves special mention that this Jamia has created awareness in the madrasas in India where the authorities are paying heed to the demands of time. They are following the system introduced by this Jamia. They are chiefly inspired by the products of this Jamia, who are performing commendable deeds in the propagation of Islam with their writings and speeches.

This is quite clear that Hazrat Allama has bequeathed a rich heritage to us. Now, we will have to prove ourselves as true successors to him by carrying on the mission he strived for throughout his life. We pray to Allah, the Exalted, to shower His mercy upon the grave of Hazrat Allama. May this Jamia flourish and progress and fulfill the wishes of Hazrat Allama!

☆ *Mr. M. Sajjad Alam Rizvi teaches English at Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia. He belongs to Uttar Dinajpur in West Bengal.*

منقبت درشان قائد اہل سنت

غنچۂ فکر: مولانا علی احمد سیوانی صاحب

واصفِ صلِ علیٰ علامہ ارشد قادری ذاکرِ رب العلی علامہ ارشد قادری
جاں نثارِ مصطفےٰ علامہ ارشدقادری عاشق غوث الوریٰ علامہ ارشدقادری
خدمتِ دینِ مقدس کی بدولت دوستو پاگئے خلدِ خدا علامہ ارشدقادری
مسلکِ حق کی اشاعت عمر بھر کرتے رہے پرتوِ احمد رضا علامہ ارشدقادری
ہم سدا چلتے رہیں گے نقشِ پاپہ آپ کی رہبروں کے رہنما علامہ ارشدقادری
ادوئے تقریر کی اب تک جہاں میں دھوم ہے واعظِ شیریں صدا علامہ ارشدقادری
سیکڑوں دینی کتابوں کے مصنف آپ ہیں کہتے ہیں سب برملا علامہ ارشدقادری
جامعہ حضرت نظام الدین کے بانی ہیں آپ جس کا شاہد ہے خدا علامہ ارشدقادری
کیوں نہ آئیں عرس میں اہلسنن باچشم نم سنیوں کے پیشوا علامہ ارشدقادری
آپ کی تحریر تکہت بار سے کہتے ہیں لوگ ہے عیاں رنگ حنا علامہ ارشدقادری
خدامتِ دین کے سبب یوں عالمانِ دین کے دل میں ہیں جلوہ نما علامہ ارشدقادری
ساری دنیا میں مدارس دین کے قائم کئے یہ ہے احساں آپ کا علامہ ارشدقادری
آپکے دم سے ہے قائم دوسرے ملکوں میں بھی دین کی روشن فضا علامہ ارشدقادری
محفلِ دانشوری وبزم علم وفضل میں تذکرہ ہو گا سدا علامہ ارشدقادری
آج ہی لکھی ہے میں نے یہ درخشان منقبد کیجئے مجھکو دعا علامہ ارشدقادری
یہ علیِ خوشنوا بھی آپ کا مداح ہے کیجئے کچھ تو عطا علامہ ارشدقادری

خراج عقیدت

نتیجۂ فکر: مولانا علی احمد سیوانی صاحب

مدح خوانِ عظمتِ پیغمبرِ ذی شان ہے
درسگاہِ دینیہ کا یہ بلند ایوان ہے
جامعہ حضرت نظام الدین کیا شان ہے
جاں نثارِ اہلبیتِ سرورِ ذی شان ہے
عظمتِ دینِ شہ کونین پر قربان ہے
حق پرستی پر فدا حق بات پر قربان ہے
اِس کی رونق پر فداہر صاحب ایمان ہے
لعل ویاقوت وزمرد کی حسیں اِک کان ہے
علم کا دریا رواں ہے ہر طرف دلّی میں آج
ارتقا کی منزلوں سے ہو رہا ہے ہمکنار
ہم کہاں جائیں بتاؤ خوشبوئیں اب ڈھونڈنے
اِس کی عظمت، اِس کی رفعت، اِس کی شوکت دیکھ کر
کوئی اِس کا بال بیکا ہند میں کیسے کرے
فارغینِ جامعہ جاتے ہیں پڑھنے مصر کو
اِس کی عظمت، کے ترانے گونجتے ہیں چارسو
دیکھ کر اِس کی ترقی دیکھ کر اِس کا عروج
جامعہ حضرت نظام الدین کا فیضان ہے
بادِ صرصر سے قیامت تک رہے محفوظ یہ
لبانِ علم وفن آئیں نہ کیوں اب دور سے
شیطنت کا زور زائل ہر گھڑی کرتا ہے یہ
تا ثریا اِس کو ہم پہونچاکے دم لینگے ضرور
جہل کی تاریکیاں سب لوحِ دل سے مٹ گئیں
اہل سنت پر یقیناً آج کے اِس دور میں
اِس کے بانی شاہ ارشد قادری تو آپ ہیں
جامعہ ھٰذا کے بانی شاہ ارشد آپ ہیں
اس کے بانی بھی ہیں بیشک شاہ ارشد قادری
اِس کے بانی آپ ہیں علامہ ارشد قادری
کیوں نہ روشن آکے دلّی اے علیؔ دل کو کروں

جامعہ ہٰذا سدا سے ذاکر رحمٰن ہے
یہ حیات وزیست کی تحریر کا عنوان ہے
بچّہ بچّہ اس کا بیشک علم کا سلطان ہے
جامعہ ہٰذا یقیناً رحمتِ رحمٰن ہے
ترجمانِ مسلکِ احمد رضا ہر آن ہے
جو نہ مانے اس حقیقت کو وہی نادان ہے
مردوزن، پیر وجوان ہر آدمی قربان ہے
بحرِ علم وفن کا بیشک لولو ومرجان ہے
جامعہ ھٰذا درسگاہوں کی بیشک شان ہے
یہ مسلمانوں کی دلّی میں علیؔ اِک شان ہے
یہ گلستانِ جناں کا مشکبو ریحان ہے
ہر گروہِ اصفیا خوشنود ہے فرحان ہے
اِس کا حامی، اِس کا ناصر صاحبِ قرآن ہے
اِس پہ کردوں جاں فدادل کا میرے ارمان ہے
اِس پہ کردوں جاں فدادل کا میرے ارمان ہے
حاسدینِ وقت کے ذہنوں میں اک خلجان ہے
حق وانصاف ومروت کی حسیں پہچان ہے
یہ دعا ہر آدمی کی ہر گھڑی، ہر آن ہے
طا یہ شعور وعلم کا بیشک حسیں ایوان ہے
محوِ گریہ دیکھ کر اِس کو سدا شیطان ہے
'جامعۂ دہلی' میں بیشک مرکزِ ایمان ہے
علم کی شمع کا بیشک یہ تو شمع دان ہے
حضرتِ علامہ ارشد کا بہت احسان ہے
شاہد عادل یہاں کا ہر بشر ہر آن ہے
شاہدِ عادل یہاں کا ہر بشر ہر آن ہے
شاہدِ عادل یہاں کا ہر بشر ہر آن ہے
شاہدِ عادل یہاں کا ہر بشر ہر آن ہے
جامعہ ھٰذا سراپا جلوۂ عرفان ہے

اعلان داخلہ

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء اپنی نوعیت کا ایک منفرد ادارہ ہے، جسے قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر جدید عربی زبان و ادب اور انگریزی میں ماہر علماء کی ایک نئی نسل تیار کرنے کے لیے ۱۹۹۴ء میں سرزمین دہلی پر قائم فرمایا۔ یہاں مدارس کے فارغ علماء کو دوسالہ کورس (تخصص فی الادب و الدعوۃ) کے ذریعہ عربی اور انگریزی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس ادارہ کا الحاق دنیا کی عظیم و قدیم ترین یونیورسٹی جامعہ ازہر (قاہرہ، مصر) سے ہے۔ جہاں ہر سال ایک قافلہ بھیجا جاتا ہے اور اب تک کئی علماء ازہر سے فارغ ہو کر دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام وسنیت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

علاوہ ازیں اس ادارہ میں حفظ وقرأت کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔ ماہر اساتذہ کے ذریعہ طلبہ کی دیکھ ریکھ ہوتی ہے۔ داخلہ میں محنتی اور باسلیقہ طلبہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔

آئندہ تعلیمی سال کے لیے شعبۂ تخصص فی الادب و الدعوۃ اور شعبۂ حفظ و قرأت میں داخلہ کے خواہش مند امیدوار اپنی اپنی درخواست رمضان شریف سے قبل دفتر جامعہ میں جمع کر دیں، یا بنام پرنسپل ارسال کریں۔

آئندہ تعلیمی سال کے لیے داخلہ شیڈول حسب ذیل ہے:

- درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲/اکتوبر ۲۰۰۷ء
- تحریری امتحان (تخصص) .... ۲۲/اکتوبر ۲۰۰۷ء بروز پیر بوقت ۹/بجے صبح
- تقریری امتحان (انٹرویو) .... ۲۳/اکتوبر ۲۰۰۷ء بروز منگل بوقت ۹/بجے صبح
- امتحان (حفظ وقرأت) .... ۲۴/اکتوبر ۲۰۰۷ء بروز بدھ بوقت ۹/بجے صبح
- افتتاحی اجلاس وآغاز درس .... ۳/نومبر ۲۰۰۷ء بروز سنیچر

نوٹ: مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے جامعہ کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم مبلغ/ Rs. 50 کا منی آرڈر بھیج کر حاصل کر سکتے ہیں۔

رابطہ کا پتہ: Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia

St. No. 22 / Zakir Nagar New Delhi-110025

فون نمبر: 011-26984741

دنیائے سنیت کا عظیم شاہکار۔۔۔۔علم وادب کا گہوارہ۔۔۔۔دعوت وتبلیغ کا سرچشمہ۔۔۔۔اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دھلی پیش کرتا ہے

مذہبی صحافت کی دنیا میں ایک صحت مند انقلاب۔۔۔۔سالانہ علمی دستاویز **کاروان رئیس القلم**

ایک تعارف

محسن ملت یونانی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل رائے پور محسن ملت طب ایجوکیشن سوسائٹی رائے پور چھتیس گڑھ انڈیا کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔ چھتیس گڑھ کی نہایت متحرک وفعال تنظیم طب ایجوکیشن سوسائٹی ۱۹۹۰ء سے پورے صوبے میں سرگرم عمل ہے۔ ۲۰۰۲ء میں اس تنظیم کے بینر تلے مجاہد آزادی محسن ملت حضرت مولانا حامد علی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کی طرف انتساب کرتے ہوئے محسن ملت یونانی میڈیکل کالج اور ہاسپٹل کا قیام عمل میں آیا۔ کالج سنٹر کونسل آف انڈیا میڈیسن، نئی دہلی انڈیا اور چھتیس گڑھ حکومت سے منظور شدہ ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومت کی جانب سے چالیس سٹوں کی اجازت حاصل ہے۔ ذی استعداد، تجربہ کار اور باصلاحیت ڈاکٹر حضرات کی ایک باوقار ٹیم تعلیمی شعبوں کو مضبوط ومستحکم بنانے میں ہر لمحہ مصروف ومنہمک ہے۔ پریکٹیکل کے لئے تمام تر مشینیں اور آلات فراہم ہیں۔ ابتدائی مراحل سے گزرنے کے باوجود ایک میڈیکل کالج کے لئے جتنے تقاضے ہونے چاہیے ہر ایک چیز بآسانی سے مہیا ہے۔ کالج کی اپنی ذاتی لائبریری بھی ہے۔

اعلان داخلہ

برائے 2007-2008

منظور شدہ

سینٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن، نئی دہلی

ملحق:

گورنمنٹ پنڈت روی شنکر شکل یونیورسٹی رائے پور

کورس: بی-یو-ایم-ایس

(ساڑھے چار سال ایک سال انٹرن شپ)

دیگر معلومات کے لیے رابطہ قائم کریں

محسن ملت یونانی میڈیکل کالج

مدرسہ روڈ، بیجناتھ پارہ، رائے پور (چھتیس گڑھ)

موبائل: 09977123671-09893448262

فون نمبر: 0771-4089636